پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، صدر شعبۂ دینیات

محمد سید سلیمان اشرف بہاری اور دو قومی نظریہ

برعظیم کی ملی تحریکات کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ

محمد احمد ترازی

مولای صل وسلم دائما ابدا
علی حبیبک خیر الخلق کلهم

محمد سید الکونین والثقلین
والفریقین من عرب ومن عجم

اللهم صل علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آله وصحبه وبارک وسلم

پروفیسر مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ، صدر شعبۂ دینیات

سید محمد سلیمان اشرف بہاری

اور

دو قومی نظریہ

(برعظیم کی ملّی تحریکات کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ)

محمد احمد ترازی

دارالنعمان پبلیشرز
DARUN NOMAN PUBLISHERS

—— ضابطہ ——

نام کتاب:۔ پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری اور دو قومی نظریہ
(برعظیم کی ملی تحریکات کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ)

مصنف:۔ محمد احمد ترازی (0313-289883)

برقی پتا: mahmedtarazi@gmail.com

قانونی مشیر:۔ محمد ہاشم صدیقی ایڈوکیٹ ہائی کورٹ (0300-2164799)

طبع اوّل: مئی ۲۰۱۸ء/ شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ

ناشر: دار النعمان، لاہور، طابع: مقصود احمد، لاہور

قیمت:.........

دست یابی کا پتا:

دار النعمان، دکان نمبر 4، ہادیہ حلیمہ سینٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 042-37228075 صوتی رابطہ: 1206301-333-92+

برقی پتا: maqsoodspectrum@gmail.com

مکتبہ حسان: فیضان مدینہ، مین یونی ورسٹی روڈ، کراچی، (0331-2476512)

مکتبہ نعیمیہ: جامع مسجد رحمانیہ، بلاک 15، فیڈرل بی ایریا کراچی (0300-2080345)

مکتبہ قادریہ: بالمقابل پرانی سبزی منڈی، مین یونیورسٹی روڈ، کراچی (0313-2178404)

حمد و نعت ریسرچ سینٹر: 2/19، نوشین سینٹر، اردو بازار کراچی (0310-2324340)

مطبع: بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

انتساب

ماں کی شب بیدار جھولی باپ کے قدموں کی خاک
مجھ کو ساری نعمتیں اِن دو ٹھکانوں سے ملیں

اپنے مہربان اور شفیق والدین

کے نام جن کی تعلیم و تربیت

نے مجھے اِس قابل بنایا۔

(رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا۔)

...... اور ......

اپنے والدین کے بعد

یادگار اسلاف

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا

جمیل احمد نعیمی ضیائی چشتی صابری مدظلہ العالی

کے نام جن کی محبت و شفقت اور نظرِ عنایت

ہمیشہ میرے شاملِ حال رہی۔

نوٹ :۔ اِس کتاب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ پر انتہائی محنت اور توجہ دی گئی ہے، تاہم غلطی یا کوتاہی بشری تقاضوں میں شامل ہے۔اگر کسی مقام پر آپ کو تحریر میں کمی بیشی، کمپوزنگ یا پروف ریڈنگ کی غلطی یا اعراب میں کوتاہی نظر آئے تو براہ کرم آگاہ فرمائیں۔ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے۔

حسنِ ترتیب

تاثرات وآراء

اِک پوشیدہ تاریخی گوشے کی نقاب کشائی

از:۔ جمیل العلماء حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی مدظلہ العالی

پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کی ذاتِ گرامی ہماری قومی وملّی تاریخ کا ایک انمٹ اہم باب ہے۔اُن کی شخصیت جتنی دلکش تھی اتنی ہی ہمہ گیر بھی تھی۔ وہ بیک وقت مایہ ناز دانشور، دیدہ ور مدبر، مذہبی وسیاسی رہنماء اور ایک عظیم مفکر تھے۔اُنہوں نے عملی زندگی کے ہر میدان میں اپنی عظیم شخصیت کا نہ مٹنے والا نقش ثبت کیا ہے۔

اُنیسویں صدی کی ابتدائی چوتھائی میں عالم اسلام اور بالخصوص مسلمانان ہند میں قومی وملّی شعور کی بیداری میں پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کے کردار کو کسی طور نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔آپ نے تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، ہجرت، ہندو مسلم اتحاد اور ترکِ گاؤکشی کے ہیجانی دور میں مسلمانانِ ہند کو گاندھی اور گاندھی نوازوں کی منافقانہ سیاست سے بچانے کی بھر پور کوشش کی۔

سیّد سلیمان اشرف نے اُس نازک اور پُرفتن دور میں اسلامیانِ ہند کی راہنمائی کا فریضہ ہی سرانجام نہیں دیا بلکہ بلاخوف لومۃ لائم مشرکین ہند کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط و اتحاد کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا اور علماء کو اُن کی دینی وملّی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر اپنی بالغ نظری، علمی ثقاہت اور سیاسی بصیرت کا ایک روشن اور تابناک ثبوت بھی فراہم دیا ہے۔

عزیزم محمد احمد ترازی کی زیرنظر کتاب پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کی اِسی تاریخ ساز جدوجہد کی وہ روداد ہے جو آپ نے جداگانہ مسلم تشخص کی بحالی اور مسلمانان ہند کو انگریز اور بالخصوص ہندوؤں کی غلامی سے بچانے کیلئے سرانجام دیں۔زندہ قومیں اپنے اکابرین کی حیات وخدمات، اُن کی تعلیمات اور افکار ونظریات کو کبھی فراموش نہیں کرتیں۔

محمد احمد ترازی کا یہی جذبہ کتاب کا اصل محرک ہے۔اُنہوں نے بڑی محنت اور عرق

ریزی سے ہماری ملّی تاریخ کے پوشیدہ گوشے ہی بے نقاب نہیں کیے بلکہ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف بہاری کی زندگی کا اِک نیا پہلو اور وہ نیا زاویہ بھی سامنے لانے کا اعزاز حاصل کیا ہے جس پر آج تک غور وفکر اور توجہ نہ دی گئی۔لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''پروفیسر سیّد سلیمان اشرف اور دوقومی نظریہ'' یقیناً سلیمان شناسی کے باب میں ایک ایسا گرانقدر قدر اضافہ ہے جو آئندہ تحقیق وجستجو کے میدان میں اہم بنیادی ماخذ کا کام دے گا۔

احقر دل کی گہرائیوں سے عزیزم محمد احمد ترازی کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے موصوف کی اِس کاوش کو قبول فرمائے اور مزید دینی خدمت سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

آمین بجاہ حبیب الامین ﷺ
جمیل احمد نعیمی ضیائی چشتی غفرلہ
استاذ الحدیث وناظم تعلیمات
دارالعلوم نعیمیہ بلاک ۱۵،فیڈرل بی ایریا کراچی

ایک شاہکار تحقیق اور خصوصی تحفہ

از:۔محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان

محترم محمد احمد ترازی نے کمال کرم فرمائی کی جو تصوف کی دنیا کا نابغہ الحضرت سیّد محمد سلیمان اشرف بہاریؒ پر ایک جامع مقالہ رقم کیا ہے۔جناب ترازی، مورخ، محقق، کالم نگار اور ناموسِ رسالت ﷺ کے حوالے سے ''تحریک تحفظِ ختمِ نبوت: سیّدنا صدیق اکبرؓ تا علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی''، جیسی زندہ کتاب تصنیف کرنے کا اعزاز پا چکے ہیں۔زیرِ نظر کتاب ''سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری اور دوقومی نظریہ'' اُن کی ایک اور شاہکار تحقیق ہے۔

جناب ترازی نے برِعظیم کی اُس ہستی پر قلم اٹھایا ہے جن کی زندگی کا مدعا و مقصد دینِ مبین کی سربلندی ہی رہا۔جنھوں نے اللہ اور رسول پاک ﷺ کی رضا اور خوشنودی کو ہمیشہ مقدم جانا۔آپ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے خانوادے اور سلسلہ چشتیہ نظامیہ کا بہت بڑا حوالہ ہیں۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ دینیات کے سربراہ کے طور پر کی خدمات جاودانی ہیں۔

آپ محقق، مورخ، مدرس، معلم، مدیر، مدبر، مصنف، زاہد و متقی اور ایک ایسا منارۂ علم ونور تھے جنھوں نے اپنے علم وحکمت سے اپنے ماحول کو منور رکھا۔آپ اپنی ذات میں انسائیکلو پیڈیا تھے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کے اپنے ہم عصروں اور بعد کے اربابِ علم وبصیرت نے آپ کے فضل ومحاسن، علمی کمالات ومناقب کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔الغرض آپ کو آپ کے عہد نے اچھا کہا۔

زیرِ نظر دستاویز میں دوقومی نظریے کے حوالے سے ممتاز محقق اور ردِقادیانیت کا بے بدل قلم کار جناب محمد متین خالد نے اپنی کتاب ''اسلام کا سفیر'' میں قائد اعظمؒ کا ۸، مارچ ۱۹۴۴ء والا مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کا طلباء سے خطاب کا وہ جملہ رقم کیا ہے کہ ''پاکستان اُسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔''

قائداعظم محمد علی جناح کا یہ قول نہ صرف برِعظیم میں ملتِ اسلامیہ کی مبداء واساس کی جانب اشارہ کرتا ہے بلکہ خطے میں اسلام کی آمد اور ترویج واشاعت کے ساتھ دوقومی نظریے کے آغاز وارتقاء سے بھی آگاہی دیتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اِسی دوقومی نظریہ کے آغاز وارتقاء اور تحفظ و احیاء کی وہ داستان ہے جو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری نے اُس دور میں رقم کی جب برِعظیم کے بڑے بڑے سیاسی رہنماء اور نامور علماء گاندھی کے رنگ میں رنگے ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کے گیت گارہے تھے۔

اُس ہیجانی اور طوفانی دور میں مسلمانانِ ہند کو شعور وآگہی کا پیغام دینے اور اُن میں جداگانہ مسلم تشخص کے احساس کو اجاگر کرنے والے سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کے تاریخ ساز کردار کو جس جامع اور مدلل انداز میں ترازی صاحب نے پیش کیا ہے اُس نے فلسفۂ گاندھی کے کئی نامی گرامی اسیروں کو بے نقاب کرکے قاری کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔

جناب محمد احمد ترازی صاحب کی تازہ تخلیق تشنگانِ علم ودانش کے لیے بے بہا خزانہ اور انمول تحفہ ہے۔ ''سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری اور دوقومی نظریہ'' کی اشاعت پر میں روح کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ نوجوان نسل کے لیے یہ خصوصی عطیہ ہے!!

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

نشانِ امتیاز اینڈ بار ہلال امتیاز

دوقومی نظریے کا سچا، سُچا محافظ

از:۔ پروفیسر ڈاکٹر شاہد حسن رضوی

بعض شخصیات کا مقدر ہوتا ہے کہ وہ قرطاسِ تاریخ میں مقید رہتی ہیں، مگر زندہ رہتی ہیں جب جب قاری کوچۂ تاریخ کا طواف کرتا ہے، اُسے ایسے ہجر ہائے اسود سے استفادہ نصیب ہوتا ہے۔ تاریخ بادشاہوں اور شجیع افراد (Heroes) کو نمایاں جگہ ضرور دیتی ہے، مگر اُن نابغہ ہائے روزگار ہستیوں کو کبھی نظر انداز نہیں کرسکتی جنھوں نے اپنے خونِ جگر سے سپیدۂ سحر کو تعبیر آشنا کیا ہو۔ تاریخ آج بھی اُن عشاق ہائے پاک طینت کے تذکرے سے روشن ہے اور یہی افراد تاریخی عمل کی جان ہوا کرتے ہیں۔ اگر مقصدی تحریکات کا ذکر کیا جائے تو تحریکات کے ماتھے کا جھومر یہی نظر انداز کردہ لوگ ہی ہوا کرتے ہیں جن کا تاریخ کا رُخ موڑنے میں بنیادی کردار ہوتا ہے مگر ٹیم ورک میں انھیں ہمیشہ پردۂ سیمیں کے پیچھے رہنے پر اکتفا کرنا پڑتا ہے اور اُن کے کردار کے بغیر تاریخ کا پہیہ پورا نہیں گھوم پاتا۔

تاریخ برِصغیر پاک وہند میں بیسویں صدی عیسوی کی قومی وملی تحریکات میں ہمیں کئی ایسے لوگ ملتے ہیں جنھوں نے اپنا تاریخی کردار بڑی ایمانداری، مقصدی لگن اور جان فشانی سے ادا کیا اور ایک زمانے سے داد وصول کی چہ جائیکہ منزل ہمیشہ اُنہی کا مقدر ٹھیرتی ہے جو شریک سفر بھی نہیں ہوتے۔ مگر تاریخی عمل کی سب سے بڑی خوبی ہی یہی ہے کہ حق بہ حق دار رسید کے مصداق کہ جب تاریخی عمل کا پہیہ پورے طور گھومتا ہے تو اُن افراد کے ذکر سے چرخِ تاریخ جگمگا اُٹھتا ہے۔ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کا نام اور کام بھی کچھ ایسا ہے، جس شخص کو مجددِ زمانہ کا اعلیٰ منصب نصیب ہونا چاہیے تھا اُسے اُس کے اپنوں نے تحت الثریٰ کی اتھاہ گہرائیوں میں پھینک دیا، غیروں کا تو آخر ذکر ہی کیا!!!!!

سیّد سلیمان اشرف بہاری کا پہلا تعارف ایک ماہر تعلیم دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے، تاہم تاریخ نے اُنھیں محافظین وموئیدین دوقومی نظریہ کے سلسلۂ ذہب کے سُرخیل کے طور پر پیش کیا اور اُن کا کردار بالکل اُس وقت سامنے آیا جب تاریخی عمل میں اِس کی اشد ضرورت تھی، تاریخی خوش قسمتی (Historical Fatism) کی اِس سے بہتر مثال ہو ہی نہیں سکتی کہ قائد اعظمؒ، علامہ اقبالؒ کی طرح تاریخ انھیں اُس وقت مبعوث کرے جب اُن کی ضرورت وخواہش عروج پر ہو۔

تحریکِ آزادی ہند میں مسلم کاز کے حصول میں علمائے سوادِ اعظم کی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں جس کا سلسلۃ الذہب اعلیٰ حضرت فاضل ومحدث بریلوی مولانا شاہ احمد رضا خانؒ سے شروع ہوا اور یہ سیّد سلیمان اشرف کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں محدث بریلوی کی علمی و روحانی سرپرستی اور رہنمائی حاصل رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہی کے رنگ میں رنگ گئے یہاں تک کہ وہ اپنے معتقدات اور ایمانیات میں منطقی استدلال اور علومِ عقلیہ میں خوش کلامی اور قوتِ بیان میں حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ کے انداز اور کیفیات کو اپنا چکے تھے خودی سے لے کر رموزِ بے خودی تک ایک سیلانی وروحانی سفر کی داستان اُن کی زندگی میں سموئی ہوئی ملتی ہے۔ خیر الناس من ینفع الناس کی عملی تفسیر ہمیں اُن کے کردار وافعال میں نظر آتی ہے۔

پروفیسر سید سلیمان اشرف، ملی تحریکات اور دوقومی نظریہ ایک ایسی تکوین ہے جس کا ہر کونا جزو لاینفک ہے۔ قومی وملی تحریکات میں ہمیں تین طرح کے لوگ سرگرمِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔

۱۔ کانگریسی نیشنلسٹ (جن میں نام نہاد علماء بھی شامل ہیں)

۲۔ مذہبی طبقات (جن کی روش محض حق دشمنی ہے)

۳۔ دوقومی نظریہ کے حامی وموئید علماء وسیاستدان۔

یہ سہ رُخی آویزش بالخصوص پہلی جنگِ عظیم کے بعد اُبھرنے والی تحریکات کا منظر نامہ تھی جس نے آگے چل کر برصغیر پاک وہند کی سیاست پر دور رس اثرات مرتب کئے۔

دوقومی نظریہ فی نفسہٖ ایک سیلِ رواں کی صورت ازل سے بہہ رہا تھا۔ اِس کی برعظیم پاک و ہند میں ترویج واشاعت کا اصل سہرا صوفیاء کے سر ہے، علماء وسیاستدانوں کی باری بالترتیب بعد میں آئی ہے۔ بیسویں صدی میں اِس کے ارتقاء تک بلاشبہ اِس نظریہ کی عمر ہزار

سال سے زائد تھی اور اُسے ہر دور میں (Callenges & Response) کا سامنا کرنا پڑا تاہم اِس سیلِ منہ زور سے جو بھی ٹکرایا پاش پاش ہوا، اور اُس کی حقانیت پر مہرِ تصدیق ثبت ہوئی۔ اِس ضمن میں سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں اکبری الحاد کا چیلنج سامنے آیا تو شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ کی صورت میں ایک بھرپور اور منہ توڑ ردِعمل سامنے آیا جس کا فوری اور حتمی نتیجہ اکبری الحاد کے سدِ باب کی صورت میں نکلا کہ اکبر کی موت کے بعد اِس نظریہ کو آگے بڑھانے والا کوئی نہ تھا۔

جہانگیر اور شاہ جہان کو اپنے پیش رو جسے اس نظریہ کی پرداخت میں نصف صدی لگی تھی سے کوئی سروکار نہ تھا یہ ایک بہت بڑی تحریک تھی جو اپنے خالق کی موت کے ساتھ اپنی موت آپ مرگئی۔ علماء وصوفیاء کی نظرِ فیض رساں کی یہ پہلی کاری ضرب تھی جس کی بازگشت آج بھی سیکولر اور لبرل طبقات کے دلوں پر لرزہ طاری کر دیتی ہے۔ وحدت الوجودی چولے نے شہودی رنگ پہنا اور آج مقصودی ضرب اور مہر کی تلاش میں ہے۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
بہار ہو کہ خزاں لا الہٰ اِلا اللہ

بیسویں صدی کا ابتدائی عشرہ مسلمانانِ عالم اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے لیے کئی طرح کے عفریت نما مسائل اور چیلنج لے کر آیا۔ ۱۹۰۰ء میں یوپی کے گورنر میکنڈال (Macdonell) نے اُردو کے خاتمے کا روح فرسا اعلان کیا تو دردمند مسلمانوں کے ہاں صفِ ماتم بچھ گئی یہ اُن کی انفرادیت اور شناخت پر پہلی کاری ضرب تھی حالانکہ پیر ہندی سید احمد خاں تو ۱۸۶۷ء میں ہی جان گئے تھے کہ ہندو مسلم اقوام کا ساتھ چلنا بہت مشکل ہے اور آئندہ یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جائے گی۔

اِس خلیج کو گہرا، وسیع اور نا قابلِ عبور بنانے میں تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء)، سودیشی تحریک (۱۹۰۵ء۔۱۹۱۱ء) اور تنسیخ بنگال (۱۹۱۱ء) نے اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کیا جسے لکھنؤ پیکٹ (۱۹۱۶ء) جیسے وقتی دلاسے کے سوا کوئی پُرسانِ حال نہ مل سکا اور ۱۹۳۰ء تک قائد اعظمؒ حق الیقینی کی حد تک قائل ہو چکے تھے کہ مسلمانانِ ہند کے سیاسی ومعاشی مسائل کا حل ایک الگ خطۂ

زمین کے حصول میں ہے، یہ تو تھا ہندوستان کا داخلی منظر نامہ، عالمی سطح پر صورتحال یہ تھی کہ ''یورپ کا مردِ بیمار'' ترکی کا شیرازہ آخری دموں پر تھا جسے تندوتیز حالات کا ایک بگولہ ہی بکھیر کر رکھ دیتا۔ ترکی خلافتِ عثمانیہ اور حجازِ مقدس میں اماکنِ مقدسہ کی حفاظت جیسے چیلنجز نے مسلمانوں کو سخت ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا۔

ان حالات میں جنگِ طرابلس (۱۹۱۱ء) امن کے خرمن میں ابتدائی چنگاری ثابت ہوئی جنگِ عظیم (۱۹۱۴ء) کے آغاز میں لگ رہا تھا کہ یہ جوالامکھی جب پھٹے گا تو ہر چیز کو اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا اور ادھر اہلِ درد کی صورتحال یہ تھی کہ ''اے اہلِ نعمت! تمھیں تمھاری نعمتیں مبارک! مسکین عاشق کو تلخ گھونٹ پینے دو۔ میں [سیّد سلیمان اشرف] خوب جانتا ہوں کہ اِس مضمون کی قوم کی نگاہوں میں اِس قدر وقعت بھی نہ ہوگی کہ ایک مرتبہ نگاہِ حقارت ہی سے سہی اِس کو دیکھا جانا نصیب ہو لیکن پھر بھی میں اِس کے لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا'' اور بلاشبہ دوقومی نظریے کی تحفیظ و ترویج اور ارتقاء ایسے ہی مردانِ پاک طینت کے جذبۂ پرخلوص کی رہینِ منت رہی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ایسے عشاق ہر دور میں میسر آتے رہے۔

دوقومی نظریہ کی ترویج و ارتقاء کے لیے مسلمانوں میں تعلیم کا اجراء ضروری تھا۔ اِس سلسلے میں دیگر کاوشات کے ساتھ ساتھ سب سے مؤثر سعی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۶ء) تھی جس نے مسلم ایجوکیشن کے ضمن میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ اِس کانفرنس کی سرگرمیوں میں سیّد سلیمان اشرف کی مساعی جلیلہ مورخین کی نظروں سے اوجھل نہیں ہیں۔ آپ جدید عصری علوم کی ضرورت واہمیت سے آگاہ اور اِس کے حصول کو قومی و ملی حقوق اور سیاسی بیداری کے لیے لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔ اُن کی تصنیف ''السبیل'' اسلامی نصابِ تعلیم و تاریخ پر ایک جامع و مستند دستاویز ہے جو آج بھی قابلِ استفادہ و تقلید ہے جس میں ''اسلامی فلسفہ کامیابی و کامرانی'' پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

تحریکِ ترکِ گاؤکشی اور تحفظِ شعائرِ اسلامیہ بیسویں صدی کا ایک اہم مگر پیچیدہ مسئلہ تھا اور جس طرح اس مسئلے پر اکابرینِ اہلِ سنت نے روشنی ڈالی اور برصغیر کے تاریخی

تناظر میں جس طرح اسے بطور ''مؤقف'' کے پیش کیا اِس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ کون سوچ سکتا ہے کہ ہندو اکثریتی ہندوستان میں مسلم اقلیت کے مؤقف کو درخورِ اعتنا سمجھا جائے اور پھر یہی مؤقف مختلف مسلم طبقات کے ''حُسنِ نیت'' اور ''خبثِ باطن'' کے درمیان قولِ فیصل بھی ٹھہرے۔ اِس ذیل میں محدث بریلوی علیہ الرحمتہ اور اُن کے پیرو سیّد سلیمان اشرف کی مساعئ جلیلہ سنہری حروف میں لکھی جائیں گی۔

بیسویں صدی عیسوی ہی کا ایک اور نازک، حساس اور پیچیدہ مسئلہ ہندو مسلم اتحاد کا تھا جسے مذہبی اور سیاسی تناظر میں دیکھا جانا ضروری تھا اور بیسویں صدی میں مذہبی، سیاسی تناظرات کی آویزش اپنے نقطۂ عروج پر رہی۔ پروفیسر سید سلیمان اشرف نے اُس ہیجانی دور میں مسلمانانِ ہند کو گاندھی اور گاندھی نوازوں کی منافقانہ سیاست اور گاندھی کی ''مہاتمائیت'' کا طلسم توڑ کر مسلمانوں کو سیاسی خودکشی سے بچانے کی بھرپور سعی کی صرف یہی نہیں بلکہ اپنی تحاریر و تقاریر کے ذریعے ہندو مسلم اتحاد و اختلاط کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا اور علماء کو اُن کی دینی و ملی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر اپنی بالغ نظری، علمی ثقاہت اور سیاسی بصیرت کا بین ثبوت بھی دیا۔

یہ ہندوستانی سیاست کا مختصر مگر اجمالی تذکرہ زیرِ نظر تصنیف ''پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف، اور دوقومی نظریہ'' سے کشید کیا گیا ہے۔ جو ہمارے ہم دم دیرینہ سنیئر صحافی اور محقق تاریخ جناب محمد احمد ترازی نے دینی خلوص، محققانہ وقتِ نظری اور پیشہ ورانہ دیانت سے مرتب کی ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تاریخ نویسی کے ذیل میں برصغیر پاک و ہند میں اِس استناد کی کوئی ایک بھی تصنیف گذشتہ دو دہائیوں میں منصۂ شہود پر نہیں آئی۔ جس کی ایک وجہ وہ مشنری جذبہ ہے جو ہمارے اسلاف نے خلافتِ بغداد و اسپین کے عروج میں پروان چڑھایا جب تحریر و تقریر کا مقصد محض دینی ترقی اور خوفِ للّٰہی تھا اور مسلمان یورپ اور مغرب کے علمی و سائنسی میدان میں سُرخیل و امام ٹھہرے تھے۔

حالیہ تصنیف کسی مالی منفعت یا حصولِ شہرت کے لیے نہیں پیش کی گئی بلکہ یہ ایک دیرینہ تقاضا اور قرض تھا یا مؤلف کی خود عائد کردہ ذمہ داری تھی کہ تاریخ کے خاکستر میں جو

روشن چنگاریاں آج بھی دبی ہیں انھیں اہلِ درد کے لیے تلاشا اور تراشا جائے اور اُسے ثقاہت
علمی کے ساتھ پیش کیا جائے۔ جہاں تک حصول مواد اور اِس کی چھان پھٹک کے لیے تحقیقی
طریق کار کا تعلق ہے ایسے تحقیقی کام کے لیے برسوں کی تربیت اور ریاضت درکار ہوتی ہے اور
علمی دانش گاہوں میں کہنہ مشق اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا پڑتا ہے اور پھر ایسے
پروجیکٹس (PROJECTS) بڑے بڑے اداروں یا یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی سطح کے تحقیقی
کام کے لیے سرانجام دیے جاتے ہیں۔

کسی بھی بڑی یونیورسٹی کے پی ایچ ڈی سطح کے شیلف پر چلے جائیں۔ اِس معیار کا
کام شاذ ہی ملے گا کسی بھی ڈگری کے لالچ کے بغیر اس سطح کا کام ظہور میں آنا، بذاتِ خود کسی
معجزے سے کم نہیں ہے۔اور میں بڑے فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلافِ اہلِ سنت کی یہ ادا،
ترازی صاحب کی شخصیت وقلم دونوں سے جھلک رہی ہے اور نوجوان نسل کو اُن سے بہت کچھ
سیکھنے کو ملے گی۔تاریخ نویسی کے میدان میں ہمیشہ سے ایسے عشاق کی کمی رہی ہے جو بلا کسی
مالی منفعت کے محض رضائے الٰہی اور کلمۃ الحق کے لیے ایسی علمی خدمت سرانجام دیں جس
طرح محدث بریلوی کا روحانی فیض ہمارے ممدوح پروفیسر سیّد سلیمان اشرف میں منتقل ہوا
ہے، یہ سلسلہ رُکا نہیں بلکہ یہ فیض اب ترازی صاحب جیسے مردانِ پاک طینت کا فکری وروحانی
سرمایہ واثاثہ ہے۔

ہم ابھی تک اُن کی سابقہ کاوش ''تحریکِ تحفظِ ختمِ نبوت: سیدنا صدیق اکبرؓ تا علامہ
شاہ احمد نورانی صدیقیؒ'' کے سحر میں گم تھے کہ ہماری حیرتوں کا محور اب پھر رُوبہ تبدیلی ہے۔اگر
ہم محترم محمد احمد ترازی کی علمی وادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرنا چاہیں تو فکرِ رضا کی ترویج سے لے
کر عقیدہ اہلِ سنت کی حُرمت وحفاظت تک ایک وسیع سمندر ہے جس کے وہ غواص ومحافظ
ٹھہرے ہیں۔اخباری صحافت سے لے کر تاریخی تحقیق تک انھوں نے تحریر وتقریر کی ایک رزم
گاہ سجا رکھی ہے علاوہ ازیں نفس اسلام ڈاٹ کام ہو یا سوشل میڈیا کے دیگر مظاہر فن،اُن کی علمی
ادبی خدمات کا سلسلہ جاری وساری ہے۔وہ ''ایک فرد سپاہ'' ہیں اور اپنی تمام دستیاب صلاحیتوں
اور وسائل کو انھوں نے من حیث خدمتِ دینی کے لیے وقف کر رکھا ہے جس کی فی زمانہ مثال

ملنا مشکل ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ اُن کی حالیہ تصنیف ایک متعین رجحان ثابت ہوگی اور محققین اور
طلباء اِس سے یکساں استفادے کے امکانات تلاش کریں گے اور نوجوانانِ اہلِ سنت کے لیے
اِس میں تشجیع وتقلید اور تحفیظ خدمتِ عقیدۂ اہلسنّت کا وافر موقع وسامان موجود ہے۔یہ وہ 'چراغِ
رہ گذر' ہے جسے ''سب خبر ہے''۔

اللہ کریم سے دُعا ہے کہ اُن کے لیے خیر وبرکت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہیں.....

پروفیسر ڈاکٹر شاہد حسن رضوی
سابق صدر شعبۂ تاریخ ومطالعہ پاکستان
اسلامیہ یونیورسٹی۔بہاول پور
مدیر سہ ماہی الزبیر وسیکریٹری جنرل اُردو اکیڈمی۔بہاول پور

۞۞۞

ایمان افروز نسخہ

از:۔ ڈاکٹر جبار مرزا

سیّد محمد سلیمان اشرف بہاریؒ اور دوقومی نظریہ انتہائی اہم نسخہ ہے، جسے ہمارے محترم اور نامور محقق جناب محمد احمد ترازی نے تصنیف کیا ہے۔ کتاب کئی ابواب پر محیط ہے، ساتویں اور آخری باب کا عنوان ہے ''ملّی تحریکات اور دوقومی نظریہ'' اِس حصے کو نوجوان نسل کو بار بار پڑھنا چاہیے تاکہ اُن پر کھلے کہ ''دوقومی نظریہ'' اور متحدہ قومیت کے نعروں میں کیا حکمت اور سازش پوشیدہ تھی۔

جناب محمد احمد ترازی نے سیّد محمد سلیمان اشرف بہاریؒ کی زندگی پر کتاب تصنیف فرماکر صرف سیّد محمد سلیمان اشرف کی خدمات و کردار کا ہی احاطہ نہیں کیا بلکہ خطے کی تاریخ بھی مرتب کی ہے۔ کتاب کا ہر باب مکمل کہانی ہے۔ پہلا باب اگر ''کتابِ زندگی'' ہے، تو دوسرا باب ''دوقومی نظریہ کا آغاز وارتقاء'' ہے۔ تیسرے میں ''شعورِ بیداریٔ ملت''، اور چوتھا ''جدید عصری علوم اور جذبۂ آزادی'' الغرض ابتداء سے انتہاء تک اور شروع سے آخر تک مرحلہ وار ہمارے مشاہیر کا کردار اُن کی بودوباش ثقافت و رہتل ایک سبق ہے۔ جن میں سیّد محمد سلیمان اشرف بہاریؒ کی خدمات وایثار انتہائی تحسین آفرین ہے۔

کتاب کے پانچویں باب کا عنوان ''تحریک ِترکِ گاؤ کشی اور تحفظ شعائر اسلامیہ'' ہے، یہی دوقومی نظریے کی ایک جھلک ہے گویا مسلمان جس گائے کو حلال جانتے ہیں ہندو اُسے اپنی ماں مانتے ہیں۔ کتاب کا چھٹا باب ''ہندو مسلم اتحاد'' ہے، یہ باب بھی بے بہا معلومات اور تاریخی حوالوں سے مزین ہے جس میں ہندو سوچ، کم نگاہی اور اُس کی کینہ توزی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یوں یہ ایک ایمان افروز نسخہ بن گیا ہے۔

جناب محمد احمد ترازی نے پوری توجہ اور دیانت سے برعظیم میں پہلے مسلمان سے ماضی قریب تک کے حالات کو سیّد محمد سلیمان اشرف بہاریؒ کے افکار و کردار اور اُن کے عمل کی روشنی میں زیرِنظر مرقع تحریر فرمایا ہے، جو بہت بڑی ملّی، دینی اور قومی خدمت ہے۔
اللہ پاک محمد احمد ترازی صاحب کو اِس کے اجر سے سرفراز فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر جبار مرزا
محقق وادیب، شاعر ومعروف کالم نگار اور سینئر جرنلسٹ

❁❁❁

تذکرہ اِک قرض کی ادائیگی کا

از:۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

صدیوں کا تاریخی تسلسل اس صداقت کا مظہر ہے کہ برِعظیم میں دو قومیں باہم نشو ونما پاتی رہیں، لیکن وہ ایک دوسرے میں مدغم نہ ہوسکیں اور دونوں کی مذہبی رسومات اور ذاتی و مجلسی زندگی میں واضح فرق موجود رہا۔ دونوں قوموں کی معاشرت، تمدن، زبان، رسم الخط، عقیدے وروایات، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے، وضع قطع، گفتار وکردار، طرزِ زندگی واندازِ فکر، غرض یہ کہ ان دونوں میں کوئی ایک چیز بھی مشترک نہیں تھی۔ فکر وعمل کے ہر زاویۂ نظر کے اعتبار سے یہ دو قومیں دو الگ الگ تہذیب وثقافت، معیشت ومعاشرت اور فلسفہ و سیاسیات کی حامل رہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو دو قومی نظریے کی اساس ہے۔

ہندوستان میں اکبری الحاد اور لبرل ازم کے مقابلے میں اسلامی قومیت کے علم بردار اور دو قومی نظریے کے محافظِ اوّل شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ تھے۔ یہ سلسلۃ الذہب شیخ احمد سرہندیؒ سے ہوتا ہوا امام احمد رضا خان محدث بریلویؒ اور اُن کے خلفاء (سید نعیم الدین مرادآبادیؒ، مولانا امجد علی اعظمیؒ، مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ، سید محمد محدث کچھوچھویؒ، مولانا برہان الحق جبل پوریؒ) تک پہنچتا ہے۔ جس میں ایک اہم نام پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف بہاریؒ (استاذ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کا بھی ہے۔

پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف بہاریؒ معقولات ومنقولات، لسانیات، فقہ، ادب اور درس وتدریس کے ماہر اور علم وعمل کے جامع تھے۔ ایک ایسے وقت میں جب بڑے بڑے نامور لوگ متحدہ قومیت کے سیلاب میں بہے چلے جارہے تھے۔ سید سلیمان اشرفؒ بلاخوف لومۃ لائم دو قومی نظریے کی شمع روشن کیے مخالف ہواؤں سے نبرد آزما تھے۔ آپ کے شاگردِ رشید

پروفیسر رشید احمد صدیقی بجا طور پر رقم طراز ہیں:

"مرحوم (سید سلیمان اشرف) مطعون ہورہے تھے لیکن نہ چہرے پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق...... سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم نے اس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔ آج تک اُس کی سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔ سارے علماء سیلاب کی زد میں آچکے تھے۔ صرف مرحوم اپنی جگہ قائم تھے۔"

پروفیسر سید سلیمان اشرفؒ کی بصیرت افروز نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ اس وقت بلادِ اسلامیہ پر جو ظلم وستم کے بادل چھائے ہوئے ہیں اس کا سبب یہی ہے کہ مسلمان خدا کی واحدانیت کا اقرار کرتے ہیں۔ چونکہ ہماری قومیت صرف اسلام وایمان ہی سے مراد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہندی کو ایک عرب کا، ایک امریکی کو ایک افریقی کا، ایک حبشی کو ایک شامی کا، ایک چینی کو ایک یورپی کا اور ایک نومسلم کو ایک صحیح النسب سید کا، محض کلمہ پڑھ لینا ہی ہم قوم بنادیتا ہے۔ آپؒ نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلام صرف تزکیہ نفس ہی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ سیاست سمیت جملہ شعبہ ہائے زندگی کے لیے مکمل رہبری ورہنمائی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

متحدہ قومیت کا نظریہ صرف اسلامی تعلیمات سے دوری ہی نہیں بلکہ اپنے جداگانہ تشخص کی نفی اور دو قومی نظریے کی مسلمہ حقیقت سے انحراف بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۲۰۔۱۹۲۱ء کے ہیجانی دور میں آپ نے اس موضوع پر دو اہم کتابیں "الرشاد" اور "النور" تصنیف کیں اور ببانگِ دہل اِس حقیقت کو آشکار کیا کہ حکومت انگریزوں کی ہو یا ہندوؤں کی، اسلام و اہلِ اسلام کے لیے اِس میں کوئی فلاح نہیں ہے۔

بلاشبہ پروفیسر سید سلیمان اشرف بہاریؒ ان علمائے ربانیین میں سے ہیں، جن کی بے مثال جدوجہد نے برِعظیم میں جذبۂ اسلامی اور ملّی تشخص کو برقرار رکھنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ پیشِ نظر کتاب "سید سلیمان اشرف اور دو قومی نظریہ: برِعظیم کی ملّی تحریکات کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ" فاضل محقق ومؤرخ، صحافی وصاحبِ طرز ادیب جناب محمد احمد ترازی کی اپنے

موضوع پر ایک عمدہ کاوش ہے۔

پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف بہاریؒ کی دوقومی نظریے کے حوالے سے خدمات، ان کی جرأت و استقامت، پیش بینی و سیاسی بصیرت کا تذکرہ ایک قرض تھا جسے ترازی صاحب نے ادا کرنے کی سعی مشکور کی ہے۔ جس کے لیے وہ ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔ فاضل محقق نے اختصار و جامعیت کے ساتھ پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف بہاریؒ کے حالاتِ زندگی، اُن کے بے داغ کردار، تعلیمی خدمات اور برِّعظیم کی ملّی تحریکات کے تناظر میں دوقومی نظریے کی بقاء کے لیے اُن کی بے مثال جدوجہد کا احاطہ کیا ہے اور مستند و معتبر ذرائع اور تاریخی حوالوں سے دوقومی نظریے کا نہ صرف تقسیم ہند سے پہلے بلکہ بعد کے بدلتے نظریات و حالات کے تناظر میں بھی بخوبی جائزہ لیا ہے۔ جس کے لیے یہی کہا جاسکتا ہے کہ:

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف بہاریؒ کی خدمات اور اُن کا کردار ہماری ملّی تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جسے ہمارے بجا طور پر ہمارے قومی نصاب کا حصہ ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھی نام نہاد سیکولر بھارت کے مسلمانوں کو تہذیب و ثقافت کے حوالے سے ان ہی خطرات کا سامنا ہے جو متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کو تھا۔ لہٰذا آج اِس بات کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے کہ نسلِ نو کو اپنی قومی و ملّی تاریخ سے آگاہی فراہم کی جائے، اکابرین کی خدمات سے روشناس کرایا جائے اور اُن کی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ پیش نظر کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ فاضل محقق برادرم محمد احمد ترازی کی اس پُر خلوص سعی کو (جو کسی مالی منفعت یا اعلیٰ تعلیمی سند کے حصول سے بے نیاز ہو کر کی گئی ہے) اپنی بارگاہ عالی میں قبول فرمائے اور ان کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔ اللھم زد فزد۔ آمین۔

ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی۔ کراچی

❀❀❀

دُور اندیش درویش

از۔ پروفیسر دلاور خان

برصغیر پاک و ہند کی مسلم سلطنت کے زوال میں انگریز کی مکاری، حکمرانوں کی نااہلی اور دشمنوں کی سازش نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جس کے نتیجے میں انگریز برصغیر پر قابض ہوگئے۔ مسلمان جو کل تک حاکم تھے، محکوم ہوگئے۔ مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی حالت ابتر ہوتی چلی گئی۔ اِس ابتر حالت سے نکلنے کیلئے مسلمانوں کے مختلف دانشوروں نے مسلم معاشرے کی نشاۃ ثانیہ کیلئے فکری، نظری اور عملی لائحہ عمل تشکیل دیا۔

مسلم مفکرین کا ایک طبقہ اِس بات کا حامی رہا کہ انگریز طاقتور ہیں اور مسلمانوں کی حالت ایسی نہیں کے اُن کے ساتھ مزاحمت کا رویہ اختیار کیا جائے اور اگر ایسا کیا بھی گیا تو اِس کے نتائج مسلمانوں کیلئے بھیانک ہونگے۔ اُن کے نزدیک یہ اصول رہا کہ ”جسے شکست نہیں دی جاسکے، اُس سے دوستی کرلی جائے“ اِس نظریے کے تحت اُنہوں نے انگریزوں سے دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا تاکہ مسلمانوں کے سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق کا تحفظ کیا جاسکے۔ یہ طبقہ مسلم انگریز اتحاد کا داعی تھا۔

جبکہ مسلم مفکرین کے دوسرے طبقے کا یہ نظریہ تھا کہ انگریز غاصب ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی حقوق پامال کیے ہیں۔ اُنہیں جدوجہد کے ذریعے باہر نکال کر نشاۃ ثانیہ کے خواب کی تعبیر تلاش کی جائے۔ لیکن مسلم ایسا خود نہیں کرسکتے ہیں اس لیے ہندوؤں کو اِس مقصد کے حصول کیلئے ساتھ ملایا جائے۔ اور مشترکہ کوشش ہی سے مسلمانوں کے مفادات کا دفاع کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان دانشوروں نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔

جبکہ مسلم مفکرین کا تیسرا طبقہ وہ تھا، جس نے ہندو اور انگریز پالیسی کا بڑی گیرائی

اور گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور اُن کے پاس ایسے زمینی حقائق اور شواہد موجود تھے جس کی بناء پر اُنہوں نے اِس نظریے کو فروغ دیا کہ مسلم مفاد نہ مسلم انگریز اتحاد میں مضمر ہے اور نہ مسلم ہندو اتحاد میں۔ اِن دونوں اتحاد سے مسلم فلاح کی اُمید رکھنا حقائق سے نظریں چرانے کے مترادف ہے، مسلمانوں کے تمام مسائل کا واحد حل مسلمانوں کے دینی اور سیاسی اتحاد میں ہی ہے۔ اِس لیے اِن مسلم مفکرین نے یہ پالیسی اپنائی کہ غیر مسلم اقوام سے اتحاد کرنے سے گریز کیا جائے اور مسلم اتحاد کیلئے ہر ممکن کوشش کی جائے۔

یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ مسلم اتحاد کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ برصغیر کی غیر مسلم رعایا پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جائے۔ بلکہ مسلم اتحاد خود اتنا مضبوط ہو کہ کوئی مسلمانوں کے مفادات کا سودا آسانی سے نہ کر دے۔ اور یہ مسلم اتحاد دفاعی فلسفے پر مبنی ہو۔ دراصل اِس نظریے کا اصل محرک قرآن پاک کا بیان کردہ وہ اصول ابدی ہے کہ ملتِ کافرہ ملتِ اسلامیہ کی خیر خواہ نہیں ہوسکتی۔ یہی وہ فکر و فلسفہ تھا جس نے ہر ممکن دو قومی نظریے کا دفاع کیا۔

مسلم مفکرین کے اِس تیسرے طبقے کے سرخیل مفکر اسلام احمد رضا خاںؒ اور اُن کے پیروکار تھے۔ اِسی فکر کو عملی جامہ پہنانے کیلئے وہ عملی اور علمی جہاد میں مصروف رہے۔ اُنہوں نے ہندو مسلم اور انگریز مسلم اتحاد کے جذباتی ماحول میں ہردل عزیز فتویٰ نہ دینے کی کوشش کی۔ اُن کی اِس حقیقت پسندی کے دریا کو بند بنا کر روکنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اُن پر طرح طرح کے اعتراضات لگانے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ مگر یہ تمام یورشیں اُن کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ کرسکیں۔ اُنہوں نے اِن تمام سازشوں کی پروا کئے بغیر قرآن و سنت کی تعلیمات کی روشنی میں دوٹوک رویہ اپنایا اور مسلم اتحاد کیلئے دو قومی نظریہ کو فروغ دیا۔

دوسری طرف ہندو اپنے مفادات کے تحفظ میں سرگرداں تھے۔ ہندو سیاست پر جس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے وہ مسٹر گاندھی کی مفاہمت کی پالیسی تھی۔ گاندھی نے انگریز اور مسلمانوں سے مفاہمت کے ذریعے ہندو مفادات کا تحفظ بڑی زیرکی اور مہارت سے کیا۔ ایک طرف وہ انگریز سے اپنی وفاداری کا دم یوں بھرتے ہیں ''میں انگریزوں کا دشمن نہیں ہوسکتا، خواہ مظالم کے اِس اونچے پہاڑ جو اُنہوں نے بنایا ہے، کتنے ہی مظالم کے انبار کھڑا کردیں'' دوسری

طرف مسلمانوں سے اپنے جذباتی لگاؤ کا اظہار یوں کرتے ہیں ''ایک نیک کام (مسئلہ خلافت) میں مسلمانوں کی مدد کرنا ہندوستان کی خدمت کرنا ہے۔ اِس لیے مسلمان اور ہندو ایک ہی طرز سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ ایک ماں (بھارت ماتا) کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔'' (اخبار ینگ انڈیا، ۲۸، جولائی ۱۹۲۱ء) ''وہ اچھا ہو یا برا، اب تو دونوں فرقے (ہندو مسلم) ہندوستان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے ہم سایہ ہیں۔ ایک مادرِ وطن کی اولاد ہیں۔ یہیں مریں گے اور یہیں پیدا ہوئے تھے۔'' (ہری جن، ۲۹، اکتوبر ۱۹۳۸ء)

مسٹر گاندھی کے اِن سیاسی بیانات سے اُن کے سیاسی فلسفے کی عکاسی ہو رہی ہے کہ وہ ہندو مفادات کے حصول کے لیے مسلم اور انگریز سے کسی طرح بھی ٹکراؤ کی پالیسی اپنانے کے متمنی نہیں، کیوں کہ وہ اِس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ ٹکراؤ کسی طرح بھی ہندوؤں کے مفاد میں نہیں ہے۔ اُنہوں نے مسلم اور انگریز سے مفاہمتی حکمت عملی کے تحت ہندو مفادات کے تحفظ کے لیے ''متحدہ قومیت'' کے تصور کو اجاگر کیا۔ اور اُن کے اِس نعرے سے کئی مسلم اکابرین بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اِس کے باوجود مفکر اسلام احمد رضا خاںؒ، قائد اعظمؒ، مولانا حسرت موہانیؒ اور مولانا سلیمان اشرف بہاریؒ مسٹر گاندھی کے متحدہ قومیت کے تصور اور مفاہمتی پالیسی کے مضمرات اور نتائج سے بخوبی آشنا تھے۔

یہی وہ سیاق و سباق ہے جو زیرِ نظر کتاب ''سیّد سلیمان اشرف اور دو قومی نظریہ'' کا موضوعِ گفتگو ہے۔ محمد احمد ترازی کا میدانِ تحقیق مسلم سیاسیات ہے۔ اِس پر اُن کا وسیع مطالعہ ہے، جو اُن کی کتب، اخباری کالم اور مضامین سے عیاں ہوتا ہے۔ زیرِ مطالعہ کتاب میں آپ نے ایک طرف تو ''سلیمان اشرف شناسی'' کی خدمات انجام دیں ہیں، تو دوسری طرف موجودہ نسل کو دو قومی نظریہ اور مسلم سیاسی تحریکات میں اکابرینِ اہل سنت خصوصاً سیّد سلیمان اشرف بہاریؒ کے کردار کو نمایاں کیا ہے۔

احمد ترازی نے دو قومی نظریے، بیداریٔ ملت، جذبۂ آزادی، اور ملّی تحریکات میں سیّد صاحب کی لازوال خدمات و کردار کا علمی و تحقیقی انداز میں جائزہ لیا ہے کہ کس طرح آپ نے تحریکِ ترکِ گاؤ کشی اور ہندو مسلم اتحاد کے مضمرات سے مسلمانانِ ہند کو آگاہ اور بیدار

کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا اور دلائل و براہین سے ثابت کیا کہ مسلمانوں کی بقاء متحدہ قومیت میں نہیں بلکہ دوقومی نظریہ میں پنہاں ہے۔اسی طرح سیّد صاحب نے تحریکِ ترکِ گاؤ کشی کے انتہا پسندانہ نظریے کے مقابلے میں ایک اعتدال پسند نظریے کو فروغ دیا۔جس سے ایک طرف اسلامی شعار ''قربانی'' کو تحفظ ملا، تو دوسری طرف مسلمانوں کو فساد فی الارض کے ہنگاموں سے محفوظ رکھنے کے لیے عملی اقدامات ممکن ہوئے۔ہندو مسلم اتحاد ایک جذباتی اور ہندو مفادات ملفوف نعرہ تھا۔آپ نے اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں صرف اور صرف مسلم اتحاد پر زور دیا اور دوقومی نظریے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔

ترازی صاحب نے اِس کتاب کو اُصولِ تحقیق کے تحت مدون کیا ہے۔کسی بھی تحقیق کی ثقاہت کا انحصار اُس تحقیق کے مصادر پر ہوتا ہے۔مصادر کا معیار جتنا علمی اور مستند ہوگا تحقیق کے نتائج بھی ویسے ہی جاندار اور شاندار برآمد ہونگے۔زیرِ مطالعہ کتاب میں موصوف نے خصوصیت کے ساتھ قابلِ اعتماد و بھروسہ مصادر سے تحقیقی متن اخذ کیا ہے اور اِسی متن کا تحقیقی انداز میں تجزیہ کرکے نتائج اپنے قاری کے سامنے رکھے ہیں۔حوالہ جات، حواشی اور اقتباسات بھی اُصولِ تحقیق کے تناظر میں تحریر کیے گئے ہیں۔غرض کہ ترازی صاحب نے اِس کتاب میں نہایت ہی محنت اور جاں فشانی سے کام لیا ہے۔یہ پاکستانیات، تاریخ اور مسلم سیاسیات کے شائقین اور موجودہ نسل کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔جسے ہر لائبریری میں ہونا ضروری ہے۔

پروفیسر دلاور خان
پرنسپل گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن اینڈ پروفیشنل ڈیولپمنٹ سینٹر، ایجوکیشن سٹی، ملیر کراچی
جوائنٹ سکریٹری، ادارہ تحقیقاتِ امام احمد انٹرنیشنل

حدیثِ دل
فراموش کردہ مظلوم مفکر

پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری برِعظیم کے اُن ممتاز علمائے ذی وقار میں سے ہیں جنھیں قدرت نے سیاسی بصیرت و بصارت دونوں سے نوازا تھا۔جن کا دل ملتِ بیضاء کی فکری بیداری اور اُس کے روشن مستقبل کیلئے آشنائے درد تھا۔سیّد صاحب ہماری قومی و ملّی تاریخ کی اُن قابلِ فخر شخصیات میں سے ایک ہیں جن کی جدوجہد نے برِعظیم پاک و ہند میں جذبہِ اسلامی اور تشخصِ ملی کو قائم رکھا۔آپ نے برِعظیم میں اٹھنے والی تحریکِ خلافت، ترکِ موالات و ہجرت، ترکِ گاؤکشی اور سنگھٹن وشدھی جیسی اسلام اور مسلمان دشمن تحاریک کے اثرات و مضمرات سے برِعظیم کے مسلمانوں کو نہ صرف بروقت آگاہ کیا بلکہ اپنی سیاسی بصیرت و آگہی سے مستقبل کا لائحہ عمل بھی متعین فرمایا۔

آپ نے پژمردہ قلوب میں عشقِ نبوی ﷺ کے چراغ جلائے۔شعائرِ اسلامی کے تحفظ و بقاء کی خاطر علمی و قلمی جہاد کیا۔اُمتِ مسلمہ کے عقائد و نظریات کو استحکام عطا کیا۔خدا اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اور اسلام کے مسلمہ عقائد پر ہونے والے حملوں کا بھرپور دفاع کیا اور دلائل و شواہد کی روشنی میں احقاقِ حق و ابطالِ باطل کا فریضہ سرانجام دیا۔

سیّد سلیمان اشرف زندگی بھر مسلمانانِ ہند اور عالمِ اسلام کے تحفظ و بقاء کیلئے آواز بلند کرتے رہے۔وحدتِ ملی کا درس دیتے رہے اور مسلم قومیت کا جداگانہ احساس جگا کر مسلمانانِ ہند میں دوقومی نظریہ کے تصور کو اجاگر کرتے رہے۔آپ نے مفکرِ اسلام مولانا احمد رضا خاں محدث بریلویؒ کے بعد اُن کی اُسی فکر و نظریہ کی آبیاری کی اور ہمیشہ اُسی موقف کا اعادہ کیا جس کی بنیاد و اساس دینِ اسلام فراہم کرتا ہے۔

سیّد سلیمان اشرف نے اُمت کو اُس وقت خلافتِ اسلامیہ کی حفاظت وصیانت کیلئے جگانے اور شکست وریخت سے بچانے کا لائحہ عمل پیش کیا جب کسی اور نے ایسی کوئی پہل نہ کی تھی۔لیکن عالم اسلام کے اِس مظلوم اور فراموش کردہ مفکر کے ساتھ ظلم یہ ہوا کہ جب یہ سلطنت آخری سانسیں لے رہی تھی اور اِس کو بچانے کی آڑ میں پُرفریب سیاست کی گرم بازاری دین وشریعت کی دھجیاں اڑا رہی تھی،اپنی جرأت اظہار کی بناء پر آپ مخالفین کا ہدف ملامت بنے ہوئے تھے۔آپ کے ساتھ یہ ظلم بھی روا رکھا گیا اور آپ کو اِس بناء پر مسلمانان ہند کے اجتماعی مفادات کا دشمن گردانا گیا کہ آپ مسلمانوں کے علیحدہ ملّی تشخص کو متحدہ قومیت میں مدغم کرنے کیلئے تیار نہ تھے۔

جس وقت کانگریسی علماء ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانانِ ہند کو ملک چھوڑنے کی ترغیب دے رہے تھے۔سیّد سلیمان اشرف اُس وقت بھی ہمیں اُن کو اِس فکری غلطی سے بچانے میں سب سے آگے اور نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ باور کرانے کی تگ ودو میں مصروف دکھائی دیتے ہیں کہ اِس عمل میں مسلمانوں کا صرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔

ہماری قومی وملّی تاریخ کا ایک کربناک سچ یہ بھی ہے کہ جب مذہبی لبادوں میں ملبوس بڑے بڑے امام الہند، شیخ الہند اور نیشنلسٹ علماء گاندھی کی نقاب پوش سیاست کے نقیب بنے متحدہ قومیت کے نظریے کو قرآن وحدیث سے ثابت کررہے تھے اور مسلمانانِ ہند کو متحدہ قومیت کا میٹھا زہر پلا کر سلا دینا چاہتا تھا۔

آپ اُس ہیجانی اور طوفانی دور میں گاندھی اور گاندھی نوازوں کی منافقانہ سیاست اور گاندھی کی مہاتمائیت کا طلسم توڑ کر مسلمانانِ ہند کو سیاسی خودکشی سے بچانے کی کوشش کررہے تھے۔آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں کی لغزشوں پر سخت گرفت کی،قومی وملّی وحدت کا شعور اجاگر کیا اور برصغیر کے مسلمانوں میں مسلم قومیت کے جداگانہ تصور کی آبیاری کرکے تحریک آزادی کی راہ ہموار کی۔

آج اِن تحاریک کو ایک صدی گزرنے کے باوجود اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیّد سلیمان اشرف نے برعظیم کی سیاست کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔گو اُس شور میں

جو مذہب بیزاری اور نئی اسلام پسندی کی آڑ میں اٹھا رکھا گیا آپ کی آواز پر کم ہی توجہ دی گئی۔لیکن اُس طوفان اور شوروغل کے سامنے اعتدال اور اصلاح کی جو شمعیں آپ نے روشن کیں، جو راہیں دکھائیں اور جس تواتر وتسلسل کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا،اُس کو ''البلاغ'' (۱۹۱۱ء)،''الخطاب''(۱۹۱۵ء)،''الرّشاد''(۱۹۲۰ء)،''النور''(۱۹۲۱ء)اور''السبیل''(۱۹۲۴ء) کی روشنی میں زیادہ بہتر انداز سے دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔یہ کتابیں اُس دورِ پُرآشوب کی تاریخ ہی نہیں اُن المیوں کا حل بھی ہے جس میں قوم اور رہبران قوم کل بھی مبتلا تھے اور آج بھی ہیں۔

سید سلیمان اشرف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ایمان وایقان کی شمعیں روشن کیں اور مسلمانوں میں جذبۂ حریت وآزادی بیدار کیا۔ آپ نے مغربی اور ہندوانہ تہذیب کا سحر ہی نہیں توڑا بلکہ اُس میں مدغم ہونے کے نقصانات و تباہ کاریوں پر سے پردہ بھی اُٹھایا۔اُن کی ایک عظمت یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کی تاریخ،تہذیب، سیاست،معیشت اور سماجی ومعاشی کروٹوں پر اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ گہری نگاہ رکھتے تھے۔بلاشبہ وہ ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔

لیکن افسوس کہ اُن کی حیاتِ مستعار کے کئی اہم گوشے اُس تب وتاب کے ساتھ منظر عام پر نہ آسکے،جس کے وہ مستحق تھے۔گو اُن کے جذبوں کی صداقت،رائے کی اصابت اور ذہن وفکر کی رسائی کے سب قائل ہی رہے۔کبھی کسی نے اُن کے خلوص اور نیت پر انگلی نہ اٹھائی۔مگر اُن کے ساتھ نہ تو اُن کے معاصرین نے انصاف کیا اور نہ ہی محققین ومورخین کو آج تک یہ توفیق ہوئی کہ وہ اُن کو سمجھنے کی ایماندارانہ کوشش کرتے۔ ہمارے علماء، مبلغین اور واعظین نے اگر کبھی انہیں یاد بھی کیا تو اِس نسبت اور حوالے کو ہی اہمیت دی گئی کہ وہ محدث بریلوی کے خلیفہ تھے۔اُن کا اصل کردار وعمل اور کارہائے نمایاں سے قوم اور خصوصاً نوجوان نسل کو متعارف کرانے کی کوئی باقاعدہ اور منظم کوشش نہیں کی گئی۔

برصغیر پاک وہند میں یہ اعزاز صرف ظہور الدین امرتسری صاحب کو حاصل ہوا کہ اُنہوں نے عالم اسلام کے اِس عظیم مفکر کی متروکہ کتب یا علمی آثار کو اپنے تحقیقی مقدمات کے

ساتھ شائع کرنے میں پہل کی اور ''ادارۂ سلیمان شناسی'' کی بنیاد رکھ کر عملی لائحہ عمل متعین کیا۔ جس کی بدولت سیّد صاحب کی زندگی کے کچھ نئے گوشے اور پہلو سامنے آئے اور پاک و ہند میں ''سلیمان شناسی'' کی ایک نئی تحریک اور رجحان کے جنم لینے سے ''سیّد سلیمان اشرف حیات و کارنامے'' (محمد علی اعظم خاں سعیدی)، ''سرزمین بہار کی دو عظیم شخصیات'' (علامہ لیٰسین اختر مصباحی)، اور ''سیّد سلیمان اشرف بہاری اہل علم کی نظر میں'' (محمد طفیل احمد مصباحی) وغیرہ جیسی کچھ نئی کاوشیں سامنے آئیں۔

مگر پون صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود سیّد صاحب کی زندگی اور حیات و خدمات اور کارناموں پر وہ مبسوط اور خاطر خواہ کام نہ ہوسکا جو آپ کی عظمت و کردار اور کارہائے نمایاں کا جامع اور مکمل احاطہ کرتا۔ یہ پہلو ہنوز توجہ کا متقاضی اور دعوت فکر و عمل دیتا ہے اور صاحبانِ علم و دانش سے تقاضا کرتا ہے کہ سیّد صاحب کی حیات مستعار کے وہ پہلو اور گوشے بھی قوم اور بالخصوص نوجوان نسل کے سامنے لائے جائیں جن سے تاحال صرف نظر کیا گیا ہے۔

زندہ قومیں اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ اُن کے افکار و نظریات کو مشعل راہ بناتی ہیں۔ کردار و عمل سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں اور مستقبل کا لائحہ عمل طے کرتی ہیں۔ یہی وہ جذبہ محرکہ ہے جو زیر نظر کتاب کی وجہ تصنیف ہے۔ ''سیّد سلیمان اشرف اور دو قومی نظریہ: قومی وملّی تحریکات کے تناظر میں ایک تجزیاتی مطالعہ'' سیّد صاحب کی زندگی کے اُس نئے گوشے اور پہلو کو سامنے لانے کی پہلی کوشش ہے جس پر اب تک کسی جانب سے توجہ نہیں دی گئی۔

سلیمان شناسی کی یہ ادنیٰ سی کوشش سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب ''کتاب زندگی'' کے عنوان سے قاری کو سیّد سلیمان اشرف کی سیرت و کردار، ذات و صفات اور حالات زندگی سے آگاہی فراہم کرتا ہے۔ دوسرے باب ''دو قومی نظریہ کے آغاز و ارتقاء'' میں برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد اور مسلم مملکت کے قیام و آغاز سے عصر حاضر تک اِس نظریے کی ضرورت و اہمیت اور تحفظ اور احیاء کی کوششوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب ''شعور بیداریٔ ملت'' میں سیّد سلیمان اشرف کی اُن کوششوں اور

کاوشوں کو احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے جس میں آپ ''الكفر ملة واحده'' کے خلاف ملتِ اسلامیہ اور بالخصوص مسلمانان ہند کو جسد واحد بننے کی ترغیب دینے کے ساتھ ایک مرکز سے وابستہ ہونے کا شعور عطا کرتے ہیں۔ چوتھا باب ''جدید عصری علوم اور جذبۂ بیداری'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں سیّد صاحب کی اُن کوششوں، کاوشوں اور جہد مسلسل کا جائزہ لیا گیا ہے جو آپ نے مسلمانان ہند میں جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت اور افادیت کو اجاگر کر کے اُن میں جذبہ آزادی کو بیدار کرنے کیلئے سرانجام دیں۔ اور اِس ضمن میں یہ احساس بھی اجاگر کیا کہ عصر حاضر میں مسلمانوں کے علمی، فکری، سیاسی، معاشی اور معاشرتی زوال و انحطاط کا بنیادی سبب جدید علوم و فنون سے دوری اور بے اعتنائی ہے۔

اِسی طرح پانچویں باب ''تحریک ترک گاؤ کشی اور تحفظِ شعائر اسلامیہ'' میں سیّد سلیمان اشرف کی اُس جدوجہد کو اجاگر کیا گیا ہے جو آپ نے برصغیر پاک و ہند میں گائے کی قربانی اور دیگر شعائر اسلامی کے تحفظ و بقاء کیلئے سرانجام دیں۔ چھٹے باب ''ہندو مسلم'' اتحاد'' میں برعظیم کی تاریخ کے اُس نازک اور پرفتن دور کا ذکر ہے۔ جس میں سیّد سلیمان اشرف نے تحریک خلافت، ترکِ موالات اور ہجرت کے دوران گاندھی اور گاندھی نوازوں کی ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کی فریب کاریوں کی آڑ میں مسلمانان ہند کی قومی وملّی شناخت مٹانے کی سازش کو بے نقاب کیا اور جداگانہ مسلم تشخص و شناخت کے دفاع و حفاظت کیلئے تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

جبکہ ساتواں اور آخری باب ''ملی تحریکات اور دو قومی نظریہ'' دراصل مندرجہ بالا تحاریک کا احاطہ کرتا ہے جو برعظیم میں متحدہ قومیت وغیرہ کے نام پر بپا ہوئیں۔ جس میں کانگریس اور کانگریس نوازوں کی پوری کوشش رہی کہ مسلمانان ہند سے اُن کا قومی وملّی تشخص چھین لیا جائے اور انہیں سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور اقتصادی طور پر بے دست و پا کر کے ہندوؤں کی غلامی میں دے دیا جائے۔

اِن تحاریک کے دوران پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کا کردار و عمل دراصل ہماری قومی وملّی تاریخ کا وہ اَنمٹ باب ہے جسے تاریخ سے زیادہ سیّد صاحب کے چاہنے والوں نے بھلا

دیا ہے۔ چنانچہ سیّد صاحب کے اِس مجاہدانہ کردار کو تاریخی سچائی کے ساتھ سامنے لانے کی کوشش نیز اِس ضمن میں اُن دینی و سیاسی اسباب و محرکات اور اثرات و مضمرات کا جائزہ و تجزیہ جو اِن تحاریک کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند پر اثر انداز ہوئے، اِس باب کا اہم موضوع ہے۔

دورانِ تحقیق یہی ترجیح رہی کہ تمام مستند و ثقہ ماخذ و حوالہ جات اور حواشی کو اہمیت دی جائے اور ضمنی و ثانوی ماخذ سے گریز کیا جائے۔ پھر بھی نقطہ نظر سے اتفاق یا اختلاف آپ کا حق ہے۔ چونکہ بشری تقاضے خطا سے مبّرا نہیں، اس لیے اگر کسی مقام پر غلطی، کوتاہی یا تسامح محسوس ہو تو اصلاحِ احوال کی ہر مثبت و مدلل کوشش ہمارے نزدیک لائق ستائش اور قابل قبول ہوگی۔

آخر میں ہم جناب حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی (ناظم تعلیمات جامعہ نعیمیہ، کراچی) محسن پاکستان جناب ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب، جناب ڈاکٹر جبار مرزا، (سینئر جرنلسٹ شاعر و ادیب اور محقق)، پروفیسر ڈاکٹر شاہد حسن رضوی، (ممتاز ادیب و سابق سربراہ شعبۂ تاریخ اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور) پروفیسر ڈاکٹر محمد سہیل شفیق (شعبۂ تاریخ، جامعہ کراچی) اور پروفیسر دلاور خان صاحب (جوائنٹ سیکرٹری، ادارہ تحقیقات امام احمد رضا) کے بے انتہا شکر گزار ہیں کہ اُنہوں نے اپنی گونا گوں مصروفیات میں سے وقت نکالا اور اپنے قیمتی نقد و نظر سے نوازا۔

جناب پروفیسر ڈاکٹر مظہر حسین صاحب (شعبۂ تاریخ، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور)، جناب ڈاکٹر فیاض احمد شاہین (ریسرچ اسکالر، ہمدرد یونی ورسٹی، کراچی)، جناب محمد طفیل احمد مصباحی (نائب مدیر، ماہنامہ اشرفیہ، مبارکپور، انڈیا) اور اپنے ہمدم و دیرینہ رفیق اور محقق جناب محمد یوسف حنفی (بہاول نگر) کے بھی بے حد ممنون ہیں جن کا علمی تعاون اور گرانقدر مشورے ہمارے شاملِ حال رہے۔ اِس مقام پر جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد سہیل شفیق صاحب اور پروفیسر دلاور خان صاحب کا دوبارہ تذکرہ اِس لیے ضروری ہے کہ جناب ڈاکٹر محمد سہیل شفیق صاحب کی حوصلہ افزائی و ستائش اور پروفیسر دلاور خان صاحب کے مکمل تعاون و رہنمائی اور توجہ دلائے گئے علمی و تحقیقی نکات نے کام کے معیار کو بہتر بنانے میں بہت مدد دی۔

ہم معروف اشاعتی ادارے ''دارالنعمان'' لاہور کے ڈائریکٹر جناب مقصود احمد صاحب

کے بھی مشکور ہیں۔ جن کی ذاتی دلچسپی اور عملی تعاون نے مسودے کو کتابی شکل عطا کی۔ اِس مقام پر ہماری شریکِ حیات کا تعاون بھی قابل ستائش ہے کہ تمام خانگی مسائل و پریشانیوں سے دور رکھ کر اُس نے ہمیں لکھنے پڑھنے کیلئے سکون و یکسوئی کا موقع فراہم کیا۔

یہ سب اللہ ﷻ کا فضل و کرم اور رسول اللہ ﷺ کی نگاہ لطف و کرم کا فیضان ہے۔ الحمد للہ ربّ العالمین۔ جتنا بھی اظہارِ تشکر کیا جائے کم ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ربّ کریم اِس کوشش و کاوش کو ''سلیمان شناسی'' کا ذوق و تحرک کو بیدار کرنے اور سیّد سلیمان اشرف کی شخصیت کے نت نئے دریچے وا کرنے کا سبب بنا دے۔ آمین بحرمۃ سید المرسلین ﷺ

محمد احمد ترازی

۳۰، مارچ، ۲۰۱۸ء

جمعۃ المبارک ۱۲، رجب، ۱۴۳۹ھ

باب اوّل

کتابِ زندگی

کتابِ زندگی

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف ۱۸۷۸ء میں صوبہ بہار کے ایک مردم خیز دیہات محلّہ میرداد، ضلع نالندہ کے ممتاز سیّد گھرانے میں پیدا ہوئے اور مولانا سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کے نام سے مشہور ہوئے۔ نام کے ساتھ بہاری کی یہ نسبت صوبہ بہار کی وجہ سے نہیں بلکہ بہار شریف (۱) کی وجہ سے تھی۔

آپ کے والد کا نام مولانا حکیم سید عبداللہ تھا جن کا انتقال آپ کے بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ حکیم سیّد عبداللہ اپنے زمانے کے فاضل طبیب و عالم اور صاحب طریقت و شریعت بزرگ تھے۔ ''سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کا آبائی نسب حضور غوث اعظم ؓ اور مادری نسب حضرت مخدوم جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتا ہے۔'' (۲)

ابتدائی تعلیم تربیت و بیعت وخلافت

سیّد سلیمان اشرف بہاری نے'' ابتدائی تعلیم اپنے اعمام محترم سے حاصل کی۔ مولانا کے چار چچا تھے۔ مولانا عبدالقادر، مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالغنی اور مولانا عبید اللہ چاروں سے مختلف اوقات میں مختلف کتابیں پڑھیں۔'' (۳) اِس کے بعد بہار اسکول میں داخلہ لیا، لیکن دسویں جماعت میں طبیعت دینی تعلیم کی جانب مائل ہوگئی۔ چنانچہ اسکول کو خیر آباد کہا اور مولانا نور محمد اصدقی خلیفہ اعظم شاہ قیام اصدق، پیر بگہہ جموانواں سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔

اِسی دوران آپ اُن کے دامن عقیدت سے وابستہ ہوئے اور اخذِ طریقت کیا۔ سیّد سلیمان اشرف حضرت مولانا قاری نور محمد چشتی نظامی فخری سے بیعت و ارادت کے ساتھ سلسلہ اشرفیہ کے عظیم بزرگ حضرت سید علی حسین اشرفی میاں جیلانی (۱۸۴۹ء۔۱۹۳۶ء)

سے طالب اور خلافت یافتہ تھے اور آپ سلسلہ چشتیہ نظامیہ فخریہ سے بھی منسلک تھے۔ آپ کو محدث بریلوی حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۱ء) سے بھی خلافت و اجازت حاصل تھی۔(۴)

سیّد سلیمان اشرف نے ''مدرسہ اسلامیہ'' استھانواں میں مولانا سیّد محمد احسن استھانوی سے بھی چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اِس کے بعد مزید تعلیم کیلئے مدرسۂ ندوۃ العلما میں مولانا احمد حسن کانپوری (ف ۱۹۰۵ء) کے حلقہ درس میں داخل ہوئے۔

''لیکن یہاں کی فضا آپ کو راس نہ آئی اور جلد ہی آپ بحرالعلوم حضرت مولانا محمد ہدایت اللہ خاں جون پوری کی خدمتِ اقدس میں پہنچ گئے۔''(۵) ''جو پورب میں خیرآبادی سلسلہ کے خاتم تھے۔''(۶)

مولانا ہدایت اللہ جون پوری (ف ۱۳۲۶ھ) منطق و معقولات میں اپنے زمانے کے امام اور مجاہد جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء مولانا فضل حق خیرآبادی (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۱ء) کے مایہ ناز شاگرد تھے۔ سیّد سلیمان اشرف نے اِسی خیرآبادی چشمۂ علم سے فیض اٹھایا۔

مولانا ہدایت اللہ جون پوری کے علاوہ سیّد صاحب کے اساتذہ میں ایک قابل ذکر نام فقیہ العصر استاذ العلما مولانا یار محمد بندیالوی (۱۸۸۷ء۔۱۹۴۷ء) کا بھی ہے۔ جنھوں نے محدث بریلوی سے تکمیل علم کی خواہش کا اظہار کیا مگر آپ نے اُنہیں مولانا ہدایت اللہ جون پوری سے جملہ علوم وفنون کے حصول کا مشورہ دیا۔ چنانچہ آپ کی ایماء پر مولانا یار محمد بندیالوی نے مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری سے جملہ فنون کی دوبارہ تکمیل کی اور تکمیل کے بعد کم وبیش سات آٹھ سال آپ کی خدمت اقدس میں گزارے تھے۔''(۷)

صحبتِ بحرالعلوم کا فیضان

سیّد سلیمان اشرف صاحب کے تعلیمی مراحل کو بیان کرتے ہوئے حکیم محمد خلیل احمد القادری الجائسی سابق ریڈر طبیہ کالج، علی گڑھ لکھتے ہیں:

''گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کانپور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا احمد حسن کی خدمت میں پہنچ کر کسب علوم دین کی خواہش

ظاہر فرمائی۔ استاذ وقت پہلے حدیث اور پھر منطق کی تعلیم دینا چاہتے تھے، لیکن سیّد صاحب پہلے منطق اور بعد میں حدیث کی تحصیل پر مصر تھے۔ (چنانچہ جب بات بنتی نظر نہ آئی تو) اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے جون پور حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا رحمہ تعالیٰ نے سیّد زادہ کی ہر خواہش پر سر تسلیم خم کرنے کو خوش نصیبی سمجھتے ہوئے ہر بات بہ طیب خاطر قبول فرمائی اور اِس طرح ایک جوہر شناس ماہر کو ایک گوہر بے بہا مل گیا۔''(۸)

جون پور میں بحرالعلوم حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری سے سیّد سلیمان اشرف نے علوم اسلامیہ اور منطق وفلسفہ کی منتہی کتب کی تکمیل کی اور استاد کی وفات تک اُن ہی کے پاس جون پور میں مقیم رہے۔ یہ مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری کی صحبتِ خاص کا فیض تھا کہ:

''آپ نے لمحہ بہ لمحہ اپنی ذہانت وصلاحیت کے خیرہ کن جواہر ریزے بکھیرنا شروع کردیئے اور آخر کار آپ کی جلالت، علم وفضل اور عشق رسول ﷺ نے آپ کی شخصیت کو ایسا تراشا کہ خود جوہری اپنے گوہر کی آب وتاب سے خیرہ ہوکر اُس کا عاشق ہوگیا۔ چنانچہ ایک بار جون پور میں ایک محفل میلاد مقدس میں سیّد صاحب علم وحکمت اور عشق رسول ﷺ کی فضا کو معنبر ومعطر فرمانے میں محو تھے کہ ایک مرقع علم وحکمت نے منبر پر پہنچ کر وفور جذبات سے سرشار اور وارفتہ سیّد صاحب کو سینہ سے چمٹالیا اور پیشانی کو بوسہ دینے لگے۔ یہ تھے آپ کے استاذ حضرت مولانا ہدایت اللہ خاں۔''(۹)

اِس واقعہ کو برصغیر کے نامور ادیب اور سیّد سلیمان اشرف کے معروف شاگرد پروفیسر رشید احمد صدیقی (۱۸۹۴ء۔۱۹۷۷ء) کے ادبی انداز میں ملاحظہ کیجئے:

''جون پور میں سیرت رسول ﷺ کا جلسہ تھا، مرحوم کی تقریر ہورہی تھی،

جلسہ کیا تھا ایک جم غفیر تھا، مرحوم اپنے مخصوص والہانہ جوش ووارفتگی کے
ساتھ تقریر کررہے تھے۔ حاضرین کی خاموشی کا یہ عالم تھا جیسے سارا مجمع
ایک ہی متنفس تھا۔ اتنے میں دور سے ایک بوڑھا پستہ قد، منحنی شخص جھکا
ہوا، انبوہ کو چیرتا ہوا بڑھتا نظر آیا۔ جس شخص کے پاس سے گزرتا وہ
خوف وعقیدت سے سمٹ کر تعظیم دیتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے پلیٹ فارم پر
پہنچ گیا۔ مرحوم کو سینہ سے لگا کر پیشانی کا بوسہ دیا اور واپس چلا گیا۔ یہ
مولانا ہدایت اللہ خاں صاحب جبروت جون پوری، مرحوم کے استاد اور
جون پور میں اُس وقت علم وفضل کے چشم وچراغ تھے۔'' (۱۰)

یہ تو تھی ایک استاد کی اپنے لائق اور ہونہار شاگرد سے محبت، جبکہ دوسری جانب
شاگرد کا اپنے استاذ محترم سے محبت وعقیدت کا یہ حال تھا کہ خود سیّد سلیمان اشرف صاحب:

'' اپنے استاد (مولانا ہدایت اللہ خاں جون پوری) کے پروانہ تھے۔
آخری سانس تک استاد پر جان نچھاور کرتے رہے اور جب استاد نے
اپنے خالق کے حکم کو لبیک کہا، تو آپ نے ہوش وحواس کھودیا۔ عرصہ
تک کھوئے کھوئے سے رہے۔ آخر کار اسی مدرسہ میں تدریس اور استاد
محترم کی نیابت کے فرائض کو قبول فرمالیا۔'' (۱۱)

اپنے استاذ محترم مولانا ہدایت اللہ جون پوری سے سیّد سلیمان اشرف کو جو عقیدت
ومحبت تھی، اُس کا ذکر کرتے ہوئے سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) بیان کرتے ہیں:

''مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب مرحوم کو حقیقت یہ ہے کہ اپنے
استاد کے ساتھ عقیدت ہی نہیں، بلکہ عشق تھا۔ اُن کے حالات جب
کبھی وہ سناتے تو اُن کے طرزِ بیان اور گفتار کی ہر ادا سے اُن کی
والہانہ تراوش کرتی تھی۔'' (۱۲)

محدث بریلوی کی ہمہ گیر شخصیت کا رنگ واثر

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف، مولانا ہدایت اللہ جون پوری کے بعد وقت کی دوسری

عظیم شخصیت سے متاثر ہوئے، وہ محدث بریلوی مولانا شاہ احمد رضا خان کی ذات تھی۔
محدث بریلوی کی ہمہ گیر شخصیت کا ایسا گہرا اثر سیّد سلیمان اشرف کی شخصیت پر مرتب ہوا کہ
تمام زندگی انہی کے رنگ میں رنگے نظر آئے۔ محدث بریلوی کی شخصیت کے اس گہرے
رنگ واثر کو بیان کرتے ہوئے آپ کے شاگرد ڈاکٹر سیّد عابد احمد لکھتے ہیں:

'' وہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت سے از حد متاثر تھے......
استاذ محترم مولانا سیّد سلیمان اشرف پر حضرت مولانا بریلوی کا اتنا اثر تھا
کہ میں نے مولانا احمد رضا خاں قدس سرہٗ کی عظیم شخصیت کا اندازہ
دراصل استاذ محترم کی شخصیت ہی سے لگایا۔ مجھے مولانا سلیمان اشرف
سے شرفِ تلمیذ کے علاوہ اُن کا انتہائی قرب بھی حاصل رہا۔ اور میں
دیکھتا کہ وہ اکثر حضرت مولانا بریلوی کا ذکر خیر چھیڑ دیتے اور یوں
محسوس ہوتا کہ اکثر اُنہی کے تصور میں مگن رہتے حتیٰ کہ استاذ محترم کی
طبیعت اُنہی کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ وہ اپنے معتقدات اور ایمانیات
میں منطقی استدلال اور علوم عقلیہ میں خوش کلامی اور قوت بیان میں
حضرت مولانا کے انداز اور کیفیات کو اپنا چکے تھے۔ غیر اسلامی شعائر کی
مذمت میں تشدد، کانگریس اور ہندوؤں کی ہم نوائی کرنے والے
لیڈروں اور عالموں کے متعلق سخت گیر رویہ، مشرکین کو نجس سمجھنا اور اُن
کے معاملے میں کسی قسم کی مداہنت روا نہ رکھنا، یہ سب صفات دونوں
بزرگوں میں مشترک تھیں۔ اِسی طرح عشق رسول ﷺ کے معاملے میں
طبیعت کا ایک والہانہ انداز بھی سیّد صاحب میں حضرت فاضل بریلوی
ہی کی طرف سے آیا تھا۔ لباس اور وضع قطع میں بھی استاذ محترم حضرت
مولانا (محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں) کا تتبع فرماتے تھے، حتیٰ
کہ مجھے یاد ہے کہ آپ عمامہ بھی اُسی انداز کا رکھتے جیسا کہ حضرت
مولانا مرحوم استعمال فرماتے تھے۔'' (۱۳)

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقرری

مولانا ہدایت اللہ جون پوری کے انتقال کے بعد ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (۱۸۶۶ء۔۱۹۵۱ء) کی کوششوں سے سیّد سلیمان اشرف کی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (جس کا آغاز ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو مدرسۃ العلوم مسلمان ہند کے نام سے کیا گیا تھا، اور جو دو سال بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں علی گڑھ میں تبدیل ہوا) میں لیکچرر شعبۂ دینیات کی حیثیت سے تقرری ہوئی۔ بعد ازاں مئی ۱۹۰۹ء میں پروفیسر اور ۱۹۲۱ء میں کالج کے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بن جانے کے بعد آپ صدر شعبۂ دینیات کے عہدے پر فائز ہوئے۔ علی گڑھ کالج میں آپ کی تقرری دراصل دریائے علم وحکمت کو کوزے میں مقید کرنے کے مترادف تھا۔ چنانچہ شبیر احمد غوری نے انہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

> ''حکمت وکلام کا دریائے ناپیدا کنار جو شیخ بوعلی سینا اور امام ابوالحسن اشعری بلکہ ارسطو و افلاطون اور حضرت محمد حنفیہ اور سیّدنا علی کرم اللہ وجہہ کے زمانے سے ٹھاٹھیں مارتا چلا آرہا تھا کالج کی دینیات کی لیکچراری میں مقید ہوکر رہ گیا۔'' (۱۴)

علی گڑھ کالج میں آپ کی تقرری کے حوالے سے ہمیں کئی روایتیں ملتی ہیں، چند درج ذیل ہیں۔

سیّد صاحب کے آبائی علاقے میر داد کے رہائشی سید ضمیر الدین احمد کے صاحب زادے اور ''حقیقت بھی کہانی بھی، عظیم آباد کی تہذیبی داستان'' کے مصنف سیّد بدر الدین احمد بیان کرتے ہیں:

> ''میرے والد مرحوم (سیّد ضمیر الدین احمد) نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی سے یہ بات طے کرلی تھی کہ مولانا سید سلیمان اشرف اُن کے ساتھ علی گڑھ جائیں (گے) کچھ دنوں اُن کے ساتھ رہیں، کوئی اچھا موقع نکل آئے تو علی گڑھ کالج میں اُن کیلئے کوئی جگہ بن ہی جائے

> گی۔ چنانچہ مولانا سلیمان اشرف علی گڑھ گئے اور اِس طرح گئے کہ ہمیشہ کیلئے وہیں کے ہوکر رہ گئے۔'' (۱۵)

حکیم محمد خلیل احمد القادری الجائسی لکھتے ہیں:

> ''ایک مناسب موقع پر سیّد صاحب کے عقیدت مند مولوی جواد علی صاحب نے آپ کے علم میں لائے بغیر علی گڑھ کالج کے شعبۂ دینیات کے استاد کی جگہ کیلئے درخواست دے دی۔ پھر انہی کے اصرار پر ۱۹۰۸ء میں آپ بحیثیت استاذ شعبۂ دینیات علی گڑھ تشریف لائے۔'' (۱۶)

جبکہ سیّد سلیمان اشرف کے شاگرد حافظ غلام غوث (مولانا ہدایت اللہ جون پوری کے پوتے) بیان کرتے ہیں:

> ''ایم، اے، او کالج علی گڑھ میں دینیات کیلئے ایک لیکچرار کی ضرورت کا اشتہار نکلا۔ طلبائے جون پور نے نواب وقار الملک (مشتاق حسین صاحب، ۱۸۴۱ء۔۱۹۷۱ء) سے جو کالج کے سیکرٹری تھے، درخواست کی کہ اِس جگہ پر اگر مولانا (سیّد سلیمان اشرف) کا تقرر کرلیا جائے تو مناسب رہے گا۔ نواب صاحب نے دینیات کی کمیٹی کے ارکان سے مشورہ کیا اور شروانی صاحب (صدر یا جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں) کو جو اُس کمیٹی کے سیکرٹری تھے، ہدایت فرمائی کہ انٹرویو کیلئے مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب کو بلالیا جائے۔ سیّد جواد علی صاحب کے ذریعہ جو اُس زمانے میں جون پور کے مدرسہ میں تعلیم پارہے تھے، مولانا (سیّد سلیمان اشرف) کو اطلاع پہنچائی گئی ...... چنانچہ مولانا اطلاع ملتے ہی علی گڑھ آئے اور کمیٹی کے سامنے پیش ہوئے (اور انٹرویو) کمیٹی کے ممبران نے اُن کا انتخاب کیا۔ (۱۷)

مرحلہ تقرری پر خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ

انٹرویو میں کامیابی اور انتخاب کے باوجود سیکشن کمیٹی نے سیّد سلیمان اشرف کی

ساختہ اور مودبانہ کھڑے ہو گئے۔ پھر جب سیّد صاحب منبر سے اُترے
تو مولانا مدنی نے والہانہ انداز میں اُٹھ کر اُنہیں سینہ سے لگا لیا اور کہا کہ
میرا تو خیال تھا کہ مولانا ہدایت اللہ خاں کے یہاں منطق و فلسفہ ہی کا
شور و شورہ ہے، آج معلوم ہوا کہ قرآن و حدیث کے بحرِ زخار کی شناوری
میں اُن کے شاگرد تنک (نہایت) مہارت رکھتے ہیں۔ مولانا مدنی نے
یہ تک کہہ دیا کہ اب میں قیام کا قائل ہو گیا نواب صاحب نے اشارہ کیا
کہ سیّد صاحب اِس داد پر مولانا (مدنی) کا شکریہ ادا کریں۔ آپ نے
برجستہ فرمایا۔ اِن دادوں کی کیا حیثیت ہے مجھے داد اُس بارگاہ سے ملتی
ہے جو اپنے محبّ و مولیٰ کی عنایت سے قاسم بھی ہے مختار بھی۔" (۱۹)

علی گڑھ کی خانقاہِ سلیمانیہ اور صاحبانِ علم و فضل

علی گڑھ پہنچ کر سیّد سلیمان اشرف نے پہلا اہتمام یہ کیا کہ ہر روز بعد نماز عصر قرآن
پاک کا درس دینا شروع کیا جو بعد میں آپ کا مستقل معمول بن گیا۔ سیّد درویش کی خانقاہ
سلیمانیہ علی گڑھ کی وہ مجلس درسِ علمی تھی جس میں اپنے وقت کے مختلف الخیال علماء کرام و
اربابِ علم و دانش اور ماہرین علم و فن شریک ہوتے۔ سیّد صاحب کی محفل میں اِن احباب کی
شرکت سیّد صاحب کی ہر دل عزیزی کے ساتھ اِس بات کی بھی عکاس ہے کہ یہ اکابرین وقت
اُن کی محفل میں شرکت کو اپنے لیے باعث فخر و افتخار سمجھتے تھے۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، نواب مزمل اللہ خان
شروانی، صاحبزادہ آفتاب احمد خان (۱۸۶۷ء۔۱۹۳۰ء)، ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸۹۷ء۔۱۹۶۹ء)
اور ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (۱۸۷۸ء۔۱۹۴۷ء) وغیرہ کے علاوہ دیگر:

"شرکائے مجلس میں مولوی مقتدیٰ شروانی (۱۸۸۰ء۔۱۹۶۸ء)، مولوی
کرام اللہ خاں ندوی، ڈپٹی سیّد زین الدین، حاجی ابوالحسن، بابائے
اردو مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء)، مولانا عبدالحق بغدادی، مولوی
احتشام الدین، مولوی سیّد بدرالدین صاحبان موجود ہوتے۔ کبھی کبھی

حاجی صالح خاں شروانی آ جاتے...... مجلس میں مذہبی، علمی، ادبی، شعر و
شاعری، تاریخ اسلام، واقعات صحابہ کرام اور اولیائے عظام پر گفتگو
ہوتی۔ سیاست سے حتی الامکان گریز کیا جاتا، لیکن تاریخ کی روشنی میں
حالات حاضرہ پر تبصرہ ضرور ہوتا اور وہ بھی اِس طرح کہ کسی کے مزاج
کے خلاف نہ ہوتا۔" (۲۰)

خانقاہِ سلیمانیہ کے حلقہ درس سے فیض اٹھانے والوں میں کئی ہستیاں علم و فضل کا
آفتاب بن کر چمکیں۔ جیسے ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری (۱۹۱۴ء۔۱۹۷۴ء)، پروفیسر رشید احمد
صدیقی، قاری محمد انور صمدانی، ڈاکٹر سیّد عابد احمد علی اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی (۱۹۰۶ء۔
۱۹۹۵ء)، وغیرہ

مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی سیّد سلیمان اشرف کی مجلس درس قرآن کا ذکر
کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نواب وقار الملک کے زمانہ میں علی گڑھ کالج میں پروفیسر دینیات کا
عہدہ قائم ہوا تو سیّد سلیمان اشرف کا تقرر بطور پروفیسر دینیات عمل میں
آیا۔ درس قرآن و تفسیر کی جماعت قائم ہوئی۔ اُس کا ایک دور ختم ہو گیا۔
اُس وقت بھی علمائے کرام مدعو تھے۔ مولانا احمد رضا صاحب بریلوی،
مولانا ولایت حسین صاحب الہ آبادی اور مولانا عبدالحق صاحب حقانی
اور بزرگوں سے درخواست کی گئی تھی۔ چنانچہ مولانا عبدالحق صاحب
حقانی تشریف لائے، چند گھنٹے امتحان لیا جو تحریر بعد امتحان میرے نام
بھیجی تھی، اُس سے واضح ہوتا تھا کہ نتیجہ امتحان سے ممدوح کو حیرت انگیز
اطمینان تھا۔" (۲۱)

سیّد سلیمان اشرف صاحب نے علی گڑھ میں جو علمی مجلس قائم کی تھی۔ اُس میں
صرف وہ ہی لوگ شریک ہو سکتے تھے جو مجلس کے اصولوں اور قواعد کا خیال رکھتے تھے۔ سیّد
سلیمان اشرف چونکہ بہت با اصول آدمی تھے، اِس لیے اُنہوں نے اپنی مجلس میں شرکائے محفل

کیلئے کچھ اصول و قاعدے بھی وضع کیے تھے، جن پر سختی سے عمل کرایا جاتا تھا۔مولوی محمد مقتدیٰ خاں شروانی (۱۸۸۰ء۔۱۹۶۸ء) کے مطابق:

''اُن کی مجلس کے کچھ ایسے اصول تھے جو پتھر پر لکیر تھے۔جیسے

(۱) کسی کی بدگوئی نہ ہوتی تھی۔

(۲) کوئی خودغرضی کا معاملہ نہ ہوتا تھا۔

(۳) ہر قسم کے مضامین پر ایسے انداز میں بات ہوتی تھی کہ دماغ پر مطلق بار نہ ہو۔

(۴) قابلِ ہمدردی لوگوں کی مدد پر غور ہوتا تھا۔

(۵) دوسروں کی اخلاقی اقدار کو سراہا جاتا۔وغیرہ، وغیرہ'' (۲۲)

سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کے عشرت خانہ میں اُن کی قیام گاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا، جھک کر آتا، اگر مجلس سازگار ہوتی تو دعائیں لے کر گیا، ورنہ الٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر اُدھر کا رخ نہ کیا۔'' (۲۳)

اِس مجلسی رُعب و دبدبہ کا ذکر کرتے ہوئے آپ کے شاگرد پروفیسر ابواللیث صدیقی (۱۹۱۶ء۔۱۹۹۴ء) ''رفعت و بود'' صفحہ ۱۱۵، پر لکھتے ہیں:

''درباروں کا حال ہم نے بہت سنا اور بہت پڑھا ہے۔مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک دربار سیّد سلیمان اشرف صاحب کا تھا۔ایک عالم، فاضل اور مومن کا دربار، جن کو دیکھ کر اسلاف کی یاد تازہ ہوتی تھی۔مجھے تو مولانا کے یہاں جانے کا کم ہی اتفاق ہوا۔واقعہ یہ تھا کہ مجھ پر مولانا کی شخصیت کا کچھ ایسا سحر ہوا تھا کہ میں حاضر ہونے سے خوف کھاتا۔''

سیّد سلیمان اشرف نے علی گڑھ میں بڑی باوقار زندگی گزاری، آپ کی مجلس ایک قلندر کی مجلس تھی۔جس میں چھوٹے بڑے سب ہی آتے۔اور آپ ہر ایک سے برابر کا سلوک کرتے تھے۔رشید احمد صدیقی آپ کی مجلس کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چبوترے سے متصل نیم دائرہ سائبان میں مونڈھے بچھے ہوتے۔ایک طرف چارپائی بھی ہوتی، بڑے سے بڑا آدمی بھی کیوں نہ آجاتا، اُس کیلئے کوئی اچھی کرسی یا صوفاء وغیرہ اندر سے نہ لایا جاتا، جو موجود ہوتا۔اُسی پر وہ بیٹھ جاتا۔اور سارے مجمع کو دیکھ کر یہی معلوم ہوتا کہ مرحوم (سیّد محمد سلیمان اشرف) سب ہی پر چھائے ہوئے ہیں۔کسی سے آج تک مرحوم نے ایسی گفتگو نہ کی جس سے معلوم ہوتا کہ مولانا نووارد سے مرعوب ہیں یا اُس سے خاص طور پر متاثر ہیں۔بڑے سے بڑے نواب کو بھی میں نے مرحوم کے پاس بیٹھے دیکھا ہے۔اور لوگ بھی موجود ہوتے ہیں لیکن مولانا ہر ایک سے ایک ہی اُتار چڑھاؤ سے گفتگو کررہے ہیں۔مولانا کا پرانا نوکر جما اُسی طرح نواب صاحب کو چائے کی ایک پیالی لاکردے گا جس طرح وہ مجمع میں کسی اور کو دیتا۔'' (۲۴)

پروفیسر رشید احمد صدیقی مزید بیان کرتے ہیں:

''زندگی میں ہر طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن اکثر محسوس یہی ہوا کہ مخاطب میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ہے......لیکن مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ ہر موضوع اور ہر موقع سے اِس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے کہ اُن کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ فلاں جگہ کمی ہے، جسے پورا کرنے کیلئے کسی اور کو ڈھونڈھنا چاہیے......اُنہوں نے اپنی خداداد ذہانت واخلاص سے ہمیشہ وہ سطح قائم رکھی جس کو میں نے اپنے نزدیک اپنی استعداد اور اپنی آرزو کے عین مطابق پایا۔مولانا کی صحبت سے جب کبھی اٹھتا تو معلوم ہوتا کہ میں نے کوئی نئی اور اچھی بات سیکھی یا کوئی نیا اور اچھا جذبہ پیدا ہوگیا۔پریشان و مایوس ہوا تو اُن کی صحبت سے ہشاش بشاش اُٹھا، رنج یا غصہ ہوا تو مرحوم کی باتوں سے غم غلط ہوگیا۔خالی الذہن گیا تو معلومات کے

ایسے نادر ولطیف نکتوں سے بہرہ مند اُٹھا جو شاید مدتوں کے مطالعہ سے
حاصل نہ ہوسکتے۔'' (۲۵)

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف سدا بہار شخصیت کے مالک تھے۔اُن کی مجلس بھی سدا بہار تھی، فکر وغم کا اُن کے ہاں گزر نہ تھا۔صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو خود دنیائے علم وادب میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے، سیّد محمد سلیمان اشرف صاحب کی انہی خوبیوں کی بناء پر اُن کے گرویدہ تھے۔

صدر یار جنگ کا مولانا سلیمان اشرف صاحب کی وفات تک مستقل معمول رہا کہ وہ ہر روز شام کے وقت سیّد صاحب کی قیام گاہ ''آدم جی منزل'' پہنچ جاتے۔علمی اور دینی مسائل پر گفتگو فرماتے اور بعد نماز مغرب اپنے گھر تشریف لے جاتے۔مولانا بدر الدین علوی استاد شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی جو سیّد صاحب کی خانقاہ کے مستقل حاضر باشوں میں سے تھے، بیان کرتے ہیں:

''نواب صدر یار جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ جتنے دن بھی علی گڑھ میں قیام رہتا، روزانہ مغرب کے قریب مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں تشریف لاتے۔علمی و دینی مسائل، بزرگوں کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوعِ سخن رہتے۔مولوی سیّد سلیمان اشرف صاحب نے نشست میں یہ ترتیب قائم کی تھی کہ ایک جانب خود، بیچ میں نواب (حبیب الرحمٰن خاں شروانی) صاحب اور دوسرے پہلو پر میں۔(سیّد بدرالدین علوی)'' (۲۶)

ایک دفعہ شروانی صاحب کے روزانہ حاضری کے معمول سے تنگ آکر آپ کے چچا زاد بھائی نواب مزمل اللہ خاں شروانی نے اُنہیں ٹوکا اور گرم ہوکر کہا:

''یہ کیا واہیات ہے کہ روزانہ جہاں شام ہوئی مولوی سلیمان اشرف کے یہاں، (حبیب الرحمٰن خاں شروانی صاحب کی جانب سے) اس کا جواب یہی تھا کہ خبط ہے۔'' (۲۷)

مولانا بدرالدین علوی مزید لکھتے ہیں کہ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

''نہایت وضع دار تھے، جس سے جو رسم قائم ہوگئی بہت پختگی کے ساتھ اُس پر عمل رکھا.....تشریف آوری کا معمول اسی پختگی کے ساتھ مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں مقرر تھا۔غرض پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات تھی پتھر کی لکیر کے مانند، کسی کی طاقت نہ تھی کہ ذرا بھی جنبش دے سکے۔'' (۲۸)

سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں:

''مرحوم (مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی) کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڑھ میں مولانا سلیمان اشرف کی قیام گاہ میں آخیر وقت تک حاضری تھی، جو بعد نماز مغرب تک جاری رہتی۔جب وہ علی گڑھ آتے، یہ حاضری بلا ناغہ، ہر موسم میں اور ہمیشہ رہی۔اُس وقت دلچسپی کا سامان علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلیمان اشرف کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبدالطیف کی قیام گاہ پر اُسی وقت اور اُسی حیثیت سے یہ مجلس جاری رہی۔'' (۲۹)

حکیم محمد خلیل احمد القادری الجائسی سیّد سلیمان اشرف کے شخصیت اور مجلسی معمولات کو بیان کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''آپ کی شخصیت عزتِ نفس، غیرتِ علم، قلندریت اور دانش وری کا مرقع تھی۔آدم جی پیر بھائی منزل کے ایک حصہ کو اپنا بسیرا بنا لینے والے اِس مردِ مومن اور صوفی باصفا نے زندگی کی وہ طرح ڈالی، جس سے ہزاروں زندگیوں نے روشنی لی اور خود بھی منارۂ علم وعمل بنے۔وائس چانسلر سر ضیاء الدین احمد آپ کے حضور میں حاضری کو باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اہم مسائل میں آپ کی اصابت رائے سے ہمیشہ استفادہ کرتے رہتے تھے۔ریاضی کی چند گتھیوں کو سلجھانے کیلئے حضرت ہی کے مشورہ پر

اُنہی کی معیت میں سفر جرمنی کو بریلی کی طرف موڑ دیا اور چٹکیوں میں حل
ہونے والی گتھیوں کے واقعہ پر برِعظیم کے عظیم ماہر ریاضیات ہمیشہ کیلئے
حضرت بلکہ امام اہلسنّت (مولانا احمد رضا بریلوی) کی غلامی کا دم بھرنے
لگے۔ پروفیسر ظفرالحسن (۱۸۷۹ء۔ ۱۹۴۹ء) کے تحقیقی مقالے کے اصل
روحِ رواں سیّد صاحب ہی تھے۔ علم دین کی حرمت کا یہ عالم تھا کہ کبھی
کانووکیشن میں شریک نہیں ہوئے۔ عربی فارسی اور منطق و فلسفہ کے
پروفیسران اپنی گتھیوں کو لے کر طالبِ علمانہ آتے اور نئی روشنی و نئے عزم
کے ساتھ کلاس جاتے۔ گفتگو میں علم وفضل کی جلالت ومتانت کے ساتھ
ساتھ خوش طبعی اور مزاح لطیف کی کلیاں بھی کھلتی رہتیں۔ خود فراموشی اور
قلندریت نے اگرایک جانب سادگی اور سادہ مزاجی کا سبق آموز نقشہ
پیش کیا تو دوسری طرف نزاکتِ طبع نے روسائے وقت کو انگشت بدنداں
کردیا۔ گرمی کی آگ، سردی کی برفانیت، برسات کا طوفاں بادوباراں
ہمیشہ ایک ہی جگہ پر آپ کے قیام گاہ کی استقامت کو چومتی اور آگے
بڑھتی ہیں۔ صدریار جنگ جو خود بھی متبحر عالم اور مولانا ابوالکلام آزاد
(۱۸۸۸ء۔ ۱۹۵۸ء) جیسے لوگوں سے مراسلانہ روابط رکھتے، ہمیشہ عصرو
مغرب کی نماز آپ کے فقیر کدہ پر آپ کی امامت میں پڑھتے۔ اور
گھنٹوں علمی پیاس بجھاتے رہتے۔ سیّد صاحب کے مرقد اور قیام گاہ کے
سنگ مرمر پر کندہ کتبے سیّد صاحب کے حضور آپ کی عقیدت بلکہ والہانہ
عشق اور کمال علم وفضل کے آئینہ دار ہیں۔'' (۳۰)

درحقیقت'' سیّد محمد سلیمان اشرف صاحب کے علمی مشاغل، خطابت،
صوفی منشی، گھر کی مجلسیں، اُن کے گرد مشاہیر کا مرجوعہ، علمائے ہند میں
اُن کا مرتبہ، اُن کا کردار، اپنوں کے ساتھ اُن کی بے لوث محبت، غیروں
کے ساتھ شفقت، اُن کی حق بینی اور صداقت پسندی کا سلسلہ بہت

طویل ہے۔ حقیقت میں انہی خصوصیات نے مولانا کو اُن کے ہم
عصروں میں ممتاز کررکھا تھا۔ مولانا نے اپنا سب کچھ علی گڑھ کو دے رکھا
تھا اور اُسی کو اپنا مستقل مستقر بنالیا تھا...... (جہاں) مولانا کا علم وعرفاں
مرجع خاص وعام تھا۔'' (۳۱)

شبیر احمد غوری کے مطابق علی گڑھ میں '' اصل سلیمان اشرف وہ شخصیت
نہ تھی جو آدم جی منزل میں قیام پزیر تھی اور جس کے آستانہ کی زیارت
اکابر یونیورسٹی اور وجوہِ داعیانِ شہر وضلع علی گڑھ کیلئے موجب صد افتخار
تھی۔ اصل سلیمان اشرف اُس نابغہ روزگار کی شخصیت تھی جو صحیح معنوں
میں '' جامع الحیثیات''، '' جامع العلوم'' اور '' جامع المنقولات والمعقولات''
تھی کہ اگر وہ طالبانِ حدیث کو علم حدیث نہ صرف درایتاً بلکہ روایتاً بھی
پڑھاتے تو اُن کی درسگاہ محدثین سابقین کی مجالیس کی مثیل ونظیر بن
جاتی اور اگر وہ نحو کے شائقین کو فن نحو کی تعلیم دیتے تو اُن کی مجلس
مُبرّد اور فراء کی مجالیس علمیہ کی یادگار ثابت ہوتی۔'' (۳۲)

سیّد سلیمان اشرف اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سیّد سلیمان اشرف صاحب کی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تدریسی زندگی کم وبیش
تین عشروں پر محیط ہے۔ ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء سے لے کر اپنے وصال ۱۹۳۹ء تک سیّد صاحب
نے یہاں علم وعمل کی وہ شمع روشن رکھی جس کی ضیا باریوں سے فیض یاب ہونے والوں نے علمی
ادبی اور قومی زندگی میں اہم کردار ادا کیا۔

علی گڑھ میں سیّد صاحب کی یہ تدریسی زندگی اسلامی تعلیمات وتشخص کے تحفظ و
بقا کی جدوجہد اور برعظیم کے مسلمانوں میں قومی وملّی جذبہ کی آبیاری سے عبارت ہے۔ جس کا
تذکرہ اگلے ابواب میں آرہا ہے۔

ذیل میں ہم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے حوالے سے اُن کی کچھ مختصر خدمات کا تذکرہ
کررہے ہیں۔ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کا:

"وجود علی گڑھ یونیورسٹی کیلئے آیۂ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔وہ علم وفضل
کا بحرِ زخّار اور ظاہری وباطنی خوبیوں کا پیکر جمیل تھے۔ہزاروں تشنگان
علم اُن کے فیضان علمی سے بہرہ یاب ہوئے اور پھر اپنے اپنے دوائر
میں اُن کا نام روشن کیا۔" (۳۳)

سیّد سلیمان اشرف اپنی دینی عظمت واستقامت،علمی وقارواعتبار،حق شناسی وحق
گوئی،فکر وبصیرت،استغنا وبے نیازی ہر لحاظ سے علی گڑھ کے ماحول میں اپنی مثال آپ
تھے۔آپ نے اپنی زندگی کے کم وبیش تیس سال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں درس وتدریس میں
گزارے اور آدم جی پیر بھائی منزل میں مستقل قیام فرمایا۔

مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے آدم جی پیر بھائی منزل کے شمالی برآمدے
میں وسطی کمرے کے دروازے پر ایک یادگاری کتبہ نصب کرا کر آپ کی خدمات جلیلہ کا
اعتراف کیا۔افتخار عالم خاں اپنی کتاب "مسلم یونیورسٹی کی کہانی،عمارتوں کی زبانی ۱۹۲۰ تا
۱۹۴۷ء" (مطبوعہ ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ،اشاعت دوم ۲۰۰۶ء کے صفحہ ۱۷۹،اور ۱۸۰)
پر اِس تاریخی واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایگزیکٹو کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۶،مارچ ۱۹۴۰ء میں مولوی محمد
حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی ایما پر حاجی ابوالحسن صاحب کی پیش کردہ
یہ قرارداد منظور کی کہ ایک کتبہ جس پر مندرجہ ذیل عبارت کندہ ہو آدم جی
پیر بھائی منزل کے شمالی برآمدے میں وسطی کمرے کے دروازے پر
نصب کردیا جائے۔

بیادگار

مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب مرحوم ومغفور صدر شعبۂ دینیات مسلم
یونیورسٹی علی گڑھ بہار شریف (بہار) تیس سال مسلسل آدم جی پیر بھائی
منزل کے اِس حصے میں مستقل قیام فرمایا۔اپنی حمیتِ دین فضیلت علم،
اصابتِ فکر اور ستودگی سیرت سے اِس درسگاہ کو سربلند رکھا اور سربلند رہے۔

وہ روان شوق ارما سالہا آرند یاد
نقشہا انگیخت در راہ محبت گام ما۔"

سیّد سلیمان اشرف نے ہمیشہ اپنے آپ کو نصابی سرگرمیوں تک محدود رکھا اور کبھی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ہونے والے کسی غیر نصابی پروگرام میں شرکت نہیں کی۔پروفیسر
رشید احمد صدیقی گنج ہائے گرانمایہ صفحہ ۴۲۔۴۳ پر لکھتے ہیں:

"یونیورسٹی میں بڑے لوگوں کی آمد پر جشن منایا جاتا جلسے ہوتے۔مرحوم
اُن میں کبھی شریک نہ ہوتے۔اِس پر اکثر پیچیدگی بھی پیدا ہوئیں۔لیکن
مرحوم اپنی جگہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہ ہوئے۔کہتے تھے یونیورسٹی میں
دولت وامارت کا کیا ہیچ؟ ایسے لوگوں کیلئے ساری دنیا پڑی ہے۔وہیں یہ
ڈھونگ اچھا معلوم ہوتا ہے۔یہاں علم وفضل دیکھا جاتا ہے۔کوئی
صاحب فضل وکمال آئے تو البتہ!"

آپ کے شاگرد مولانا ابرار حسین فاروقی گوپامئوی اپنے مضمون "حضرت مولانا
سیّد سلیمان اشرف علیہ الرحمہ" (مطبوعہ ماہنامہ معارف،اعظم گڑھ فروری ۱۹۷۵ء،صفحہ ۱۲۸)
میں لکھتے ہیں:

"مولانا مرحوم کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی بڑے آدمی کے گھر
نہیں گئے۔سر راس مسعود (مسعود جنگ) جو نہ صرف وائس چانسلر تھے
بلکہ جنھوں نے جدید تنظیمی کمیشن تشکیل کرکے یونیورسٹی کی دنیا میں تہلکہ
مچادیا تھا مولانا مرحوم نے اُن کے یہاں بھی کبھی حاضری نہیں دی۔علی
گڑھ کی سلور جوبلی بڑے دھوم دھام سے منائی گئی۔باہر سے بڑے
بڑے مہمان آکر شریک ہوئے لیکن مولانا اپنے چبوترے سے جس پر
شام کو احباب کے ساتھ نشست فرماتے تھے،نہیں اُترے،حالانکہ جلسہ
حضرت کی نشست گاہ اور کمرہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا بلکہ شرکائے
جلسہ خود بارگاہ سلیمانی میں حاضر ہوئے۔"

علی گڑھ میں گوشہ نشینی کے باوجود پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کی ذاتِ گرامی مرجع اکابر واعیان تھی۔اُن کی بارگاہ میں نہ صرف یونیورسٹی کے اکابر بلکہ ضلع علی گڑھ کے رؤسائے عالی مقدار اور شہر کے وجوہ واعیان حاضر ہوتے تھے۔آپ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کئی وائس چانسلروں اور پرو وائس چانسلروں کے ماتحت رہے،لیکن کبھی اپنی خود داری کو ٹھیس نہ آنے دی۔کبھی کسی کے یہاں حاضری نہیں دی بلکہ یہ حضرات خود کبھی کبھار بارگاہ سلیمانی میں حاضر ہوتے تھے اور آپ حسب مرتبہ اُن کی آؤ بھگت فرماتے تھے۔

ماسوائے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے کہ جنھوں نے اسلامک اسٹڈیز کا مسئلہ کھڑا کیا تھا،مہاراجہ محمود آباد،نواب سر مزمل اللہ خاں،سر شاہ سلیمان جج الہ آباد ہائی کورٹ،سر راس مسعود،ڈاکٹر ضیاء الدین احمد وغیرہ سب ہی سے آپ کے تعلقات خوشگوار رہے۔

سیّد سلیمان اشرف نہ صرف اچھے فاضل اور عربی،فارسی،منطق اور فلسفہ کے بہترین معلم تھے،بلکہ ایک سلجھے ہوئے ماہر تعلیم بھی تھے۔۲۶-۱۹۲۵ء میں جب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کیلئے میٹرک سے لے کر ایم،اے تک کی دینیات کی جماعتوں کیلئے ایک نئے نصاب کے ترتیب دینے کی ضرورت محسوس ہوئی۔تو سیّد سلیمان اشرف بھی نصاب مرتب کرنے والی کمیٹی میں دیگر ماہرین تعلیم میں مصنف بہار شریعت مولانا امجد علی اعظمی (۱۸۸۲ء-۱۹۴۸ء)،وغیرہ کے ساتھ شامل رہے اور آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کا نصاب تعلیم مرتب کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

اِس کمیٹی کی کارکردگی کا تذکرہ کرتے ہوئے سیّد سلیمان ندوی ماہنامہ ''معارف'' علی گڑھ میں لکھتے ہیں:

> ''منتظمین یونیورسٹی کی دعوت پر چند ایسے علماء جو جدید ضروریات سے آگاہ اور نصاب ہائے تعلیم اور درسگاہوں کا تجربہ رکھتے تھے،علی گڑھ میں جمع ہوئے اور متواتر سات اجلاسوں میں جو ۱۱،فروری سے ۱۷، فروری تک منعقد ہوتے رہے،مسئلہ کے تمام پہلوؤں کو سمجھا اور اس کے آخر تک نقشۂ عمل اور ایک نصاب میٹرک سے ایم،اے تک کا تیار

> کر کے یونیورسٹی کے سامنے پیش کر دیا۔اِس مجلس کے ارکان حسب ذیل ارکان تھے۔مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی،مولانا سیّد سلیمان اشرف صدر علوم شرقیہ،مناظر احسن گیلانی (۱۸۲۹ء-۱۹۵۶ء)،مولانا امجد علی صدر مدرس مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر اور خاکسار۔مولانا عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸ء-۱۹۷۸ء)،استاذ عربی ادبیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی خاص موقعوں پر شرکت کی۔علوم مشرقیہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔عقلیات،دینیات،ادبیات۔اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ نصاب ترتیب دیا گیا ہے۔''(۳۴)

چنانچہ اِس نصاب کے نفاذ سے یونیورسٹی میں دینیات کا معیار درجہ بہ درجہ بلند ہوتا چلا گیا۔محمد امین زبیری (۱۸۷۶ء-۱۹۵۸ء) اِس نصاب کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ ایک ایسا سلسلہ نصاب ہے جس سے عقائد،فقہ اور اخلاق اسلامی کی اُن تمام معلومات پر عبور ہو جاتا ہے جن کی ہر ایک مسلمان کو تمدن وتہذیب اور معمولاتِ زندگی میں ضرورت رہتی ہے۔اِس نصاب کی ترتیب کیلئے ایک قانونی کمیٹی ہے جس میں سنّی اور شیعہ علماء اور چند پروفیسر شامل ہیں۔سنّی علماء میں حاجی الحرمین الشریفین مولانا سلیمان اشرف صدر (چیئرمین) شعبۂ دینیات ومطالعات اسلامیہ (اسلامک اسٹیڈیز) جناب مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب (۱۸۸۰ء-۱۹۴۰ء) ناظم دینیات،جناب مولوی حفیظ اللہ صاحب سابق مہتمم ندوہ اِس مجلس نصاب کے ارکان ہیں۔اوّل الذکر علمائے کرام یونیورسٹی کے طلبا کو تعلیم بھی دیتے ہیں۔''(۳۵)

اِن علماء کرام کا وجود اور اِن کی کوششیں و کاوشیں اِس یونیورسٹی کو حقیقی معنوں میں مسلم یونیورسٹی بنانے میں معاون و مددگار تھیں۔چنانچہ محمد امین زبیری اِن علمائے ذی وقار

کے وجود کو یونیورسٹی کیلئے صحیح معنوں میں ''مسلم یونیورسٹی'' ہونے کے اعزاز سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد سلیمان اشرف و مولانا ابوبکر شیث و جناب مولانا یوسف حسن صاحب نجفی فیوضہم جیسے جلیل القدر علماء کی شمولیت اہتمام بجا آوری ارکان مذہب، تجویز و تعلیم نصاب دینیات اور اِن کا حلقہ درس یہ سب اُمور بجائے خود دلائل باہرہ ہیں کہ مسلم یونیورسٹی حقیقی معنوں میں مسلم ہے۔'' (۳۶)

سیّد سلیمان اشرف صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اسلامی نصاب کے نفاذ اور دینی تعلیم کے فروغ و احیا کیلئے فعال کردار ادا کیا۔ چنانچہ محمد امین زبیری آپ کے طریقہ تدریس اور اِس حوالے سے کی گئی کوششوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یونیورسٹی کے مقررہ مضامین کے ماسوا جناب صدر شعبہ دینیات مولانا سلیمان اشرف صاحب بطور خود شائقین علوم مذہبی کو خاص اصول کے ساتھ نہایت دلچسپ طریقہ سے درس تفسیر دیتے ہیں۔ بلاشبہ اِس شعبہ میں طلبا کم ہیں مگر اِس کمی کے خاص اسباب سے قطع نظر کرکے ہم مولانا ممدوح کا ایک فقرہ السبیل سے نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں، ثانیاً یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم گہری استوار اور مستحکم بنیاد پر قائم کرنا چاہیے، معلّم سے پڑھانے میں اور متعلّم سے پڑھنے میں کامل اور صحیح محنت لی جائے اگرچہ اِس صورت میں طلبا کی تعداد زیادہ نہ ہوگی لیکن۔

یکے مرد جنگی بہ از صد ہزار۔'' (۳۷)

اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سیّد سلیمان اشرف صاحب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی (جسے دسمبر ۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا) میں علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت کے خواہاں تھے۔ اُنہوں نے اپنے مشن کا آغاز اُس وقت سے ہی کردیا تھا جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو یونیورسٹی کا درجہ بھی حاصل نہیں ہوا تھا اور وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کہلاتا تھا۔ چنانچہ

اپنی اِن مساعی کا تذکرہ کرتے ہوئے خود سیّد صاحب لکھتے ہیں:

''کالج ابھی یونیورسٹی کو پہنچا بھی نہ تھا مگر میں نے اِس کی بنیاد رکھنی شروع کردی اور دو گریجویٹوں کو اِس پر آمادہ کرلیا کہ وہ شعبہ منقول کی تکمیل صحیح استعداد کے ساتھ کریں، چنانچہ سیّد عبدالروف پاشا مدراسی اور سیّد احمد شاہ پشاوری اِس کیلئے آمادہ ہوگئے اور کام شروع ہوگیا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عین موقع پر ایک طوفان عظیم نان کو آپریشن کا آیا، جس میں ساری محنت نذرِ سیلاب ہوگئی۔ اب مسلم یونیورسٹی قائم ہوگئی اور نان کو آپریشن کا زلزلہ اِس تعلیم گاہ میں مائل بسکون ہونے لگا۔'' (۳۸)

السبیل کے مندرجہ بالا اقتباس سے آپ سیّد سلیمان اشرف صاحب کی تڑپ اور اُس لگن کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو اُن دل میں عرصہ دراز سے موجزن تھی کہ اسلامی مدارس اور بالخصوص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وہ کس قسم کے فارغ التحصیل طلبہ نیز آپ ہندوستان بھر میں کس پایہ اورفن کے اساتذہ دیکھنے کے آرزومند تھے۔

ستمبر ۱۹۲۴ء میں جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خان نے ڈھاکہ یونیورسٹی کی طرز پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نصاب میں اصلاحی منصوبوں کا آغاز کیا تو سب سے پہلے شعبۂ علوم اسلامیہ کو اپنی اصلاحی تحریک کا ہدف بنایا۔ جس سے سیّد صاحب اور اُن کے درمیان ناخوشگوار فضا پیدا ہوئی۔ پروفیسر صاحب اور آفتاب احمد خان کے درمیان جنم لینے والے اِس کشیدگی کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری لکھتے ہیں کہ اُس وقت:

''شعبۂ علوم اسلامیہ کے سربراہ مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب تھے۔ مولانا زبردست عالم دین اور غیر معمولی صلاحیت کے انسان تھے۔ آپ کا شمار اکابرِ قوم میں ہوتا تھا۔ اِس موقع پر صاحبزادہ صاحب کا آپ سے براہ راست ٹکراؤ ہوا۔ ظاہر ہے مولانا جس مرتبہ اور حیثیت کے

آدمی تھے اُن کیلئے یہ بات کسی طرح بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی تھی کہ
کوئی شخص بھی اُن کے شعبہ کے معاملات میں مداخلت کرے۔لہٰذا
صاحبزادہ صاحب کی دخل اندازی پر اُن کا ناراض ہونا بالکل فطری اَمر
تھا۔چنانچہ مولانا نے یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ اورعربی زبان کی تعلیمی
صورتحال سے متعلق ایک طویل نوٹ تیار کیا۔اور کتابی شکل میں
''السبیل یعنی مجمل یادداشت متعلق اسلامک اسٹیڈیز مسلم یونیورسٹی''
کے عنوان سے شائع کردیا۔''(۳۹)

ممتاز ماہرِ تعلیم اور دانشور ڈاکٹر معین الدین عقیل (پ ۱۹۴۶ء) کے مطابق:

''اِس بحث میں مولانا سیّد سلیمان اشرف نے بھی اپنے جذبہ ایمانی
وعلمی کے تحت حصہ لیا...... تاکہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے حقیقی مقاصد
کی طرف بڑھا جاسکے...... اُن کی وہ رپورٹ اکیڈمک کونسل میں پیش کی
گئی جو منظور کرلی گئی۔''(۴۰)

یوں ''السبیل''، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کے تحت ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔چونکہ وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب اُن دنوں انگلستان گئے ہوئے تھے اِس لیے یہ کتاب اُس وقت کے قائم مقام وائس چانسلر نواب سر محمد مزمل اللہ خاں شروانی کے حکم سے شائع ہوئی،جس پر قائم مقام وائس چانسلر کے علاوہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد،صدر یار جنگ نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور جناب فخر الدین وزیرِ تعلیم صوبہ بہار اور اڑیسہ کی آراء بھی شامل تھیں۔جن میں اِس یادداشت کو نہ صرف سراہا گیا تھا بلکہ اِسے وقت کی اہم ضرورت بھی قرار دیا گیا تھا۔

''السبیل''یونیورسٹی میں علومِ اسلامیہ کی صورتحال سے متعلق محض ایک یادداشت ہی نہ تھی بلکہ اِس میں سیّد سلیمان اشرف نے شعبۂ علوم اسلامیہ کی کارکردگی کی صفائی بھی پیش کی تھی۔اُنہوں نے شعبہ تاریخ اسلام میں یونیورسٹی طلبا کیلئے عہد بنواُمیہ (۶۶۱۔۷۵۰ء) اور عہد بنوعباس (۷۵۰۔۱۲۵۸ء) مقرر کیا اور ساتھ ہی طلبا کو اِس بات کا بھی پابند بنایا کہ وہ

''کتاب الفخری'' اور''مقدمہ ابن خلدون'' کے چوتھے ، پانچویں اور آٹھویں باب کا لازمی مطالعہ کریں۔

چونکہ اُس زمانے میں یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ کا انگریزی شعبہ قائم ہوچکا تھا، اِس لیے سیّد صاحب نے اُسی کی مطابقت وموافقت سے عربی میں اسلامی تاریخ کیلئے بنواُمیہ اور بنوعباس کا دور مقرر کیا۔جس کا مقصد طلبا کیلئے تاریخ و سیر کے اصل ماخذ ومراجع سے رجوع اور اُن سے براہ راست استفادہ حاصل کرنا تھا۔

تاکہ طالبانِ علم میں جہاں ذوقِ تحقیق پیدا ہو، وہیں وہ بعض مستشرقین کی جانب سے اٹھائے گئے بے جا اعتراضات جن میں تعصب کی بناء پر ذاتِ اقدس ﷺ کونشانہ بنایا گیا ہے ،کی اصل حقیقت سے بھی واقف ہوسکیں۔چنانچہ اِس تناظر میں تاریخ اسلام کیلئے جو نصابِ تعلیم سیّد سلیمان اشرف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیلئے تجویز کیا،اُس کی افادیت بلاشبہ اپنی جگہ مسلّمہ تھی۔آپ نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصابِ تعلیماتِ اسلامیہ کیلئے جوتجاویز مرتب کیں۔ وہ تجاویز اور تعلیمی منصوبہ''السبیل'' کے نام سے مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ سے شائع ہوا۔

جس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ''السبیل''اِس خطے میں ہماری تعلیمی زندگی اور خاص طور پر مطالعاتِ اسلامی کے نشیب وفراز اور ہمارے ماضی کی کاوشوں اور جدوجہد اور عزائم و مقاصد کو ہی ہمارے سامنے نہیں لاتی، بلکہ یہ اگلے کسی سہانے وقت میں کسی جامعہ یا علمی ادارے کو اسلامی تعلیمات یا مطالعات اسلامی کے فروغ ونفاذ کا جذبہ تحریک بھی دیتی ہے، قطعاً غلط نہیں ہے۔

ممتاز محقق پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل اِس تعلیمی منصوبے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف صاحب کی:

''یہ تصنیف اِس اعتبار سے اہم ہے کہ اِس میں جامعات کیلئے بلکہ اعلیٰ
دینی مدارس کیلئے نہ صرف اُن کی دینی وعلمی ضرورتوں اور تقاضوں پر روشنی
ڈالی گئی ہے بلکہ ایک مکمل اور معیاری نصاب کیلئے تجاویز بھی پیش کی گئی

ہیں جن کے مطابق ایک عمدہ اور مفید نصاب تیار کیا جاسکتا ہے۔'' (۴۱)

ترکِ موالات کا طوفان اور یونیورسٹی کا تحفظ و دفاع

برعظیم کی سیاسی تاریخ میں ۲۱-۱۹۲۰ء کا دور سیاسی لحاظ سے جذباتی اور ہنگامی دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اُس دور میں تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور تحریکِ ہجرت نے عوام و خواص سب کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ جمعیت العلمائے ہند کے رہنماء اور کانگریس کے ہندو لیڈر اِن تحاریک کو کامیاب بنانا چاہتے تھے۔

چنانچہ تحریکِ ترکِ موالات کے دوران اُن کی خواہش تھی کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور (ق ۱۸۹۲ء) اور اسلامیہ کالج پشاور (ق ۱۹۱۳ء) کو بند کر کے تعلیمی سلسلہ موقوف کر دیا جائے اور مسلمان طلبا اِس تحریک کا حصہ بن کر فعال کردار ادا کریں۔ اِس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ ہندو لیڈروں کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھاتی تھی کہ اِکا دُکا مسلمان بھی کسی سرکاری عہدے پر نظر آئیں۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی اور متذکرہ کالجز میں تعلیم پا کر مسلمان جو کچھ اسامیاں پُر کر لیتے ہیں اِس سلسلے کو بھی بند کر دیا جائے۔

چنانچہ مولوی محمود حسن (۱۸۵۱ء-۱۹۲۰ء) صدر مدرس دارالعلوم دیوبند (۴۲) کے فتویٰ ترکِ موالات کی اشاعت کے بعد:

> ''۱۱، اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی برادران مع گاندھی جی علی گڑھ آئے۔ چند دن بعد خلافت تحریک کے دوسرے رہنماء بھی علی گڑھ پہنچ گئے، جن میں کالج کے ممتاز ٹرسٹی اور اولڈ بوائز مثلاً حکیم اجمل خاں (۱۸۶۸ء-۱۹۲۷ء)، ڈاکٹر انصاری (مختار احمد انصاری ۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء)، نواب محمد اسمٰعیل خاں (۱۸۸۴ء-۱۹۵۸ء)، تصدق احمد خاں شروانی وغیرہ شامل تھے۔ ممتاز علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء) اور مولانا آزاد سبحانی (مولانا عبدالقادر آزاد سبحانی، ۱۸۸۲ء-۱۹۵۷ء) بھی تشریف لائے تھے۔ تحریکِ خلافت اور موالات کے اِن رہنماؤں کی کوشش یہ تھی کہ علی گڑھ کالج اِس تحریک میں مرکزی ادارہ کی حیثیت

> اختیار کر لے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ کالج کے اربابِ حل و عقد گورنمنٹ گرانٹ نامنظور کر دیں اور کالج کا الحاق ختم کر لیں۔ تمام خطاب یافتہ ممبرانِ اسٹاف اپنے خطابات واپس کریں۔ کالج سنٹرل خلافت کمیٹی کے تحت ایک قومی ادارہ بن جائے اور تمام نوجوان خلافت کے کام میں مصروف ہو جائیں اور اگر بورڈ آف ٹرسٹیز اور کالج سنڈیکیٹ اِن تجاویز کو قبول نہ کریں تو پھر طلباء تعلیمی مقاطعہ کریں۔'' (۴۳)

لیکن بورڈ آف ٹرسٹیز اور کالج سنڈیکیٹ دونوں نے اِن تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری جانب اولڈ بوائز کی ایک بڑی تعداد بھی اِن تجاویز کی مخالف تھی اور چاہتی تھی کہ کالج کو ترکِ موالات کی تحریک سے محفوظ رکھا جائے۔ جبکہ جمعیت علمائے ہند (ق ۱۹۱۹ء) اور بعض لیڈروں جن میں مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء-۱۹۳۱ء)، شوکت علی (۱۸۷۳ء-۱۹۳۸ء)، مولوی محمود حسن اور موہن داس کرم چند گاندھی (۱۸۶۹ء-۱۹۴۸ء) وغیرہ شامل تھے، کی خواہش اور کوشش تھی کہ تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج لاہور اور پشاور میں تعلیمی سرگرمیاں معطل کر دی جائیں اور اِن کالجوں کو بند کر دیا جائے۔

اس کشمکش کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تقریباً سو طالب علم مع ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر بھارت) کالج چھوڑ کر تحریکِ خلافت میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ اِس صورتحال میں کالج کے اربابِ حل و عقد نے کچھ دنوں کیلئے کالج کو بند کر دیا۔ جس سے کالج کو کچھ نقصان ضرور پہنچا مگر وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور بالخصوص پروفیسر سیّد سلیمان اشرف صاحب کی کوششوں کی بدولت کالج متحدہ قومیت اور ترکِ موالات کے سیلاب کی زد میں آنے سے محفوظ رہا۔

اُس وقت سیّد سلیمان اشرف نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو متحدہ قومیت اور ترکِ موالات کے سیلاب سے بچانے کیلئے مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ (۴۴) اِس طوفان بلاخیز کے سامنے سیّد سلیمان اشرف، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے ہمراہ عزم

واستقلال اور استقامت کا پیکر بنے ڈٹے رہے۔ چنانچہ اُس وقت کی منظرکشی کرتے ہوئے مولوی عبدالماجد دریا آبادی (۱۸۹۲۔۱۹۷۷ء) نے لکھا:

''ساری فضا پر یہی حضرات (مولوی حسین احمد مدنی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۱۸۷۸۔۱۹۲۶ء)، اور علی برادران) چھائے ہوئے (تھے) ......اصلی اور معرکہ کا مورچہ علی گڑھ تھا۔ شروانی صاحب مع اپنے گنے (چنے) چند افراد کے ساتھ دوسرے کیمپ میں (موجود تھے) کچھ نہ پوچھئے کہ (اُس وقت اُنہیں) کیا کچھ سننا پڑا، کیا کچھ سہنا پڑا، جوش اور ہیجان کے وقت کس کو زبان و قلم پر قابو رہا ہے۔ آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے اور کل ''حبیب الرحمٰن'' سے ''حبیب الشیطان'' مشہور ہوئے۔''(۴۵)

سیّد سلیمان اشرف کی علی گڑھ کالج کے تحفظ و دفاع کیلئے کی گئی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے ممتاز دانشور سیّد نور محمد قادری لکھتے ہیں:

''سیّد سلیمان اشرف صاحب نے اِس موقع پر علمی، قلمی اور فکری لحاظ سے جہاد کا حق ادا کردیا اور مسلمان قوم اور اسلامی درسگاہوں کو بچانے کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ ہر روز شام کی نماز کے بعد مولانا محمد علی (جوہر) سے اِس مسئلہ پر اُلجھ پڑتے اور گرما گرم بحث کرتے۔ اِس موقع پر بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے اور کئی احباب جو دل سے تحریک کے رہنماؤں کے طرزِ عمل کو اچھا نہیں سمجھتے تھے، لیکن برسرِ عام کچھ کہنے کی جرات نہ کرتے تھے۔''(۴۶) نے خاموشی اختیار کرلی۔

مگر سیّد سلیمان اشرف نے نتائج سے بے پرواہ ہوکر مجاہدانہ کردار ادا کیا اور اس ادارے کو شکست و ریخت سے بچالیا۔ اُنہوں نے ادارے کی حمایت و دفاع میں اُس وقت بھر پور تحریک چلائی جب ابوالکلام آزاد، مولوی محمود حسن دیوبندی اور مولانا محمد علی جوہر جیسے لوگ اِس کے خلاف اور آمادہ مخالفت تھے۔

حق گوئی و بیباکی

حق گوئی اور بیباکی سیّد سلیمان اشرف بہاری کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ آپ اپنے نقطہ نظر کے اظہار میں بڑے جری اور بیباک تھے۔ اِس حوالے سے سیّد صاحب کی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تقرری کے وقت، حکیم محمد خلیل احمد القادری الجائسی کا بیان کردہ ایک واقعہ پہلے ہی آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔ آیئے ایک اور واقعہ نواب مشتاق احمد خاں کی زبانی سنتے ہیں۔ نواب لکھتے ہیں:

''یہ تحریکِ عدم تعاون کا زمانہ تھا، کالج میں علمائے کرام اور سیاستدانوں کی یلغار تھی۔ ذہنی ہیجان اور افراتفری کا عالم تھا۔ سب چھوٹے بڑے نتائج سے بے پروا اسی رَو میں بہے چلے جارہے تھے۔ مولانا اُن معدودے چند بزرگوں میں تھے جنھیں اِس تحریک سے شدید اختلاف تھا۔ اُن کی نظر میں اِس کے مضمرات مسلمانوں کے عقائد اور مفاد کے منافی تھے۔ مثلاً شردھانند (ف ۱۹۲۳ء) جیسے کٹر ہندو کو مسجد میں تقریر کیلئے لانا ایک ناقابلِ برداشت جسارت تھی۔ مولانا اپنے خیالات کا اظہار کھلم کھلا اور لگی لپٹی کے بغیر کردیتے تھے۔ رَو میں بہہ جانے والے لوگوں نے خاص کر بعض علمائے کرام نے اُنہیں بہت برا بھلا کہا اور اخباروں اور رسالوں میں لعن طعن ہوتی رہی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ایک دن جب وہ تفسیر کا درس دے رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر جنھوں نے اُس زمانہ میں اپنا مستقر علی گڑھ کو بنایا ہوا تھا، طلباء کے ایک گروہ کے ساتھ مسجد میں تشریف لائے اور قریب آکر مولانا پر ایک طنزیہ فقرہ چست کردیا۔ اُس کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اُس سے مولانا کی اعلیٰ شخصیت اور کردار کی بلندی کا واضح ثبوت مل گیا۔ وہ نہ صرف اپنے موقف پر ڈٹے رہے بلکہ اِس گرما گرم بحث میں مولانا محمد علی جوہر جیسے شخص کو نیچا دکھادیا۔ اُس دن میں نے مولانا کو بڑے جلال

میں دیکھا اُن کی یہ بات میں کبھی نہیں بھول سکتا ''آپ لوگوں نے مذہبی اُصولوں اور فقہی مسائل کو تماشا بنادیا ہے، میں زندہ رہا تو دیکھوں گا کہ کون حق پر ہے۔'' مولانا محمد علی اور مولانا سیّد سلیمان اشرف میں کئی دن تک برابر نوک جھوک رہی۔ اُنہوں نے کسی موقع پر بھی مولانا محمد علی جوہر کی بھاری بھرکم شخصیت کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ چار پانچ ماہ کے ہنگاموں کے بعد مسلمانوں نے عام طور پر یہ محسوس کیا کہ اُنہوں نے جذبات کی رو میں بہہ کر اپنا نقصان کیا ہے، مذہبی عقائد سے پہلوتہی کی ہے اور علی گڑھ کے تعلیمی سال کی بربادی بھی۔ دوسری طرف اِس سارے دور میں بنارس ہندو یونیورسٹی پر کوئی آنچ تک نہیں آئی۔ ہندو شاطروں نے سادہ مسلمان اکابر کے واسطے سے علی گڑھ کو قربانی کا بکرا بنایا۔ یہ احساس دلانے میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔''(۴۷)

سیّد سلیمان اشرف کے شاگرد پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''آج کم وبیش دس گیارہ سال ہوئے۔ یونیورسٹی پر تحقیقاتی کمیٹی بیٹھ چکی تھی۔ بعض دوسرے لوگوں کی طرح مولانا بھی زد میں تھے۔ ہر طرف سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ نفسی نفسی کا عالم تھا۔ بڑے بڑے سورماؤں کے پاؤں لڑکھڑانے لگے تھے۔ اُس وقت کا حال وہی لوگ جانتے ہیں جن پر وہ عالم گزر چکا ہے۔ اُس زمانے میں، میں نے مولانا کو دیکھا، کیا مجال کہ روزمرہ کے معمولات میں فرق آجاتا۔ جن کے بارے میں جو رائے رکھتے تھے، اُس کا علی الاعلان اظہار کرتے۔ شام کے وقت برآمدے میں لوگ بیٹھے ہوتے، چائے نوشی کی صحبت گرم ہوتی اور ایسا معلوم ہوتا جیسے مصیبت کا کہیں نام نشان نہیں ...... ایک شب میں بھی حاضر ہوا...... میں نے کہا مولانا کیا ہونے والا ہے ...... کہنے لگے ہوگا

کیا، وہی ہوگا جو ازل سے تقدیر ہو چکا ہے۔ مومن کی شان یہی ہے کہ اُس پر ہراس طاری نہ ہو۔ تم ڈرو گے تو اُن لوگوں کا کیا حال ہوگا جو تم کو اپنا سردار سمجھتے ہیں۔ جو ہونے والا ہے وہ ہو چکا ہے، پھر ڈرنے جھجکنے سے کیا فائدہ۔؟...... وہ دن گزر گئے، جو کچھ ہونے والا تھا، وہ بھی ہو چکا، مرحوم بھی جوارِ رحمت میں پہنچ گئے۔ اِس وقت میں اُس زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کیسا مرد اور کتنا بڑا سردار ہم سے چھین لیا گیا۔ مرحوم میں سرداری کی بڑی بڑی باتیں تھیں۔ تحقیقاتی کمیٹی کا زمانہ کوئی معمولی زمانہ نہ تھا، اُس وقت صرف مولانا کی ذات ایسی تھی جو اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح قائم تھی۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ مرحوم زندہ ہوتے اور اُن کے تاریخی دومنزلہ پر دشمن کے ہوائی جہاز بم برساتے تو بھی مولانا کے معمولات میں کوئی فرق نہ آتا۔''(۴۸)

یہی رشید احمد صدیقی صاحب تحریکِ ترکِ گاؤکشی اور تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں اپنے استادِ محترم کے عزم، حوصلے، استقامت اور مومنانہ بصیرت افروز کردار کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۹۲۱ء کا زمانہ ہے۔ نان کو آپریشن کا سیلاب اپنی پوری طاقت پر ہے۔ ''گائے کی قربانی'' اور ''موالات'' پر بڑے بڑے جید اور مستند لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کردیا ہے۔ اُس زمانے کے اخبارات، تقاریر، تصانیف اور رجحانات کا اب اندازہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کیا سے کیا ہوگیا۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ کہا جارہا ہے، وہی سب کچھ ہے۔ یہی باتیں ٹھیک ہیں۔ اِن کے علاوہ کوئی اور بات ٹھیک ہو نہیں سکتی تھی۔ کالج میں عجیب افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مرحوم (سیّد صاحب) مطعون ہو رہے تھے لیکن نہ چہرے پر کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق ...... (اُن دنوں

مجھے) دن میں کئی کئی بار (سیّد صاحب سے) ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔
کہتے تھے رشید! دیکھو علماء کس طرح لیڈروں کا کھلونا بنے ہوئے ہیں اور
لیڈروں نے مذہبی اصول اور فقہی مسائل کو کیسا گھر گھروندا بنا رکھا
ہے۔میری سمجھ میں اُس وقت ساری باتیں نہیں آتی تھیں۔اور نہ میں
اِن تفصیلات میں پڑنا چاہتا تھا۔لیکن مرحوم پر ایک خاص کیفیت طاری
رہتی تھی۔وہ رہ رہ کر اِن ہی باتوں کو چھیڑتے تھے اور کہتے تھے کہ میں
جھگڑا مول لینا نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کالج اِس قسم کے
مناقشوں کا مرکز بنے،لیکن کیا کروں خدا کو تو بعد میں منہ دکھانے کا
موقع ملے گا۔بالآخر مولانا نے اِن مباحث پر قلم اُٹھایا اور دن رات قلم
برداشتہ لکھتے رہتے ......سیلاب گزر گیا، جو کچھ ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔
لیکن مرحوم نے اُس عہد سراسیمگی میں جو کچھ لکھ دیا تھا بعد میں معلوم ہوا
کہ حقیقت وہی تھی۔اُس کا ایک ایک حرف صحیح تھا۔آج تک اُس کی
سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔سارے علما سیلاب کی زد میں آچکے تھے،صرف
مرحوم اپنی جگہ پر قائم تھے۔'' (۴۹)

پروفیسر سلیمان اشرف کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ ہمیشہ اُن کلمات کو دہرانے سے
اجتناب برتا جن سے بدمزگی اور مزید پیچیدگی پیدا ہونے کا اندیشہ ہوا۔اور کبھی بھی خود سے کسی
بحث و مباحثہ میں الجھنے اور مناظرہ کرنے کو پسند نہیں کیا۔آپ اپنے شدید ترین مخالفین اور
مناظرے و مباحلے کی دعوت دینے والوں سے بھی لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتے تھے۔ہمیشہ
اپنے اصولی مؤقف پر قائم رہتے تھے۔

چنانچہ مولوی محمد حبیب الرحمٰن بدایونی کے نام مکتوب (جو کہ البیان، مطبوعہ وکٹوریہ
پریس بدایوں۔۱۹۲۱ء،ص:۴۷ پر موجود ہے) میں لکھتے ہیں

''الحمد للہ کہ ساری عمر اِس سے محفوظ رہا ہوں۔آپ تین سو یا تین ہزار یا
تین لاکھ اعتراض رکھتے ہوں،تو بسم اللہ بصد شوق لکھیے، چھاپیے، تقسیم

کیجیے۔اپنی ذہانت و ذکاوت اپنے تبحر علم وفضل کا خراجِ تحسین وصول
فرمایئے،فقیر سے مخاطب ہونا فضول ہے۔آئندہ اِس قسم کی تحریروں کا
جواب محض سکوت ہوگا۔ہاں آپ کو اختیارِ کامل ہے کہ فقیر کے سکوت کو
جن الفاظ وعبارات میں چاہیں اخبارات میں بھیجیں، جرائد میں شائع
فرمائیں،نہ اِس کا گلہ،نہ شکوہ۔''

سیّد سلیمان اشرف کی یہ جرأت اور عزم و استقامت دراصل اُن کی ذات پر اللہ جل جلالہ
اور اُس کے حبیب ﷺ کا فضل وکرم تھا۔جس کا اظہار تشکر کرتے ہوئے آپ نے ''النور'' کے
صفحہ ۲۲۸ تا ۲۳۰، پر لکھا:

''جہاں تم نے ایک رکن دین جامع شرع متین امام اہل سنت مجدد مائتہ
حاضرہ مؤید ملتہ طاہرہ پر سبّ وستم کیا،وہاں اِس فقیر بینوا کو بھی بار بار
متعدد جرائد میں تم نے گالیاں سنائیں،میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔
بیشک یہ قصور ہوا کہ جس وقت تمام زبانیں گنگ تھیں مجھ گناہ گار کی زبان
کلمۂ حق کہہ رہی تھی۔جس وقت سارے اقلام خشک تھے،مجھ بے بضاعت
کا قلم مصروفِ تحریر تھا۔جس وقت سارے پاؤں مفلوج تھے، مجھ ضعیف کا
پاؤں منزل رساں راستہ پر تھا۔انصاف کرو اِس میں میری کیا خطا
ہوئی،یہ تو اللہ کا فضل تھا......مولیٰ تبارک وتعالیٰ کا ہزار احسان اور اُس
کے اِس خاص کرم کا ہزار ہزار شکر کہ جس چیز کو آج آپ قوم کے سامنے
پیش کررہے ہیں فقیر کو دس برس قبل قوم کے سامنے پیش کرنے کی
ہدایت فرمائی گئی......حق سبحانہٗ نے محض اپنے فضل عمیم سے بطفیل آقائے
دوعالم ﷺ دین فروشی وگمراہ سازی سے مصئون ومحفوظ رکھا۔''

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کی اِس سخت گیر روش اور کانگریس وگاندھی نوازوں سے
نفرت و بیزاری کے رویہ کو ڈاکٹر سیّد عابد احمد علی وقت کا اہم تقاضہ اور مسلمانانِ ہند کی بڑی
خدمت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کانگریس اور گاندھی کے خلاف شدید مذمت اور بیزاری کا رویہ جس طرح حضرت مولانا بریلوی نے اختیار کیا تھا، بعینہٖ وہی چیز سیّد صاحب میں پائی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ علی گڑھ یونیورسٹی کی مسجد میں بعض لوگوں نے گاندھی کو تقریر کیلئے بلایا۔ تو سیّد صاحب نے بعد میں خود اپنے ہاتھ سے ساری مسجد کو دھو کر صاف کیا اور اس سلسلے میں سیّد صاحب کے فکری جہاد کا اندازہ کرنے کیلئے آپ کی تالیفات "النور" اور "المبین" وغیرہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے...... مجھے مولانا کی سخت گیر روش کے بارے میں یہ کہنا ہے کہ یہ اُس دور میں ملتِ اسلامیہ کی ایک بہت بڑی خدمت تھی۔ علماء کا ایک گروہ گاندھی کی تحریکِ قومیت کا جس انداز میں ساتھ دے رہا تھا اگر اُس کا مقابلہ بروقت پوری شدت کے ساتھ نہ کیا جاتا تو کسے معلوم کہ ہماری تحریک آزادی کا آج کیا حشر ہو چکا ہوتا۔؟ مجھے اُس دور کی صورت حال کا اچھی طرح سے اندازہ ہے اور استاذ محترم سیّد سلیمان اشرف کی بے تابیاں بھی میرے ذہن پر نقش ہیں۔"(۵۰)

اُس دور کے مذہبی اور سیاسی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر سیّد عابد احمد علی مزید لکھتے ہیں:

"بقائے ملت کیلئے نہایت ضروری ہوتا ہے کہ اُس کا ملّی شعور شدت کے ساتھ نہیں بلکہ ایک گونہ تعصب کی حد تک بیدار اور مستحکم رکھا جائے تا کہ ملت کی انفرادی حیثیت منفرد اور قائم رہے۔ جس دور میں مولانا بریلوی موجود تھے اُس کا بڑا تقاضا یہی تھا اور مولانا مرحوم و مغفور نے اِس مقصد کیلئے نہایت پامردی کے ساتھ کام کیا، ورنہ ہمارے بڑے بڑے علماء کے قدم اُس وقت ڈگمگا گئے تھے۔ مولانا نے دراصل ملّی شعور کی تازگی اور بقا کیلئے ایک تحریک پیدا کی۔ جس میں استاذ محترم سیّد سلیمان اشرف مرحوم نے بھی بہت کام کیا، جس کا میں ذاتی طور پر گواہ ہوں۔"(۵۱)

مناظرہ بریلی، مابین سلیمان اشرف اور ابوالکلام آزاد

۲۴، مارچ ۱۹۲۱ء کو ابوالکلام آزاد اور پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کے درمیان بریلی میں ایک تاریخی مناظرہ ہوا۔ یہ وہ وقت تھا جب غیر منقسم ہندوستان میں ہندو مسلم متحدہ قومیت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اور اِس نظریہ کے پرچارک کانگریس اور جمعیت علمائے ہند کے لیڈران برِعظیم کے طوفانی دورں میں مصروف تھے۔

چنانچہ اِس حوالے سے جمعیت العلمائے ہند نے ابوالکلام آزاد کی صدارت میں بریلی میں ایک جلسہ عام رکھا۔ جس میں پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے اپنے بیباکانہ موقف کا اظہار فرمایا اور اُن کو مشرکین ہند کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط و اتحاد کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے اسلامی نظریہ قومیت (مسلم قومیت) کا بھرپور دفاع کر کے ششدر و لا جواب کر دیا۔ یہ واقعہ "مناظرہ بریلی" کے نام سے مشہور ہوا جو ہماری ملی تاریخ میں اسلامی تشخص کے تحفظ و امتیاز اور دو قومی نظریہ کی نظریاتی جنگ کا ایک اہم باب ہے۔ اِس اہم مناظرے کی تفصیلات ساتویں باب میں ملاحظہ کیجئے۔

عقائد و نظریات اور اہلِ علم سے باہمی تعلقات

سیّد سلیمان اشرف صاحب ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔ آپ یونیورسٹی کے طلباء، اساتذہ، ہم عصر علماء اور اہل علم و دانش میں یکساں مقبول تھے۔ ہر طبقۂ فکر کے لوگ آپ کا احترام کرتے تھے۔ دوسری طرف خود سیّد صاحب بھی اپنے نقطۂ نظر کے مخالف اہل علم سے اچھے تعلقات رکھتے تھے۔

اُن کے حلقہ احباب میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کا مسلکی اور سیاسی نظریہ آپ سے قطعاً مختلف اور جدا تھا۔ جیسے علی گڑھ یونیورسٹی کے استاد اور ناظم دینیات مولوی ابوبکر شیث (جو دیوبندی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے اور جمعیت علمائے ہند کے سرگرم حامی تھے) کا مسلک وعقیدہ ہی نہیں سیاسی وابستگی بھی سیّد سلیمان اشرف کے مسلک اور سیاسی نظریے سے جدا تھی۔ لیکن اِس کے باوجود وہ سیّد صاحب کے مصاحبین میں شامل تھے۔

دوسرے مکاتیبِ فکر کے اہل علم کے ساتھ سیّد صاحب کا یہ تعلق و رابطہ مسلک اور

عقیدے کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض علمی فضل کی بناء پر تھا۔اور سیّد سلیمان اشرف:

''اہلِ فضل وکمال کی بڑی قدر کرتے تھے۔'' (۵۲) دوسرے لفظوں میں

''مولانا صاحب علم کی وقعت خود بھی کرتے تھے اور دوسروں کو بھی اُس کی عزت کرنے کیلئے کہتے تھے۔'' (۵۳)

چنانچہ سیّد سلیمان اشرف صاحب کی اِس وسعت قلبی کو علم دوستی اور اہل علم کی قدرومنزلت کا نام دیا جاسکتا ہے جو کہ مسلم یونیورسٹی میں اُن کے منصب کا تقاضہ اور علی گڑھ کے علمی وادبی ماحول کا خاصہ تھا۔اِس کے باوجود سیّد صاحب اپنے مذہبی معتقدات میں بڑے متصلّب تھے اور جب کبھی مذہبی گفتگو ہوتی تو جلال میں آجاتے۔سیّد صاحب کے ہم عصر نواب مشتاق احمد خاں بیان کرتے ہیں:

''مولانا اپنے مذہبی عقائد میں بڑے پکے تھے اور اُن کا اظہار بڑے بیباکانہ طریقے سے کرتے تھے۔اسلام کے ناموس کی حفاظت کیلئے وہ ہروقت آمادۂ جہاد رہتے تھے۔'' (۵۴)

جبکہ سیّد سلیمان اشرف کے ایک اور ہم عصر مولانا سیّد سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء۔۱۹۵۳ء) لکھتے ہیں کہ

''اُن کے مذہبی خیالات علمائے بریلی کے مطابق تھے اور اُن (محدث بریلوی) کے بڑے مداح تھے۔پھر بھی اُن کی ملاقات اور میل جول ہر خیال کے لوگوں سے تھا۔(۵۵)

سیّد سلیمان اشرف کے عزیزترین شاگرد پروفیسر رشید احمد صدیقی گنج ہائے گرانمایہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے مرحوم کو جھجک کر یا گول مول باتیں کرتے کبھی نہیں پایا......
مرحوم مذہبی معتقدات میں بڑا غلو رکھتے تھے اور اظہار کا موقع آتا تو کھلم کھلا اُن کا اعلان بھی کردیا کرتے تھے۔'' (۵۶)

سیّد بدرالدین احمد کہتے ہیں کہ سیّد محمد سلیمان اشرف:

''اپنے معتقدات کے اظہار میں ذرہ برابر بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔اُن کو اپنے علم اور اپنے ایمان پر کلی اعتماد تھا۔وہ شک وتشکیک کی منزلوں سے دور ایمان و یقین کی منزلوں میں ہمیشہ رہتے رہے۔اُن کی ہندوستان کے صاحبان علم وفضل سے برابر کی دوستی تھی مگر جہاں اُن علماء میں سے کسی کو لغزش کرتے دیکھتے تو بلارعایت ٹوک بھی دیتے۔'' (۵۷)

جبکہ پروفیسر محمد زبیر کے مطابق:

''مولانا اپنے نظریات وخیالات کے اظہار میں شمشیر برہنہ تھے۔ہر موقع پر بڑی اور چھوٹی شخصیت کے سامنے سچی اور صحیح بات کو بلاتکلف اور برملا کہہ دیتے تھے۔اُن کی شخصیت میں سنجیدگی،خودداری اور اصول پسندی بڑی انفرادی اور نرالی شان رکھتی تھی۔اُن کے تبحّر علمی پر جلال و جمال کے اتنے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے جنھیں موصوف کا مزاج شناسا ہی چھوسکتا ہے۔'' (۵۸)

سیّد سلیمان اشرف ''مذہباً حنفی اور مشرباً چشتی نظامی'' (۵۹) تھے۔اور اُن کا ''دینی و سیاسی مسلک مولانا احمد رضا بریلوی کے مسلک کے مطابق تھا۔'' (۶۰) وہ محدث بریلوی سے گہری محبت وعقیدت رکھتے تھے اور اُن کی تعلیمات ومعتقدات سے ازحد متاثر تھے۔

جہاں تک اُن کے دیگر مکتبہ فکر کے اہل علم ودانش کے ساتھ تعلقات کا معاملہ ہے تو یہ بات طے ہے کہ سیّد سلیمان اشرف کے روابط بہت وسیع تھے اور اُن کے حلقہ احباب میں مختلف مکاتیب فکر کے لوگ شامل تھے۔مولانا ابرار حسین فاروقی گوپامئوی لکھتے ہیں کہ

''مولانا ممدوح کے تعلقات و روابط اپنے معاصرین سے ہمیشہ خوش گوار رہے۔۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی بن جانے کے بعد مرحوم کا مرتبہ اور عہدہ دونوں بڑھ گئے تھے،(مگر) اِس میں فرق نہ آیا۔'' (۶۱)

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے مطابق

''مرحوم کی ایسوں ایسوں سے بھی گہری دوستی تھی جن کو دین ومذہب

سے دور کا بھی سروکار نہیں (تھا) اور ایسوں سے بھی تھی جو اپنے وقت کے بڑے جید عالم دین سمجھے جاتے تھے۔ ہر شخص محبت و احترام کے جذبات لے کر آتا تھا اور مطمئن و مسرور واپس جاتا۔ جس سے طبیعت نہ ملتی کبھی اُس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی کہ مرحوم کی صحبتوں میں بیٹھ سکے۔ مرحوم اِس معاملے میں بڑے کھرے تھے، کبھی دنیا سازی کی خاطر کسی کی تالیف قلب نہ کی۔'' (۶۲)

عظیم آباد کی تہذیبی داستان کے مصنف سیّد بدرالدین احمد رقمطراز ہیں:

''مولانا سبھوں سے بڑے اخلاق سے ملتے اور اپنی صحبت میں اِس بات کو نمایاں طور پر ملحوظ رکھتے کہ مساوات واخلاق کے ترازو کا پلہ کسی سے ملنے میں کم وبیش نہ ہو۔ وہ حق بین تھے مصلحت بین نہ تھے...... اُن کو اپنے پرانے عقائد اور اپنے اُصولوں پر اعتمادِ کلی تھا...... اُن کے شناسا اور اُن سے ملنے والے ہزاروں تھے۔ مگر اُن کی ہر ایک سے دوستی نہ تھی۔'' (۶۳)

چنانچہ سیّد سلیمان اشرف کے ہم عصروں اور شاگردوں کے ذاتی مشاہدات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے مذہبی معمولات، روایات اور اصول ومعتقدات کی جو تصویر بنتی ہے، اُس کے مطابق سیّد سلیمان اشرف ایک راسخ العقیدہ سنّی حنفی مسلمان تھے۔ اُن کا دینی و سیاسی مسلک محدث بریلوی کے مسلک کے عین مطابق تھا اور وہ اپنے عقیدے ونظریے کے اظہار میں جری و بیباک تھے۔ اُنہیں کسی سے ڈرنا، جھجکنا اور گول مول باتیں کرنا سخت ناپسند تھا۔ غیر اسلامی شعار اور اسلام دشمنوں کی حمایتیوں کے سخت مخالف تھے۔ کفار ومشرکین سے کسی قسم کی مداہنت روا رکھنے کے قائل نہیں تھے اور وہ شک وتشکیک کے بجائے ہمیشہ ایمان ویقین کی راہوں کے مسافر رہے۔ اور اُن کے دیگر مکاتیب فکر کے افراد سے باہمی روابط وتعلقات کے حوالے سے یہی کہا جاسکتا ہے کہ

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں
فقط یہ بات کہ پیرمغاں ہے مردِ خلیق

سیرت وصورت کی جلوہ آرائیاں

سیّد سلیمان اشرف نیک نفس انسان تھے۔ ہمیشہ دوسروں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے اور اُن کی مدد کرتے تھے:

''مولانا مرحوم ومغفور اپنے استاد زادوں کی بڑی خدمت کرتے تھے۔ اپنے استاد کے داماد کو اپنے ماتحتی میں ملازمت دلوائی، اُن کے بیٹے کی تعلیم کے کفیل ہوئے اور میٹرک پاس کرانے کے بعد اُن کو یونیورسٹی کے دفتر میں ملازمت دلوائی، وہ مرحوم کے ساتھ ہی رہتے تھے اور باوجود ملازم ہوجانے کفالت حسب سابق جاری رہی۔ مرحوم اپنے بھانجے سیّد معین کے بھی کفیل تھے۔ اُن کو ایل ایل بی تک تعلیم دلوائی، سیّد معین سیشن جج کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔'' (۶۴)

سیّد سلیمان اشرف نے اپنے بڑے بھائی سیّد انیس اشرف جو محکمہ پولیس میں آفیسر تھے، دماغی توازن بگڑنے کے بعد انہیں اپنے پاس رکھا اور اُن کے انتقال تک دیکھ بھال و خدمت کرتے رہے۔ سیّد انیس اشرف ''کسی سے نہ بولتے تھے اور نہ کسی کو ستاتے تھے۔ یونی ورسٹی لائبریری جاکر کتابوں کے مطالعے میں مشغول ہوجاتے، حضرت مولانا نے جیسی اُن کی خدمت کی اُس کی نظیر ملنی مشکل ہے۔'' (۶۵) بقول سیّد سلیمان ندوی ''اپنی ضعیف والدہ کی اطاعت اور اپنے دیوانہ بھائی کی رفاقت اور خدمت میں عمر اِس طرح گزاری کہ اس کی نظیر مشکل ہے۔'' (۶۶)

سیّد سلیمان اشرف پُرسوز، دردمند، جامع اور متنوع شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی طبیعت میں خودداری اور عزتِ نفس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مدتوں شادی سے گریزاں رہے۔ اپنی والدہ محترمہ کے شدید اصرار پر آخری عمر میں محض اتباع سنت نبویہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ خاتون خانہ بھی جلد ہی داغ مفارقت دے گئیں۔

آپ ''خوش خوراک، خوش پوشاک، باوضع اور متواضع انسان تھے۔'' (۶۷) پان میں رام پوری تمباکو، بغیر دودھ کی چائے کے شوقین تھے۔ جبکہ سالن میں تیز مرچیں پسند

کرتے تھے۔ کھانا ہمیشہ چٹائی پر اُکڑوں بیٹھ کر کھاتے۔ مہمان کی آؤ بھگت اور تواضع میں جو کچھ موجود ہوتا پیش کرتے۔ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف شکل وصورت اور ناک نقشہ کے لحاظ سے وجیہ اور باوقار شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کا ''گورا رنگ، مضبوط جسم، گنجان داڑھی، تیز و چمکدار آنکھیں'' (۶۸) تھیں۔ لباس ہمیشہ قیمتی اور اُجلا پہنتے تھے۔ اُن کی اِن خصوصیات کا ذکر جب اُن کے دیکھنے والے کرتے ہیں تو اُن کے دلکش و باوقار پیکر کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

جناب رشید احمد صدیقی اپنے استادِ محترم کا سراپا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قد میانہ، رنگ صاف، جلد روشن، اعضا پتلے، نقشہ نرم ونازک، آنکھیں چھوٹی جن میں جذبات کا اُتار چڑھاؤ جھلکتا رہتا، نظر تیز اور پُر اعتماد، انداز میں بانکپن، انگلیاں ایسی جن میں قلم، شمشیر و رباب سب ہی زیب دیں۔ آواز میں کڑک اور لچک، خطابت پر آتے تو معلوم ہوتا صفیں اُلٹ دیں گے۔ نماز پڑھاتے تو معلوم ہوتا خدا کا کلام دوسروں کو پہنچانے میں اپنی اور اپنے مالک دونوں کی عظمت کا احساس ہے۔'' (۶۹)

جناب رشید احمد صدیقی کے مطابق آپ کی آواز میں بڑا رعب وجلال تھا، جب آپ تلاوت فرماتے تو ایسا:

''معلوم ہوتا تھا کہ خالد کی تلوار میدان جہاد میں کوندتی، لرزتی، گرتی، لچکتی، کاٹتی، سمیٹتی، تیرتی، ابھرتی آگے بڑھتی چلی جارہی ہے...... یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے جسم وجان میں بجلیاں بھر گئی ہیں اور خود سُپاری میں ہم ہی نہیں در و دیوار بھی جھوم رہے ہیں۔'' (۷۰)

رشید احمد صدیقی مزید لکھتے ہیں:

''مرحوم کی سیرت کا ایک خصوصی پہلو یہ تھا، وہ جو چیز رکھتے اُس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہوتی اور بہت دل کش ہوتی، بڑی قیمتی ہوتی یا اُس کے ساتھ کوئی خاص روایت وابستہ ہوتی، ہمیشہ پاکیزہ قیمتی

اور مردانہ وضع کے لباس پہنتے، گراں قیمت اور نادر قسم کے اونی کپڑوں کا بہت شوق تھا۔ شیروانی یا روئی دار اچکن کا کپڑا بڑا صوفیانہ اور دل کش ہوتا...... (سیّد سلیمان اشرف صاحب) دوسرے کے تولیے یا رومال سے ہاتھ نہیں پونچھتے تھے، ننگے سر بمشکل دیکھے جاتے، گفتگو بلند آواز سے کرتے، کانا پوسی گوارا نہ تھی، عمامہ اکثر ہلکے زعفرانی رنگ کا ہوتا اور جوتی دلّی کی پُرزر، ململ کا لمبا بڑی کشادہ آستینوں کا کرتہ پہنتے، جس کے نیچے ململ کی بٹن دار صدری ہوتی۔ کپڑا قیمتی اور شریفانہ رنگ اور وضع کا ہوتا۔'' (۷۱)

سیّد سلیمان اشرف کے ایک اور شاگرد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں (۱۹۱۲۔۲۰۰۵ء) لکھتے ہیں:

''مولانا خوش رُو اور جامہ زیب تھے، علی گڑھ کٹ پاجامے سے ذرا ڈھیلا پاجامہ ہوتا تھا۔ کرتہ اور عموماً نہایت اعلیٰ کپڑے کی شیروانی ہوتی تھی۔ بلکہ سردی کے زمانے میں روئی کی شیروانی بھی بہت خوبصورت ہوتی تھی۔ ایسی شیروانی کی لمبی دھاریوں کے ساتھ سلائی ہوتی تھی۔ بڑا رومال، سرخ اور سیاہ پھولوں والا ہوتا تھا۔ سر پر عموماً لکھنوی سفید ٹوپی یا عمامہ (عموماً ہلکے بادامی رنگ کا) ہوتا تھا۔ آپ کا رنگ سرخ وسفید تھا۔ نہایت متوازن اعضا تھے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ ہتھیلیوں کی لکیریں لمبی اور بہت نمایاں تھیں۔'' (۷۲)

جناب سیّد سلیمان ندوی کے بقول:

سیّد سلیمان اشرف بہاری ''خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے۔ (۷۳)

آپ کی طبیعت ظرافت اور لطافت سے مزین تھی۔ اپنے مقربین خاص کی صحبتوں میں دلچسپ واقعات سناتے اور ایسے ایسے فقرے اور لطیفے بیان کرتے کہ سننے والوں کی طبیعت

باغ باغ ہو جاتی۔ ایسے ہی ایک موقع کی منظرکشی کرتے ہوئے رشید احمد صدیقی نے لکھا:

''ایک بار چائے نوشی کی صحبت گرم تھی۔ سارے درویش موجود تھے۔ ایک صاحب تھے جن کو خانقاہ سلیمانیہ میں لائف ممبری کا درجہ حاصل نہ تھا، لیکن اکثر بار پائے جاتے تھے۔ مولانا لطف اللہ (۱۸۲۸ء۔۱۹۱۶ء) صاحب مرحوم کے علم و فضل کا تذکرہ تھا کہ متذکرہ بزرگ آپہنچے۔ یہ مولانا لطف اللہ مرحوم کے شاگرد تھے، چنانچہ آنے کے ساتھ ہی گفتگو میں شریک اور تعریف و توصیف میں سب سے پیش پیش نظر آنے لگے۔ مرحوم نے چائے کا ایک دہکتا مہکتا نیم جرعہ لیتے ہوئے فرمایا، بھائی میں تو مولانا لطف اللہ صاحب کی کرامت کا قائل ہوں۔ نووارد نے تعجب میں آکر پوچھا، مولانا یہ کیونکر، مرحوم نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ فرمایا ''اور جو انہوں نے آپ کو پڑھا دیا یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔'' (۷۴)

اسی طرح مولانا ابرار حسین فاروقی گوپامئوی آپ کی زندگی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (جس کی سنگ بنیاد ۱۹۱۸ء میں فتح جنگ میر عثمان علی آصف جاہ ہفتم نے ریاست حیدرآباد میں رکھی) کے ایک بزرگ حضرت مولانا شیر علی صاحب مرحوم جو مولانا مرحوم کے جون پور میں رفیق درس رہ چکے تھے تشریف لائے، جاڑوں کا موسم تھا۔ حضرت کے مہمان تھے، سخت سردی تھی، اُن کے رہنے کا انتظام کمرے کے اندر کردیا گیا تھا، خود حضرت مولانا جاڑوں میں بھی لحاف اوڑھ کر برآمدے میں سویا کرتے تھے۔ تہجد کے وقت حضرت مولانا شیر علی صاحب اٹھے۔ دروازہ کھولا جس کی آواز سے مولانا کی آنکھ کھل گئی، نیم خوابی کی حالت میں پوچھا کون؟ مہمان بزرگ نے اپنا نام لیا اور فرمایا ''مولانا گرم پانی وضو کیلئے چاہیے'' مولانا (سلیمان اشرف) نے اسی نیم خوابی کی

کیفیت میں لیٹے لیٹے جواب دیا کہ دوزخ میں ہے۔ مہمان نے برجستہ فرمایا، بہتر ہے اٹھیے اور اُس کا راستہ بتائیے۔ اِس برجستہ جواب پر مولانا نے قہقہہ لگایا اور فرمایا نیند تو غارت کی لیکن فقرہ خوب کہا۔'' (۷۵)

علی گڑھ میں پروفیسر سیّد سلیمان اشرف ایک سخت اور بااصول استاد کے طور پر جانے جاتے تھے۔ لیکن اِس کے باوجود طلبا کے ساتھ آپ کا رویہ انتہائی نرم اور مشفقانہ ہوتا تھا اور آپ حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے تھے۔ رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''ایک دن کلاس پہنچے۔ خلاف معمول بہت کم لڑکے نظر آئے۔ پوچھا کیا بات ہے، معلوم ہوا باہر سے کوئی مشہور کرکٹ ٹیم آئی ہوئی ہے، بڑے معرکہ کا میچ ہو رہا ہے۔ ایک لڑکے نے کہا مولانا چھٹی دے دیجئے تو ہم بھی دیکھ آئیں، بولے ہاں چھٹی ہے، مقصود حاضری تھی، لڑکے نے جواب دیا مولانا حاضری لیجئے گا تو بہتوں کا نقصان ہو جائے گا۔ فرمایا حاضری اپنی مقصود تھی، تمہاری نہیں، جاؤ جاؤ تم بھی میچ دیکھ آؤ!'' (۷۶)

مولانا ابرار حسین فاروقی گوپامئوی لکھتے ہیں:

جب'' مولانا نے اپنے شعبے کیلئے میرا انتخاب فرمایا اور شعبۂ دینیات کا کل کام میرے سپرد کردیا۔ (تو اُس وقت) شعبۂ میں تین آدمی تھے۔ میں لیکچرر، مولانا ابوبکر شیث فاروقی جون پوری ناظم دینیات اور حضرت مولانا (سلیمان اشرف) ریڈر اور صدر شعبہ تھے۔ امتحان کی کاپیاں جانچنے کا مولانا کا اصول طلبہ کیلئے غیر معمولی معاون تھا۔ حالاں کہ طلبہ کے حلقے میں مشہور تھا کہ مولانا کاپی جانچنے میں سخت ہیں۔ جو واقعہ کے برعکس تھا، اِس کا اندازہ اِس واقعہ سے ہوگا۔ ایک مرتبہ ایف اے اور ایف سی کے طلبہ کی تقریباً پانچ سو کاپیاں جانچنے کیلئے مولانا کے پاس آئیں، مولانا نے مجھ کو بلاکر فرمایا ''مولانا میں آپ کو ایک تکلیف دیتا ہوں، وہ یہ کہ پانچ سو کاپیاں آپ دیکھ کر نمبر دے دیجئے، میں نے عرض

والہانہ عقیدت بھی تھی۔ چنانچہ سال میں سیرت کے موضوع پر آپ کے
ایک دو غیر معمولی خطبے ہوا کرتے ۔ یہ خطبے درس عمومی اور درس تفسیر کے
علاوہ ہوا کرتے تھے۔'' (۷۹)

مولانا ابرار حسین فاروقی گوپامئوی لکھتے ہیں:

'' آپ صرف تین جگہوں پر وعظ فرمایا کرتے تھے۔ایک اجمیر شریف
کے عرس میں درگاہ شریف کے مدرسے میں، دوسرا ربیع الاوّل میں دہلی
میں خان بہادر سیّد بہاء الدین مرحوم ریٹائرڈ کلکٹر کے یہاں، تیسرا الہ
آباد میں ایک تمباکو کے تاجر کے یہاں۔اِن کے علاوہ کہیں وعظ نہ
فرماتے تھے۔جب کوئی وعظ کی فرمائش کرتا تو جواب میں فرماتے کہ
ہمارا کھاتا تو تین جگہ ہے، اِس کے علاوہ ہم وعظ نہیں کہتے، ہم مدرس
ہیں وعظ نہیں۔'' (۸۰)

شبیر احمد غوری کہتے ہیں کہ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کا یہ دورہ اجمیر یونیورسٹی کی
کارکردگی اور پبلسٹی کے علاوہ معقول آمدنی کا سبب بھی تھا۔ ہر سال اجمیر کے اہل خیر آپ کے
ذریعے ایک خطیر رقم بطور امداد یونیورسٹی کیلئے دیتے تھے۔مگر آپ کی دینی غیرت نے کبھی اِس
سفر کے مصارف یونیورسٹی سے لینا گوارا نہ کیے۔(۸۱)

سیّد سلیمان اشرف بااصول شخصیت کے مالک تھے اور اپنے مزاج کے خلاف ایک
حرف بھی سننا پسند نہیں کرتے تھے۔آپ:

'' نہایت فیاض، کشادہ دست اور سیر چشم تھے۔دو تین سال کے علاوہ
اُن کی ساری عمر تجرد کی حالت میں گزری، کوئی اولاد نہ تھی۔خاندان کے
عزیزوں سے طبیعت کو چنداں مناسبت نہ تھی۔جو کچھ تھا احباب کے نذر
تھا۔استاد زادوں اور دوستوں کی اولاد کے ساتھ وہ کچھ کیا جس کو اُس
زمانہ میں مشکل سے کوئی دوسرا کرسکتا ہے۔انتہا یہ ہے کہ مرتے دم تک
جو کچھ چھوڑا وہ بھی نذرِ احباب۔'' (۸۲)

اُن کی ''سب سے بڑی خوبی اُن کی خودداری اور اپنی عزتِ نفس کا
احساس تھا۔اُن کی ساری عمر علی گڑھ میں گزری، جہاں اُمراء اور اربابِ
جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا، مگر انہوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ اُن
میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے، جس سے ملے برابری سے ملے
اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر۔علی گڑھ کے سیاسی
انقلابات کی آندھیاں بھی اُن کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔'' (۸۳)

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف راضی بررضا رہنے والے انسان تھے۔مخالفین نے آپ
کے خلاف کیا کیا حربے نہ استعمال کیے مگر آپ نے کبھی تہذیب واخلاق کا دامن نہ چھوڑا
اور کبھی اپنے بدترین مخالف کیلئے حرف شکایت و ملامت زباں پر نہ لائے۔شبیر احمد غوری لکھتے
ہیں:

''حضرت مولانا اپنے وقت کے اکابر علما میں محسوب ہوتے تھے۔وہ
جامع الحیثیات، جامع العلوم اور جامع المعقولات والمنقولات تھے......
(مگر) تحقیقات علمیہ کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر مولانا کے سینے میں گھٹ
کر رہ گیا۔اِس گھٹن کا احساس ہی کیا کم روح فرسا تھا کہ آخر زمانہ میں
حُسّاد بدنہاد کی دسیسہ کاریوں اور پیہم نیش زنیوں نے حضرت مولانا کے
سکون وطمانیت کو درہم برہم کرکے رکھ دیا۔حضرت مولانا فطرتاً نہ سیم
وزر کے طلب گار تھے اور نہ وجاہت کے خواہش مند، مگر نیش زنی سے
ضرور متاثر ہوتے تھے اور یہ اُن کے زمانہ ملازمت بالخصوص ۱۹۲۸ء تا
۱۹۳۱ء کا وقفہ ایک عبقریٔ وقت کی زندگی کا بڑا کرب ناک دور ہے۔
حضرت مولانا نے کبھی اِس کے خلاف شکوہ سنجی نہیں کی۔'' (۸۴)

سفر حج ہزاروں اسفار کا مجموعہ ہے۔یہ ایک ایسی عالمگیر اور ہمہ گیر عبادت ہے جس
میں توحید کے وجد آفریں نعرے، شہادت کے ترانے، نماز کی طہارت، روزہ کا تقویٰ، زکوٰۃ کا
تزکیہ، باطن کا تصفیہ، جہاد کی ریاضت، جدو جہد اور سرشاری، صدقہ خیرات کی آسودگی اور

تلاشِ نقوشِ پائے جاناں کی بے تابیاں شامل ہیں۔ یہ سفر ادب و تہذیب، سلیقہ و شائستگی، جذب و شوق، راز و نیاز بین عبد و معبود اور حاضری درِ محبوب ﷺ کا نام ہے۔

ہر محبِّ صادق کی تمنا ہوتی ہے کہ اِس سعادت کی توفیق مل جائے۔ بیت اللہ اور دیارِ حبیب ﷺ کی حاضری نصیب ہوجائے۔ وہ اِس آرزو میں تڑپتا ہے، مچلتا ہے اور کروٹیں بدلتا ہے۔ شام و سحر دعائیں اور التجائیں کرتا ہے۔ اور جب اذنِ باریابی ملتا ہے تو شوق وارفتگی ایسا بے چین کرتی ہے کہ عاشق صادق کا جی چاہتا ہے پر لگ جائیں اور وہ اُڑ کر ارضِ مقدس پہنچ جائے۔ ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے والہانہ عشق و محبت رکھنے والے پروفیسر سیّد سلیمان اشرف بھی اِسی کیفیت سے دوچار تھے۔ جوں جوں ایامِ حج قریب آتے جارہے تھے شوق و وارفتگی بڑھتی جارہی تھی۔ مولانا ابرار حسین فاروقی گوپامئوی نے اِس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

> ''مولانا ممدوح نے حج وزیارت کا سفر بڑے اہتمام سے کیا تھا۔ جیسے جیسے سفر کا زمانہ قریب آتا جاتا تھا، اُن کی والہانہ کیفیت اور شوق و وارفتگی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ مرحوم نے جدہ کے بعد واپسی تک جوتا نہ پہنا، اُن کی اتباع میں اُن کے رفیق خان بہادر زین الدین صاحب مرحوم ریٹائرڈ کلکٹر اور یونیورسٹی ٹریزرر اور پروفیسر حمیدالدین خاں صاحب مرحوم صدر شعبۂ فارسی یونیورسٹی بھی برہنہ پا رہے۔ ممدوح اپنے ربّ کی بارگاہ میں سراپائے عبدیت ہوکر حاضر تھے۔ مدینہ طیبہ کی مقدس سرزمین پر انہوں نے جو صبح و شام گزارے، اُن کے رفقاء اس کے جو واقعات سناتے تھے اُس سے بارگاہِ نبوی سے اُن کے بے پایاں عظمت واحترام کا اندازہ ہوتا ہے۔'' (۸۵)

سیاسی بصیرت و بصارت

سیّد سلیمان اشرف برِعظیم کے اُن ممتاز علمائے ذی وقار میں سے ہیں جنھیں قدرت نے سیاسی بصیرت وبصارت دونوں سے نوازا تھا۔ اُن کا دل ملتِ بیضا کی فکری بیداری اور

اُس کے روشن مستقبل کیلئے آشنائے درد تھا۔ انہوں نے نازک حالات اور مشکل وقت میں ملت کی مخلصانہ رہنمائی کی ہے۔ آپ کے نزدیک اسلام محض رسوم وعبادات اور عقائد کا ہی نام نہیں بلکہ ایک فعال، سرگرم اور متحرک نظریہ حیات ہے۔ جس میں حریت، آزادی، بے نیازی، زورِ حیدری اور فقرِ بوذر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور جو ہر ظلم و جبر، محکومی اور غلامی کے خلاف سینہ سپر ہوجاتا ہے۔

چنانچہ سیّد صاحب نے برِعظیم میں اٹھنے والی تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، تحریک ہجرت اور ترکِ گاؤکشی جیسی اسلام اور مسلمان دشمن تحاریک کے اثرات و مضمرات سے قوم کو نہ صرف بروقت آگاہ کیا بلکہ اپنی سیاسی بصیرت وآگہی سے مستقبل کا لائحہ عمل بھی متعین فرمایا۔ اِس ضمن میں اپنے کرب و آگہی کی داستان ''البلاغ'' (۱۹۱۱ء)، ''الخطاب'' (۱۹۱۵ء) ''الرشاد'' (۱۹۲۰ء)، ''النور'' (۱۹۲۱ء) اور ''السبیل'' (۱۹۲۴ء)'' کی صورت میں اردو زبان اور اسلامی ادب کے سانچے میں پیش کی۔

سیّد سلیمان اشرف کی کتب میں مندرجہ افکار ونظریات سے اُن کے سیاسی شعور اور فکر وآگہی کی بالغ نظری کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کے یہ سیاسی افکار آج بھی ملک میں پیش آمدہ حالات کے پس منظر میں یقیناً اپنی اہمیت و افادیت رکھتے ہیں اور ہمارے لیے رہنمائی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔ (تفصیلات اگلے ابواب میں ملاحظہ کیجئے)

شاگرد ومعاصرین

سیّد سلیمان اشرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ دارالعلوم معینیہ اجمیر شریف کی مجلس العلماء میں بھی شامل تھے۔ جبکہ مولوی فضل حق رامپوری (۱۸۶۱ء۔۱۹۳۹ء) اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی اِس مجلس العلماء کے رکن تھے۔ (۸۶)

آپ کے مشہور تلامذہ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری (بانی المرکز الاسلامی، کراچی) پروفیسر محمد محمود احمد (سابق صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی) ڈاکٹر ذاکر حسین (سابق صدر بھارت) سید امیر الدین قدوائی (ف ۱۹۷۳ء)، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر سید عابد احمد علی (پنجاب پبلک لائبریری لاہور) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، مولانا ابرار حسین فاروقی

مولانا ابوبکر شیث ،مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی نے خاص طور پر
علمی تصانیف چھوڑی ہیں۔مولانا حقانی کی البیان فی علوم القرآن،
مولانا سلیمان اشرف کی تصانیف میں مسائل حج اور عربی کے فضائل پر
دو رسائل اور عربی فیلالوجی پر ایک کتاب مبین (المبین) ہے۔'' (۹۱) جسے
۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ادبی انعام سے سرفراز کیا۔

واضح رہے کہ ''المبین'' مشہور مستشرق جرجی بن حبیب زیدان (مصری ادیب، مصنف،افسانہ نویس اور ۱۸۹۲ء قاہرہ سے جاری ہونے والے رسالے ''الہلال'' کا مدیر ایک عرب پادری گھر ۱۴، دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوا اور ۲۲، جولائی ۱۹۱۴ء کو قاہرہ مصر میں فوت ہوا) کی کتاب ''فلسفه اللغة العربية'' کا رد ہے۔

بنیادی طور پر ''المبین'' کا موضوع اُن تلبیہات وشکوک کا ازالہ ہے جن کو ''فلسفه اللغة العربية'' کے مصنف جرجی زیدان نے عربی زبان کی اہمیت ووقار کو گزند پہنچانے کیلئے وضع کیا۔لیکن سیّد سلیمان اشرف نے ''المبین'' میں جرجی زیدان کی گرفت کے ساتھ عربی زبان کی فصاحت وبلاغت کے وہ حقائق ومعارف بھی بیان کردیئے کہ بڑے بڑے صاحبان علم دانش بھی آپ کے علم وکمال کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے۔

چنانچہ علامہ اقبالؒ نے آپ کو اپنے مکتوب مورخہ ۷، جنوری ۱۹۳۹ء میں لکھا:

''مخدوم ومکرم قبلہ مولوی صاحب ،السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !المبین نہایت دل چسپ اور معنی خیز کتاب ہے۔اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم اللسان میں بھی عربی نے استقرائی طریق سے کام لیا ہے۔یورپ والوں نے اِس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے مگر سب کا سب لغو اور بیہودہ ہے۔'' (۹۲)

پھر علی گڑھ میں جب علامہ اقبالؒ کی آپ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''مولانا! آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے

جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔'' (۹۳)

''المبین'' کی ورق گردانی سے پوری طرح مترشح ہے کہ آپ کے رگ و پے میں تحقیقی اور تنقیدی مزاج شامل تھا۔آپ تھے تو دینیات کے استاد لیکن عربی زبان و ادب بالخصوص عربی لسانیات کے رموز سے بخوبی واقف تھے جو شخص عربی زبان و ادب کی باریکیوں سے باخبر نہ ہو، وہ کسی بھی موضوع پر قابل استناد کام نہیں کرسکتا۔لہٰذا مذکورہ تصنیف کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو اور عربی ادبیات میں جن تصانیف کو لسانیات کے اعتبار سے اولیت و افضلیت حاصل ہے۔اُن میں ''المبین'' کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔سیّد سلیمان اشرف مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کے اُن مقتدر پروفیسران میں شامل تھے جنہوں نے اپنی تدریس وتحقیق سے علی گڑھ کے علمی وقار میں اضافہ کیا۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اِس معرکۃ الآراء کتاب کے حوالے سے آپ کے علمی کمال کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

''ممدوح نے خصوصاً اہل لغت پر احسان فرمایا ہے کہ اُن کو ایک سخت مہلک مغالطہ سے بچالیا ہے۔المبین میں صرف یہی نہیں ہے کہ جرجی زیدان کی لغزشوں اور غلط کاریوں کی تصحیح وتسدید فرمائی گئی ہے بلکہ عربی زبان کی خصوصیات اِس کاوش اور تحقیق سے قلمبند فرمائی ہیں کہ بے مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسا نیا فن مدون فرمادیا ہے جس کے دھندلے سے متفرق آثار اگلوں کی تصانیف میں نظر آجاتے ہیں...... یہ کتاب اِس قابل ہے کہ علم دوست احباب و اصحاب اِس کے مطالعہ سے لطف وبصیرت حاصل فرمائیں ......اس رسالے کا ترجمہ عربی اور کسی یورپین زبان میں ہوتا تا کہ دوسرے ممالک کے اہل کمال بھی مؤلف علاّم کی محنت وتحقیق کی داد سے سکتے۔'' (۹۴)

سیّد سلیمان اشرف کے شاگرد مولوی عبدالباسط نے آپ کے لیکچرز کا مجموعہ ''مسائل اسلامیہ'' کے نام سے علی گڑھ سے شائع کیا۔جس پر علی گڑھ میگزین نے تبصرہ کرتے

مولانا ابوبکر شیث ،مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی نے خاص طور پر
علمی تصانیف چھوڑی ہیں۔مولانا حقانی کی البیان فی علوم القرآن،
مولانا سلیمان اشرف کی تصانیف میں مسائل حج اور عربی کے فضائل پر
دورسائل اور عربی فیلالوجی پر ایک کتاب مبین (المبین) ہے۔'' (۹۱) جسے
۱۹۲۹ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ادبی انعام سے سرفراز کیا۔

واضح رہے کہ ''المبین ''،مشہور مستشرق جرجی بن حبیب زیدان (مصری ادیب، مصنف،افسانہ نویس اور ۱۸۹۲ء قاہرہ سے جاری ہونے والے رسالے ''الہلال'' کا مدیر ایک عرب پادری گھر ۱۴، دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوا اور ۲۲، جولائی ۱۹۱۴ء کو قاہرہ مصر میں فوت ہوا) کی کتاب ''فلسفه اللغة العربية'' کا رد ہے۔

بنیادی طور پر ''المبین'' کا موضوع اُن تلبیہات وشکوک کا ازالہ ہے جن کو ''فلسفه اللغة العربية'' کے مصنف جرجی زیدان نے عربی زبان کی اہمیت ووقار کو گزند پہنچانے کیلئے وضع کیا۔لیکن سیّد سلیمان اشرف نے ''المبین'' میں جرجی زیدان کی گرفت کے ساتھ عربی زبان کی فصاحت وبلاغت کے وہ حقائق ومعارف بھی بیان کردیئے کہ بڑے بڑے صاحبان علم دانش بھی آپ کے علم وکمال کی تعریف کرنے پر مجبور ہوگئے۔

چنانچہ علامہ اقبالؒ نے آپ کو اپنے مکتوب مورخہ ۷، جنوری ۱۹۳۹ء میں لکھا:

''مخدوم ومکرم قبلہ مولوی صاحب ،السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ !المبین نہایت دل چسپ اور معنی خیز کتاب ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم اللسان میں بھی عربی نے استقرائی طریق سے کام لیا ہے۔یورپ والوں نے اِس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے مگر سب کا سب لغو اور بیہودہ ہے۔'' (۹۲)

پھر علی گڑھ میں جب علامہ اقبالؒ کی آپ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''مولانا! آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے

جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔'' (۹۳)

''المبین'' کی ورق گردانی سے پوری طرح مترشح ہے کہ آپ کے رگ وپے میں تحقیقی اور تنقیدی مزاج شامل تھا۔آپ تھے تو دینیات کے استاد لیکن عربی زبان و ادب بالخصوص عربی لسانیات کے رموز سے بخوبی واقف تھے جو شخص عربی زبان وادب کی باریکیوں سے باخبر نہ ہو، وہ کسی بھی موضوع پر قابل استناد کام نہیں کرسکتا۔لہٰذا مذکورہ تصنیف کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو اور عربی ادبیات میں جن تصانیف کو لسانیات کے اعتبار سے اولیت وافضلیت حاصل ہے۔اُن میں ''المبین'' کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔سیّد سلیمان اشرف مسلم یونی ورسٹی،علی گڑھ کے اُن مقتدر پروفیسران میں شامل تھے جنہوں نے اپنی تدریس وتحقیق سے علی گڑھ کے علمی وقار میں اضافہ کیا۔

نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اِس معرکۃ الآراء کتاب کے حوالے سے آپ کے علمی کمال کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا:

''ممدوح نے خصوصاً اہل لغت پر احسان فرمایا ہے کہ اُن کو ایک سخت مہلک مغالطہ سے بچالیا ہے۔المبین میں صرف یہی نہیں ہے کہ جرجی زیدان کی لغزشوں اور غلط کاریوں کی تصحیح وتسدید فرمائی گئی ہے بلکہ عربی زبان کی خصوصیات اِس کاوش اور تحقیق سے قلمبند فرمائی ہیں کہ بے مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسا نیا فن مدون فرمادیا ہے جس کے دھندلے سے متفرق آثار اگلوں کی تصانیف میں نظر آجاتے ہیں...... یہ کتاب اِس قابل ہے کہ علم دوست احباب واصحاب اِس کے مطالعہ سے لطف وبصیرت حاصل فرمائیں ......اس رسالے کا ترجمہ عربی اور کسی یورپین زبان میں ہوتا تاکہ دوسرے ممالک کے اہل کمال بھی مؤلف علاّم کی محنت وتحقیق کی داد دے سکتے۔'' (۹۴)

سیّد سلیمان اشرف کے شاگرد مولوی عبدالباسط نے آپ کے لیکچرز کا مجموعہ ''مسائل اسلامیہ'' کے نام سے علی گڑھ سے شائع کیا۔جس پر علی گڑھ میگزین نے تبصرہ کرتے

ہوئے لکھا:

''یہ ایک مفید مذہبی مجموعہ ہے جس میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مشہور ریڈر مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب مدظلہ کے اُن مواعظ وارشادات کا خلاصہ جمع کر دیا گیا ہے۔ جن کو مولانا موصوف نے وقتاً فوقتاً بی اے کلاس کے سامنے بیان فرمایا ہے۔ یہ مجموعہ تین ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب'' قدیم بالزمان اور حادث بالذات'' جیسے اہم مسائل سے متعلق ہے۔ دوسرا باب ''تاریخ القرآن'' پر روشنی ڈالتا ہے۔ تیسرا حصہ'' ابوابِ ہدایہ'' کے فقہی مسائل پر مشتمل ہے۔''(۹۵) یہ مجموعہ اِس وقت نایاب ہے اور تا حال دستیاب نہ ہوسکا۔

رحلت و جائے مدفن

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے عسرو یسر ہر حال میں بڑے جاہ وجلال سے زندگی بسر کی۔ یہاں تک کہ وہ دن بھی آپہنچا جب کہ ہر فرد کو ''کل من علیھا فان'' کا جام پینا پڑتا ہے۔ ۲۶، اپریل ۱۹۳۹ء کو برصغیر کے اِس عظیم بطل حریت کا انتقال ہوا۔ مولانا شفیع فرنگی محلی کی اقتدا میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ میں شیروانیوں کے قبرستان میں آپ کی تدفین ہوئی۔ آپ کی قبر مسلم یونیورسٹی کے شرقی غربی گوشہ میں ایک چھوٹی سی چار دیواری میں واقع ہے جس کی لوح مزار اور علی گڑھ میں آپ کی قیام گاہ کے سنگ مرمریں کتبے آج بھی سیّد سلیمان اشرف کے حضور، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی خصوصی عقیدت ومحبت، والہانہ عشق اور کمال علم وفضل کے آئینہ دار ہیں۔ آپ کی قبر پر آویزاں یادگاری کتبے کی عبارت ہے:

''مولانا سیّد سلیمان اشرف بہاری نظامی فخری، میر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی

تاریخ رحلت ۵ ربیع الاوّل ۱۳۵۸ھ روز چہار شنبہ

سلیمان اشرف سر اہل تقویٰ

بہ علم وعمل والہ دین اشرف

چو نفس شنید ایۂ ارجعی را

بہ جنت شد از قربت حق مشرف

سنش از دل پاک حسرت نوشتہ

بہ جنات عدن سلیمان اشرف

از۔ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

المتخلص بہ حسرتؔ

اعترافِ فضل وکمال

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف علم وحکمت، فضل وکمال، زہد وتقویٰ، مال ومنال، تعلیم وتدریس، تحقیق وتنقید اور، تنقیح وتدین عرض کہ ہر جہت سے اعلیٰ واشرف تھے۔ عالم وفاضل، ادیب ونقاد اور محقق و ماہر لسانیات کی حیثیت سے آپ کی عظمت مسلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم عصروں اور بعد کے اربابِ علم وبصیرت نے آپ کے فضل ومحاسن اور کمالات ومناقب کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ جن میں علماء وفضلاء، ادباء ومحققین اور پروفیسر ہر طبقہ فکر کے لوگ شامل ہیں۔ ذیل میں کچھ اربابِ علم ودانش کے تاثرات پیش کیے جارہے ہیں جو آپ کی عبقری شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں، ملاحظہ کیجیے۔

مشہور ادیب سیّد سلیمان ندوی پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کے ہم عصروں میں سے ہیں۔ آپ کی وفات پر ماہنامہ معارف میں لکھتے ہیں:

''چار سلیمانوں کی رباعی قاضی محمد سلیمان مصنف رحمۃ العالمین کی وفات سے مثلث ہوگئی، شاہ سلیمان پھلواری کی رحلت سے فرد بن گئی، اب اخیر اپریل ۱۹۳۹ء میں مولانا سلیمان اشرف صاحب (استاذ شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی) کی موت سے مصرعہ ہوکر رہ گئی۔ یہ مصرعہ بھی دنیا کی زبان پر کب تک رہتا ہے۔

بہت آگے گئے باقی ہیں جو تیار بیٹھے ہیں

مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور

بے تکلف تھے۔اُن کی سب سے بری خوبی اُن کی خودداری اور اپنی عزت نفس کا احساس تھا...... اُنہوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی اور نہ ہی کسی سے دب کر یا جھک پر ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر ،علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی اُنہیں اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔'' (۹۶)

عبدالماجد دریا آبادی سیّد سلیمان اشرف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اہل بہار کا ایک مرکز علی گڑھ بھی ہے۔مولانا سیّد سلیمان اشرف مرحوم کی زبردست شخصیت ،بعض نادر خصوصیات کی مالک تھی۔'' (۹۷)

پروفیسر ابوبکر شیث جونپوری جن کے پروفیسر سیّد سلیمان اشرف سے گہرے مراسم تھے،نے اپنے دوست اور ہم عصر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ایک تاریخی جملہ کہا:

''ہمارے درمیان سے سردار اُٹھ گیا۔'' (۹۸)

نواب مشتاق احمد خان وزیر مالیات حیدرآباد دکن کے مطابق:

''مولانا سیّد سلیمان اشرف اپنے خیالات کا اظہار کھلم کھلا اور لگی لپٹی کے بغیر کردیتے تھے۔رو میں بہہ جانے والوں نے خاص طور سے بعض علمائے کرام نے انہیں بہت کچھ برا بھلا کہا اور اخباروں میں اور رسالوں میں اُن کے خلاف لعن طعن ہوتی رہی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔'' (۹۹)

رشید احمد صدیقی اردو ادب کا بہت بڑا نام ہے۔ اُن کا شمار پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کے عزیز ترین شاگردوں میں ہوتا ہے۔آپ کی وفات پر لکھتے ہیں:

''مولانا سیّد سلیمان اشرف اِس جہاں سے اُٹھ گئے اور اپنے ساتھ وہ تمام باتیں لے گئے جو میرے لیے اب کسی اور میں نہیں...... مرحوم کی شخصیت اتنی جامع اور متنوع تھی کہ وہ ہر موضوع اور موقع سے اِس خوبی سے عہدہ برآ ہوتے کہ اُن کی صحبت میں جی لگتا اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوا

کہ فلاں کمی ہے جسے پورا کرنے کیلئے کسی اور کو ڈھونڈنا چاہیے۔'' (۱۰۰)

پروفیسر سیّد امیرالدین قدوائی کا شمار سیّد صاحب کے شاگردوں میں ہوتا ہے۔آپ لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا پروفیسر سیّد سلیمان اشرف صاحب قبلہ بڑے جید عالم اور مرتاض درویش تھے۔فیض کا دریا تھے۔جس نے حسبِ ظرف جو کچھ اُن سے حاصل کرلیا، اس کی برکت اسی نے نہیں بلکہ ساری دنیا نے بھی دیکھی اور اُن سے نفع پایا۔'' (۱۰۱)

پروفیسر محمد زبیر مارہروی کہتے ہیں:

''مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یہ امتیازی خصوصیات دیکھئے کہ...... یہاں کے عملے میں ہندوستان اور بیرون ہند کے دینی و دنیوی علوم کے ممتاز ماہرین شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اِن میں مولانا سیّد سلیمان اشرف جیسی انوکھی شخصیت کسی کی نہ تھی۔انہوں نے انفرادیت کا جو درجہ حاصل کرلیا تھا اُس نے اُن کے حساس مزاج کی راہیں سب سے الگ تھلگ کردی تھیں۔مولانا اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔لیکن اُن کے تبحرِ علمی پر جلال و جمال کے اتنے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔جنھیں موصوف کے مزاج کا شناسا ہی چھوسکتا تھا۔'' (۱۰۲)

علامہ شبیر احمد غوری کہتے ہیں:

''حضرت مولانا سیّد سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی مرجع اکابر واعیان تھی......زمانے کے بدلتے ہوئے حالات نے اِس عبقری روزگار کی غیر معمولی صلاحیتوں کی بالکل قدر نہ کی اور اس عبقری شخص کو جو محاکمات قدیمہ و جدیدہ کا درس دے کر علم وحکمت کے گوہر آبدار پروسکتا تھا بلکہ محق دوّانی اور میر صدرالدین شیرازی کے حواشی کے درمیان محاکمہ کرسکتا تھا صرف ہدایہ کے چند ابواب یا بخاری کی تدریس

میں منحصر کر دیا گیا۔ پھر بھی مولانا کا بحرِ زخار اس قید میں مقید رہنے پر خود کو راضی نہیں کر سکتا تھا۔'' (۱۰۳)

ڈاکٹر عبدالباری ندوی کے مطابق:

''علمائے ہند کے وصف میں مولانا کی نابغہ روزگار شخصیت ہمیں اور بھی قد آور نظر آتی ہے جب ہم ملت بیضا کے تئیں سیاسی اور اُمورِ تمدن میں اُن کی بصیرتوں سے بھی قدرے قربت کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ اُن کی تحریریں، اُن کے بلند سیاسی افکار اسلامی ثقافت و تمدن کی باریک بینیوں اور قومی و ملّی درد کے تب و تاب کا پرتو نظر آتی ہیں۔'' (۱۰۴)

سیّد بدرالدین احمد لکھتے ہیں:

مولانا سیّد سلیمان اشرف برسوں ہندوستان کے علم و کمال کے افق پر آفتاب بن کر چمکتے رہے۔ کتنے نئے پودوں نے اُن کے جگر کی حرارت سے قوتِ نمو پائی اور کتنی بے نور آنکھوں میں اُن کی روشنی سے بینائی آئی۔ مولانا سیّد سلیمان اشرف کی نجی زندگی کے حالات، اُن کے علمی مشاغل، اُن کی خطابت، اُن کی صوفی منشی، اُن کے گھر کی شگفتہ مجلسیں، اُن کے گرد مشاہیر کا مرجوعہ، علمائے ہند میں اُن کا مرتبہ، اُن کا کردار، اُن کا وقار، اپنے لوگوں کے ساتھ اُن کی بے لوث محبت، غیروں کے ساتھ بھی اُن کی شفقت و مروت، اُن کی حق بینی اور صداقت پسندی، اِن سب خصوصیات کا بیان ایک دفتر چاہتا ہے۔ حقیقت میں اِنھی خصوصیات نے مولانا کو اُن کے ہم عصروں میں اونچا کر رکھا تھا۔ ہم اور آپ بھول جائیں تو بھول جائیں، مگر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے در و دیوار اور چپہ چپہ پر اُن کی داستان عظمت ہمیشہ ثبت رہے گی۔'' (۱۰۵)

ممتاز ادیب اور تذکرہ نگار طالب ہاشمی (۱۹۲۹ء۔۲۰۰۸) رقمطراز ہیں:

حضرت مولانا سیّد سلیمان اشرف کا شمار اپنے دور کے سرآمدِ روزگار علماء

میں ہوتا تھا۔ وہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں شعبۂ اسلامیات کے صدر تھے اور قریب قریب ساری عمر اُنہوں نے علی گڑھ ہی میں گزار دی۔ اُن کا وجود علی گڑھ یونی ورسٹی کے لیے آیۂ رحمت کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ علم و فضل کا بحرِ زخار اور ظاہری و باطنی خوبیوں کا پیکرِ جمیل تھے۔ ہزاروں تشنگانِ علم اُن کے فیضانِ علمی سے بہرہ یاب ہوئے اور پھر اپنے اپنے دوائر میں اُن کے نام کو روشن کیا۔'' (۱۰۶)

پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کہتے ہیں:

''پروفیسر سیّد سلیمان اشرف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اُن مقتدر پروفیسران میں شامل تھے جنھوں نے اپنی تدریس و تحقیق سے علی گڑھ کے وقار میں اضافہ کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں بے شمار ایسے اساتذہ رہے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے مخصوص علمی میدانوں میں قابل ذکر فتوحات حاصل کیں، اِن اساتذہ کرام میں سلیمان اشرف صاحب کا نام سرخیل کے مانند ہے۔ جب جب نامورانِ علی گڑھ کی چنیدہ شخصیات کے احوال و آثار بیان کیے جائیں گے تو اُن میں سیّد سلیمان اشرف صاحب کو فراموش کر دینا ممکن نہ ہوگا۔'' (۱۰۷)

ناظر کاکوروی نے ''جائزہ، تذکرۃ الشعراء و مصنفین'' میں پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کو خوبصورت الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

''جس قدر قدرت نے اُن کو حسین و جمیل بنایا تھا اُس سے زیادہ اُن کا قلب منور تھا۔ اُن کی دانشورانہ نگاہ نے سیکڑوں عامی افراد کو اہل بنا دیا۔'' (۱۰۸)

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

(۱) صوبہ بہار علمی ادبی تہذیبی اور ثقافتی میدان میں اپنی ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں اسلام کی ترویج واشاعت میں علمائے کرام اور صوفیائے عظام کا بہت بڑا کردار ہے، اس اِس حوالے سے حضرت مخدوم چرم پوش تیغ برہنہ، حضرت مخدوم شیخ حسین نوشہ توحید، حضرت ابراہیم، حضرت پیر بدر عالم، حضرت شاہ عطا اللہ بغدادی اور بالخصوص حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جنھوں نے طویل عرصہ اِس سرزمین پر رشدوہدایت کے چراغ روشن رکھے اور پردہ فرمانے کے سات سو سال بعد بھی آپ کا آستانہ خلق خدا کو اپنی روحانیت سے فیضیاب کررہا ہے۔ چنانچہ اِسی نسبت سے صوبہ بہار کو ''بہار شریف'' بھی کہا جاتا ہے اور اہل محبت وعقیدت اپنے نام کے ساتھ ''بہاری'' لگا کر اِسی نسبت وتعلق کا اظہار کرتے ہیں۔

(۲) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص: ۶۱

(۳) ایضا ص: ۷۳

(۴) عبدالباری ندوی، ڈاکٹر، مضمون ''مولانا سلیمان اشرف'' نامورانِ علی گڑھ، تیسرا کارواں جلد دوم، مارچ ۱۹۹۱ء، ص: ۴۷-۴۸

(۵) محمود احمد قادری، مولانا، تذکرہ علمائے اہلسنّت، ۱۳۹۱ھ، کانپور، ص: ۱۰۰

(۶) سلیمان ندوی، سیّد، یادرفتگاں، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۸۹

(۷) غلام رسول سعیدی، مولانا، حیات استاذ العلماء مولانا یار محمد بندیالوی، دارالاسلام لاہور، ص: ۱۷

(۸) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص: ۶۷-۶۸

(۹) ایضاً ص: ۶۸

(۱۰) رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنج ہائے گرانمایہ، کتابی دنیا دہلی، جنوری ۱۹۴۷ء، ص: ۲۱-۲۲

(۱۱) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص: ۶۸

(۱۲) سلیمان ندوی، سیّد، یاد رفتگاں، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۸۹۔ سیّد سلیمان ندوی، معارف اعظم گڑھ، ص ۴۰۲، جون ۱۹۳۹ء شذرات

(۱۳) سید عابد احمد علی، ڈاکٹر، مقالات یوم رضا حصہ سوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۱ء ص: ۱۰-۹

(۱۴) شبیر احمد غوری، مضمون، مولانا سیّد سلیمان اشرف، سہ ماہی مجلّہ اقبال (ادبیات اردو نمبر) بزم اقبال لاہور جلد ۳۹، شمارہ ۳-۲، اپریل تا جون ۱۹۹۲ء ص: ۸۷ تا ۱۰۲

(۱۵) بدرالدین احمد، سید، حقیقت بھی کہانی بھی (عظیم آباد کی تہذیبی داستان) بہار اردو اکیڈمی پٹنہ، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۰-۳۳۱

(۱۶) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص: ۶۸

(۱۷) غلام غوث، حافظ، مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے تعلقات۔ سہ ماہی العلم کراچی اپریل تا جون ۱۹۷۴ء جلد ۲۳، شمارہ ۲، ص: ۸۱-۸۲

(۱۸) ایضاً ص: ۸۲

(۱۹) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص: ۶۸-۶۹

(۲۰) غلام غوث، حافظ، مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے تعلقات۔ سہ ماہی العلم کراچی اپریل تا جون ۱۹۷۴ء جلد ۲۳، شمارہ ۲، ص: ۸۳

(۲۱) حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مضمون ''تکبیر وتہلیل'' مقالات شیروانی، ۱۹۴۶ء، علی گڑھ، ص: ۱۸۰

(۲۲) مقتدیٰ خاں شروانی، پندرہ روزہ قومی زبان کراچی، بابائے اردو نمبر، اگست ۱۹۶۳ء جلد ۲۴، شمارہ ۴-۳، ص: ۱۱

(۲۳) سلیمان ندوی، سیّد، یادرفتگاں، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی، ۲۰۰۳ء، ص: ۱۹۰

(۲۴) رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنج ہائے گرانمایہ، کتابی دنیا دہلی، جنوری ۱۹۴۷ء، ص: ۲۰

(۲۵) ایضاً ص: ۲۱-۲۲

(۲۶) بدرالدین علوی، مولانا، مضمون ''نفثۃ المصدور'' معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۵۰ء، نمبر ۵، جلد ۶۶، ص: ۴۲۵

(۲۷) ایضاً ص:۴۲۹

(۲۸) ایضاً ص:۴۳۰

(۲۹) سلیمان ندوی، سیّد، مضمون ''آہ مولانا شروانی'' معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۵۰ء، نمبر۵، جلد۶۶، ص:۴۰۴

(۳۰) سیّدسلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص:۶۹۔۷۰

(۳۱) عبدالرقیب حقانی، مولانا، ارض بہار اور مسلمان، علمی اکیڈمی فاونڈیشن، کراچی طبع اوّل، ۲۰۰۴، ص:۴۲۳

(۳۲) شبیراحمد غوری، مضمون، مولانا سیّد سلیمان اشرف، سہ ماہی مجلّہ اقبال (ادبیات اردو نمبر) بزم اقبال لاہور جلد ۳۹، شمارہ ۳۔۲، اپریل تا جون ۱۹۹۲ء ص:۸۷ تا ۱۰۲

(۳۳) ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء، ص:۱۸

(۳۴) سلیمان ندوی، سیّد، شذرات، معارف اعظم گڑھ، جلد ۱۷، شمارہ ۲، فروری ۱۹۲۶ء ص:۸۲

(۳۵) امین زبیری، محمد، مسلم یونیورسٹی میں اسلام وغیرہ کے متعلق غلط بیانی، پبلیشر مفید عام آگرہ ۱۹۳۲ء، ص:۴

(۳۶) ایضاً ص:۹

(۳۷) ایضاً ص:۴۔۵

(۳۸) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، السبیل، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴ء، طبع جدید ادارہ پاکستان سناسی لاہور ۲۰۱۴ء، ص:۲۶

(۳۹) ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر، مضمون، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، سہ ماہی فکرونظر، علی گڑھ خصوصی نمبر ۱۹۸۶ء، ص:۷۴۔۷۵

(۴۰) معین الدین عقیل، ڈاکٹر، ''السبیل ایک علمی اور تعلیمی دستاویز'' مشمولہ السبیل، طبع جدید ۲۰۱۴ء، ادارہ پاکستان شناسی، ملتان روڈ لاہور، ص:۵۸

(۴۱) ایضاً ص:۵۹

(۴۲) یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ علی گڑھ کالج (۱۹۲۰ء میں یونیورسٹی میں تبدیل ہوا) اور اسلامیہ کالج پشاور و لاہور مولوی محمود حسن دیوبندی اور اُن کے ہم خیال علماء کی نظر میں شروع ہی سے بری طرح کھٹکتا تھا اُن کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح ان تعلیمی اداروں کو ڈھادیا

جائے۔ آخر تحریکِ ترکِ موالات کے دوران جب انہیں یہ موقع میسر آیا تو انہوں نے اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار فتویٰ دیتے ہوئے یوں کیا ''علی گڑھ کالج کی ابتدائی حالت میں علما متدینین نے علی العموم اِس قسم کی تعلیم (جو ازسرتا پا گورنمنٹ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو) روکا مگر بدقسمتی کہ وہ رک نہ سکی۔ اب جب کہ اِس کے ثمرات ونتائج آنکھوں سے دیکھ لیے تو قوم کو اُس سے بچانا باالبداہتہ ایک ضروری امر ہے۔ طلبہ کے والدین دیکھ بھال کر اور سمجھانے پر بھی اُسی تعلیم پر زور دیں اور مذہبی تعلیم سے مانع ہوں تو طلبہ کو ضروری ہے کہ لوجہ اللہ تعلیم مذہبی اور اسلام کی خدمت گزاری کیلئے سعیٔ کریں (بحوالہ ترک موالات پر علمائے کرام دیوبند، سہارنپور، دہلی وبدایوں وغیرہ کے فتاوے، مطبوعہ میرٹھ ۱۹۲۰ء ص:۴، اور ''تحریکات ملی، تحریکات کے آئینے میں مسلمانان پاک وہند کی سیاسی جدوجہد کی سرگزشت'' مجلّہ علم و آگہی، خصوصی شمارہ ۸۳۔۱۹۸۲ء، کراچی گورنمنٹ نیشنل کالج، ص:۴۳۶)

مولانا محمود حسن کے فتویٰ کے حوالے سے پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی خطبات عثمانی مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء صفحہ ۳۸ پر اعتراف کرتے ہیں کہ ''طلبہ میں حضرت شیخ الہند کے فتوی سے بہت جوش پیدا ہوا۔'' جبکہ مولوی حسین احمد مدنی نقش حیات جلد دوم مطبوعہ بیت التوحید کراچی کے صفحہ ۶۷۳ پر اپنے شیخ الہند کی کانگریس نوازی کو تسلیم کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ ''حضرت شیخ الہند سے ترک موالات کے متعلق طلبا یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کرلیا جس میں حضرت نے ترک موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام طلبا یونیورسٹی کو زور دار مشورہ دیا تھا کہ وہ اِس پر عمل کریں۔''

(۴۳) سہ ماہی فکرونظر، علی گڑھ خصوصی نمبر ۱۹۸۶ء، جلد ۲۳، ناموران علی گڑھ، دوسرا کارواں ص: ۱۵۳۔۱۵۴، مشمولہ مضمون ''ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد'' از، عشرت علی قریشی

(۴۴) اِس تحریک کے جذباتی اور ہنگامی دور میں جمعیت علمائے ہند کے راہنما اور بعض دوسرے لیڈر تحریک ترک موالات کو کامیاب بنانے کیلئے اسلامیہ کالج علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور بند کرانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُس زمانے میں یہ فتوے بھی جاری ہوئے کہ مسلمان اپنے بچوں کو اسلامیہ کالجوں وغیرہ میں پڑھانا چھوڑ دیں۔ ابوالکلام آزاد نے کہا ''احکام شرعیہ کی رُو سے کسی مسلمان طالب علم کیلئے جائز نہیں کہ وہ کسی سرکاری یا ایسے کالج میں تعلیم حاصل کرے جو سرکار سے امداد قبول کرتا ہو اور سرکاری یونیورسٹی سے ملحق ہو۔'' مفتی کفایت اللہ دہلوی کا کہنا تھا کہ ''تمام مسلمان عاقل وبالغ طلبہ پر خواہ وہ قومی مدرسوں کے طالب علم ہوں یا سرکاری

مدرسوں کے، فرض ہے کہ وہ ایسے مدرسوں سے جن کا تعلق گورنمنٹ کے ساتھ ہے علیحدہ ہوجائیں اور اِس علیحدگی میں اُن کو اپنے والدین کی اجازت لینی ضروری نہیں بلکہ والدین کی ممانیت پر عمل کرنا جائز نہیں۔'' مولوی احمد سعید ناظم جمیۃ علمائے ہند نے فتویٰ دیا کہ ''تعلیم کو موالات سے مستثنیٰ کرنا سخت ترین حماقت ہے، کیونکہ سب سے بڑی معاونت دشمنان دین کی ملازمت ہے اور ملازمت سرکار کا اصلی سبب سکولوں اور کالجوں کی تعلیم اور یونیورسٹی کی ڈگریاں ہیں...... مسلمان سرکاری ملازمت سے جب ہی محفوظ رہ سکتے ہیں کہ اُن کو اِس تعلیم سے بچایا جائے کہ جس کی وجہ سے ملازمت کرنے کے قابل ہوں...... میری رائے میں مسلمانوں پر ترک موالات فرض ہے اور اُن کو اِس فریضہ پر عمل کرنے کیلئے سرکاری ملازمت سے علیحدہ ہونا قطعاً فرض ہے۔'' یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ لوگ مسلمانوں کے ہی تعلیمی اداروں کو کیوں بند کرانا چاہتے اور صرف مسلمانوں کے نظم تعلیم کو تہہ وبالا کرنے اور سلسلہ تعلیم ملیا میٹ کروانے میں کیا راز پوشیدہ تھا۔ اس سوال کا جواب مشتاق حسین فاروقی دیتے ہوئے لکھتے ہیں ''ہندو لیڈران کو یہ بات نہ بھاتی تھی کہ اکا دکا مسلمان بھی کسی سرکاری عہدہ پر نظر آئے۔ مگر کچھ بس نہیں چلتا تھا کہ جس یونیورسٹی کی بدولت مسلمان تعلیم پا کر کچھ اسامیاں پُر کر لیتے تھے اُس کو بند کرا سکیں۔ تحریک ہذا میں اُن کو یہ موقع مل گیا اور انہوں نے انگریزی تعلیم کے بائیکاٹ پر زور دیا۔ اسکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کو تعلیم پانے سے روکنے کی تجویز منظور کی۔ لیکن اِس میں کیا راز مضمر تھا، صرف یہی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو توڑ دیا جائے تا کہ ہندوستان میں کوئی واحد مسلم درس گاہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور باوجودے کہ تعلیمی بائیکاٹ کا حکم عام تھا، ہندو یونیورسٹی پر آنچ نہ آنے دی۔'' (مسلمان اور کانگریس اتحاد مسلم و مشرک پر شریعت کا حکم مبین، مشتاق حسین فاروقی مطبوعہ مرادآباد، ص:۳)
واضح رہے کہ سید محمد سلیمان اشرف صاحب کی کتاب النور اُسی زمانے کی یادگار ہے، جس نے صحیح سمت میں مسلمانوں کی رہنمائی کا کام انجام دیا۔

(۴۵) عبدالماجد دریا آبادی، مضمون، صدر یار جنگ ذاتی تاثرات، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۵۰ء، جلد ۶، شمارہ ۶۶، ص:۴۸۱

(۴۶) نور محمد قادری، سیّد ''علامہ سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری''المبین ، ناشر، دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۰۸ء ص:۲۱

(۴۷) مشتاق احمد خاں، نواب، ایک عالم دین اور قابل احترام استاد مولانا سیّد سلیمان اشرف،

ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، جون ۱۹۷۷ء، ص:۹۲-۹۳

(۴۸) رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنج ہائے گرانمایہ، کتابی دنیا لمیٹڈ دہلی، جنوری ۱۹۴۷ء، ص: ۲۳-۲۴

(۴۹) ایضاً ص:۲۵-۲۳

(۵۰) سید عابد احمد علی، ڈاکٹر، مقالات یوم رضا حصہ سوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۱ء ص:۴-۵

(۵۱) ایضاً ص:۶

(۵۲) ابرار حسین فاروقی، مولانا، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۷۵ء، جلد ۱۱۵، ص:۱۳۰

(۵۳) غلام غوث، حافظ، مضمون ''مولانا سیّد سلیمان اشرف اور نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے تعلقات'' سہ ماہی العلم کراچی، جلد ۲۳، شمارہ ۲، اپریل تا جون ۱۹۷ء۔ص ۸۴

(۵۴) مضمون، نواب مشتاق احمد خان، ضیائے حرم لاہور، جون ۱۹۷۷ء، ص:۹۳

(۵۵) سلیمان ندوی، سیّد، شذرات، معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۳۹ء، ص:۴۰۲، یاد رفتگاں، سیّد سلیمان ندوی، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی ۲۰۰۲ء، ص:۱۹۰

(۵۶) رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنج ہائے گرانمایہ، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی، جنوری ۱۹۴۷ء، ص:۲۶ اور ص:۵۵

(۵۷) بدرالدین احمد، سیّد، حقیقت بھی کہانی بھی (عظیم آباد کی تہذیبی داستان)، بہار اردو اکیڈمی پٹنہ ۲۰۰۳ء، ص:۳۳۱

(۵۸) عبدالباری ندوی، ڈاکٹر، مضمون ''مولانا سیّد سلیمان اشرف'' نامورانِ علی گڑھ، تیسرا کارواں جلد دوم'' سہ ماہی فکر و نظر خصوصی شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء، ص:۴۸

(۵۹) محمود احمد قادری، تذکرہ علمائے اہلسنّت، کانپور ۱۳۹۱ھ، ص:۱۰۱

(۶۰) تنزیل الصدیقی الحسینی، مضمون ''سخن ہائے گفتنی'' مشمولہ، الخطاب، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، طبع جدید اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص:۵۷

(۶۱) ابرار حسین فاروقی گوپامئوی، مولانا، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۷۵ء، جلد ۱۱۵، ص:۱۲۵

(۶۲) رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنج ہائے گرانمایہ، کتابی دنیا لمیٹڈ، دہلی، جنوری ۱۹۴۷ء، ص:۲۷

(۶۳) بدرالدین احمد، سیّد، عظیم آباد کی تہذیبی داستان، بہار اردو اکیڈمی پٹنہ ۲۰۰۳ء، ص:۳۳۲

(۶۴) ابرار حسین فاروقی گوپامئوی، مولانا، ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۷۵ء، جلد ۱۱۵،

(۹۷) ماہنامہ ندیم گیا، بہار نمبر ۱۹۴۰ء، ص:۳۳، مشمولہ علامہ سیّد سلیمان اشرف بہاری اہل علم کی نظر میں، محمد طفیل مصباحی، ص:۱۶

(۹۸) طفیل مصباحی، محمد، علامہ سیّد سلیمان اشرف بہاری اہل علم کی نظر میں، ص:۱۸

(۹۹) ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، جون ۱۹۷۷ء، ص:۹۲

(۱۰۰) رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنج ہائے گرانمایہ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، ۴۵۔۱۹

(۱۰۱) ماہنامہ تاج کراچی، محمود نمبر، جلد ۱۲، ص:۱۱۲

(۱۰۲) ماہنامہ معارف رضا، کراچی، ۱۹۹۲ء، مشمولہ علامہ سیّد سلیمان اشرف بہاری اہل علم کی نظر میں، محمد طفیل مصباحی، ص:۱۵

(۱۰۳) ماہنامہ معارف رضا، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص:۲۳۵۔۲۱۵، مشمولہ علامہ سیّد سلیمان اشرف بہاری اہل علم کی نظر میں، محمد طفیل مصباحی، ص:۱۵۔۱۶

(۱۰۴) سہ ماہی فکرونظر علی گڑھ مارچ ۱۹۹۱ء، ص:۵۴ خصوصی شمارہ ناموران علی گڑھ تیسرا کارواں جلد دوم

(۱۰۵) بدرالدین احمد، سید، عظیم آباد کی تہذیبی داستان، پٹنہ، ۲۰۰۳ء، ص:۳۲۸۔۳۳۱

(۱۰۶) ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء، ص:۸۱

(۱۰۷) سید سلیمان اشرف، احوال وآثار، اشرفیہ فاونڈیشن حیدرآباد دکن، ۲۰۱۷ء ص:۲۳

(۱۰۸) ناظر کاکوروی، تجزیہ، تذکرۃ الشعرا و مصنفین (صد سالہ ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء کا شعوری و تنقیدی تجزیہ) اداہ انیس ادب اردو، الہ آباد، سن ندارد، ص:۳۲ (نوٹ ناظر کاکوروی کے پیش لفظ پر ۸، مئی ۱۹۶۰ء کی تاریخ درج ہے)

باب دوم

دوقومی نظریہ کا آغاز وارتقاء

دوقومی نظریہ کا آغاز وارتقاء
(محدث دہلوی سے محدث بریلوی تک)

۸، مارچ ۱۹۴۴ء کو قائد اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء) نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''پاکستان اُسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا، یہ اُس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا، وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔''(۱)

قائداعظم محمد علی جناح کا یہ قول جہاں برعظیم میں ملتِ اسلامیہ کی مبداء واساس کی جانب بلیغ اشارہ کرتا ہے۔ وہاں اسلام کی آمد اور ترویج واشاعت کے ساتھ نسلی، لسانی اور مذہبی اختلافات میں منقسم اِس خطے میں دوقومی نظریے کا آغاز وارتقاء کی جانب بھی واضح اشارا کرتا ہے۔ اِس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسان جیسے ہی اللہ کی حاکمیت اور رسالتِ محمدی ﷺ کا اقرار کرتا ہے، وہ نسل انسانی کی تمام نسلی، جغرافیائی، ثقافتی اور لسانی عصبیتوں سے علیحدہ ہو کر ایک نئی قوم ''مسلمان'' بن جاتا ہے۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو ہمیشہ ایک ملت کی تخلیق میں کوشاں رہتا ہے۔ یہ رنگ ونسل اور لسانی وجغرافیائی اختلافات کو مٹا کر ایک نئی وحدت ''مسلم اُمت'' تشکیل دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کی آمد نے برعظیم میں عدل ومساوات پر مبنی ایک نئے مسلم معاشرے کا منظر نامہ پیش کیا۔ اسلام کی ہمہ گیریت اور جامعیت نے خطے کے مذہبی تہذیبی اور معاشرتی تصورات

پر گہرے اثرات مرتب کیے۔اسلام نے مقامی باشندوں کو اپنے حسنِ سلوک سے نہ صرف متاثر کیا بلکہ انہیں زندگی گزارنے کے بہترین اُصولوں سے بھی آشنا کیا۔

اسلامی تعلیمات نے محمد بن قاسم (۷۱۲ء/۹۲ھ) سے لے کر تیمور اور آل تیمور (۱۸۵۷ء) تک ہندوستانی سماج پر نہ صرف تمدن کی سطح پر گہرے اثرات مرتب کیے بلکہ ذات پات کے نظام کو بھی کاری ضرب لگائی۔اسلام چونکہ ذات پات ،رنگ ونسل اور زبان و علاقے کی تفریق و امتیاز نہیں کرتا اِس لیے مردم گزیدہ مخلوق اِس کے دامن میں پناہ لینے لگی۔مقامی باشندے اسلامی نظریہ حیات سے متاثر ہوئے اور جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔اُدھر مسلمان صوفیا نے بھی اِس سارے عمل میں اپنے کردار اور حسنِ سلوک سے مرکزی کردار ادا کیا۔

اسلام کی تحریک نے صدیوں سے ٹھکرائی ہوئی انسانیت کو ایک حیات آفریں انقلاب سے روشناس کرایا۔اسلام کی وجہ سے مقامی آبادی میں فکری شعور اور مقصدیت جنم لینے لگی۔جس کی وجہ سے قدامت پسندی رخصت ہونے لگی اور ایک جدید ہندوستان کی نوعیت ابھرنا شروع ہوئی۔اُدھر مسلم حکمرانوں نے ایک ایسا نظامِ حکومت متعارف کروایا جس سے مقامی باشندوں کو راجاؤں کے ظلم وستم اور بالائی ہندو طبقے کی مذہبی وروحانی اجارہ داری سے نجات مل گئی۔

گو نئے حکمرانوں نے بڑی حد تک پرانے انتظامی ڈھانچے کو برقرار رکھا اور اُس میں دُوررس سیاسی ،سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں نہیں کیں مگر اِس کے باوجود اُس جبر واستبداد کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا جو پرانے حکمرانوں کا خاصہ تھا۔ان مسلم حکمرانوں نے مقامی باشندوں کو شریکِ اقتدار کیا۔دربار میں اعلیٰ عہدے تفویض کیے۔اُن کے عقائد ونظریات اور سماجی و معاشرتی روایات کا تحفظ کیا اور انہیں مذہبی آزادی عطا کی۔اِس نئی طرزِ حکمرانی سے مقامی باشندوں کی بودوباش سے لے کر اقتدار تک متاثر ہوئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی میل جول کسی حد تک ایک اکائی میں ڈھل گیا۔

یہ اکائی ''ہندوستان'' قرار پائی۔گو مسلم آئیڈیالوجی یا اسلامی نظریہ حیات کی وسعت

نے بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔مگر مسلمانوں نے اپنی خصوصیت اور انفرادیت برقرار رکھی اور مقامی آبادی میں ضم ہونے سے ہمیشہ گریز کیا۔ جہاں بھی مسلمانوں کی آبادی تھیں وہاں اُن کا رجحان اپنی ملت کی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی طرف تھا۔انہوں نے اپنی ایک مستقل ہستی بنائی اور جداگانہ ثقافت اور معین اغراض و مقاصد کی تشکیل کی۔(۲)

شہنشاہ نصیر الدین محمد ہمایوں (۱۵۰۸ء۔۱۵۵۶ء) تک مسلم حکمرانوں نے اسی جذبہ مروّت اور رواداری کا مظاہرہ کیا۔مگر مسلم اقتدار کو ہندو سرداروں کے ایک طبقے نے قبول نہیں کیا اور نہ ہی وہ یہ فراموش کر پائے کہ مسلمانوں نے انہیں سیاسی اقتدار سے محروم کیا ہے۔چنانچہ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ مسلم حکمرانوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیتے۔ابتدا میں مسلم حکمرانوں نے اِن بغاوتوں کا سختی سے خاتمہ کیا۔لیکن جلال الدین محمد اکبر (۱۵۴۲ء۔۱۶۰۵ء) کے عہد میں انہیں اہم حکومتی معاملات میں مسلمانوں کے برابر دربار میں مناصب دیئے گئے۔

اکبر کے دورِ حکومت میں ہندوؤں کے اثرورسوخ میں بڑا اضافہ ہوا۔اُس کے مشیرانِ خاص بھگوان داس اور مان سنگھ کی اُمورِ سلطنت میں براہ راست مداخلت اور مملکت کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کا نتیجہ مسلمانوں کے ضعف کی شکل میں ظاہر ہوا۔ہندوؤں نے باقاعدہ سوچی سمجھی سازش کے تحت حرم اور دربار میں اکبر کا قرب حاصل کیا اور اُس کے مذہبی اور عمرانی نظریات پر اثر انداز ہونے لگے اور اُس کو آلہ کار بنا کر متحدہ ہندوستانی قومیت ،ہندو احیائیت اور مسلمانوں کے ملیّ تشخص کے خاتمہ کی جدوجہد شروع کر دی۔

جس نے برعظیم پاک و ہند میں مسلم اقتدار کی دیواروں کو متزلزل کر دیا۔اکبر کی پالیسیوں نے اسلام مخالف عناصر کو دین میں انحراف کا موقع دیا۔اِس کے ساتھ ہی بھگتی تحریک (۳) کو تقویت حاصل ہوئی۔جس کے ذریعے ہندوستان میں موجود دو بڑے مذاہب کے درمیان امتیاز ختم کرنے کی کوشش کی گئی اور اسلام اور ہندومت کو ایک درخت کی دو شاخوں سے تشبیہ دی گئی ،جن کی جڑ ایک ہے۔

برعظیم میں اسلام اور مسلم قومیت کو جن دو تحریکوں نے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے وہ ''بھگتی تحریک'' اور ''دین الٰہی'' کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ دونوں تحریکیں وجودی فلسفہ اور افکار سے متاثر تھیں۔ اوّل الذکر نے انسان دوستی اور مذہبی رواداری کے لبادے میں تمام تر تقویت ہندو مذہب کو پہنچائی جس سے ہندوؤں کے قبولِ اسلام کی رفتار میں کمی واقع ہوئی اور ہندو مسلم ترکیبی ثقافت کو فروغ دے کر مسلم تشخص کو نقصان پہنچایا۔ جبکہ ثانی الذکر نے متحدہ ہندوستانی قومیت کے پس پردہ ہندو دھرم کے احیا کیلئے فضا ہموار کی اور مسلم قومیت کو ختم کرنے کی سازش کی۔ (۴) اِس صورتحال سے ہندوؤں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

اکبر نے اپنی وسیع و بے کراں سلطنت کو قابو رکھنے کیلئے جو حکمت عملی اختیار کی۔ اُس کے نتیجہ میں مخالف عناصر نے اندورنی سازشوں کے ذریعے اسلام کو نقصان پہنچایا، جو کامیابی میدان جنگ میں حاصل نہ کی جا سکی اُسے اِن عناصر نے ایوانِ حکومت میں داخل ہو کر حاصل کیا اور اپنے مقاصد کو کماحقہ پورا کیا۔ شہنشاہ اکبر ابتدائے عمر ہی سے ہندوؤں سے قریب تھا۔ (۵) راجپوتوں نے اپنی بیٹیاں مغل بادشاہ کے حرم میں دیں تو اِس قربانی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ اکبر کو ذہنی، فکری اور عملی طور پر اپنے تابع کر لیں۔

اِس طرح ہندو راجپوت جو تین صدی تک مسلمانوں کو شکست نہ دے سکے تھے۔ اب انہوں نے مسلم حکمران کا دوست و مددگار بن کر حکومت کی پالیسی کو اپنے معیار کے مطابق تبدیل کر دیا اور ثقافت و کلچر کے دائرے میں اسلام کی انفرادیت کو نہ صرف مجروح کیا بلکہ ایسے رسوم و رواج کی بنیاد رکھوا دی جو اسلام کی ضد تھے۔

اِس طرح وہ مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جو اسلام کی راہ میں مزاحم ہوا اور اُس نے ہندوستان میں متحدہ کلچر اور تہذیب و تمدن قائم کرنے کی کوشش کی۔ جس کی روح خالص ہندوانہ تھی۔ اِس کے نتیجے میں ہندو اثرات غالب ہونے لگے۔ اسلامی نظریہ حیات اور تصور کی جگہ ایک نئے تصور حیات نے جنم لیا۔ (۶) دراصل ''اکبر اپنے عہد کی مذہبی، سماجی اور نظریاتی قوتوں کا منطقی نتیجہ تھا۔'' (۷) اُس کا دور، گنگا جمنی تہذیب کے جنم لینے کا دور ہے۔ (۸)

اکبر نے بھگت کبیر اور گرو نانک کی طرح صلح کل کی حکمت عملی اختیار کی اور ہندوستان کو ایک لادینی ریاست (سیکولر اسٹیٹ) بنانے کی کوشش کی۔ گو بعض مورخین اکبر کے اِس طرزِ عمل کو مذہبی رواداری سے تعبیر کرتے ہیں مگر یہ عجیب رواداری تھی جس کے تحت ہندو دھرم کو تقویت حاصل ہوئی اور اسلام کو شدید ضعف پہنچا۔

اکبر کی صلح کل پالیسی اور اُس کا وضع کردہ ''دین الٰہی'' درحقیقت آزاد خیال صوفیا اور بھگتی تحریک کے پھیلائے ہوئے افکار سے اخذ شدہ تھا جس کا بنیادی مقصد ''متحدہ قومیت'' اور ''وحدتِ ادیان'' کے تصور کی عملی تشکیل تھا جس نے اسلامی تہذیب اور مسلم قومیت کے زوال کو دوچند کر دیا۔

اکبر اِس حد تک آگے بڑھ گیا کہ شعائر و فرائضِ اسلامی کو ممنوع قرار دے دیا اور اپنے اِن خیالات کا اثر براہ راست عوام پر بھی ڈالا۔ (۹) اُس نے متعدد غیر اسلامی اقدامات کئے مثلاً ہندو عورتوں سے نکاح، ہندوؤں اور سکھوں کی مملکت کے اہم عہدوں پر تقرری، ہندوانہ رسوم کی حمایت، سن ہجری کی منسوخی، ذبح گاؤ پر پابندی اور خاص طور پر جزیہ کی بندش۔ جس سے یہ تاثر دیا گیا کہ مسلمان اور ہندو علیحدہ علیحدہ اقوام نہیں ایک ہی خطہ میں رہنے والی ایک قوم ہے، اِن میں نہ کوئی فاتح ہے اور نہ ہی کوئی مفتوح۔ (۱۰)

اِن اقدامات کے نتیجہ میں نہ صرف ہندوؤں میں مفتوح قوم کا احساس ختم ہوا بلکہ وہ ''ہندو حکومت'' کے قیام کا خواب دیکھنے لگے۔ مان سنگھ، بھگوان داس اور رائے سنگھ وغیرہ کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے سے ہندوؤں کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوا، دھڑا دھڑ مندر تعمیر ہونے لگے اور جگہ جگہ مساجد منہدم ہونے لگیں۔ اسلامی تشخص کے خاتمہ کیلئے عقائد اور دینی شعائر کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ (۱۱)

جبکہ ہندو مذہب کی ترویج و اشاعت کیلئے حکومتی سطح پر دارالترجمہ قائم کیا گیا جس میں ہندو مذہبی کتب مہا بھارت، رامائن اور اتھروید کے ترجمے کرائے گئے۔ بہت سے مسلمانوں کے نام تبدیل کئے گئے۔ اور پیغمبر اسلام ﷺ کی شان میں سر عام گستاخیاں ہونے لگیں۔ خود ہندو مورخین کے نزدیک اکبر پر ہندوؤں کا اِس قدر تسلط ہو چکا تھا کہ اُس کی تمام

عادات واطوار ہندوانہ ہو چکی تھیں۔

اکبر کے دور میں علماء و مشائخ کا وقار کم کرنے کیلئے انہیں دور دراز علاقوں میں منتشر کیا گیا۔ بعض کو قلعوں میں نظر بند کیا گیا۔ بعض پر گونا گوں اخلاقی الزامات عائد کئے گئے اور بعض کو ملک بدر کر دیا گیا۔ مغلیہ دور کا مشہور مورخ و مترجم اور ''منتخب التوریخ'' کا مصنف ملا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۵۹۵ء) دورِ اکبری کے حالات اور اُس کی مذہبی رواداری کی پالیسی کے حوالے سے لکھتا ہے:

> ''اکبر نے ہندوستان کو ایک ایسی سرزمین بنا دیا تھا، جہاں پر جو جس کا جی چاہے وہ کرتا پھرتا تھا۔''(۱۲) اکبر نے رعایا کے مابین مذہبی اختلافات کو فرو کرنے کیلئے ہندو ازم اور عیسائیت پر مشتمل ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی، جس کو دینِ الٰہی یا توحید الٰہی کا نام دیا گیا۔ (۱۳)
>
> برصغیر میں دینِ الٰہی کا اِجرا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔
>
> ''سولھویں صدی عیسوی میں اِس کے اِجرا میں اُس باطل تصور نے بھی نمایاں کردار ادا کیا کہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت کا دور ہزار سال تک محیط تھا اور یہ کہ اب وہ ختم ہو رہا ہے۔ اِس تصور نے برصغیر کی مسلم مذہبی سرگرمیوں میں بہت اضافہ کر دیا اور اِس حوالے سے کئی مہدی، مجدد، یہاں تک کے کہ نبوت کے جھوٹے دعویدار بھی پیدا ہو گئے۔''(۱۴)

بظاہر اکبر نے اپنے خود ساختہ دینِ الٰہی کے ذریعے رعایا کے درمیان مذہبی اختلاف کی جڑ کو ہی اکھاڑ پھینکا تھا۔ مگر حقیقت میں اُس نے ہندوستان میں اسلام کی برتری و تفوق کو ختم کر کے لادینی مملکت میں تبدیل کر دیا تھا اور مسلم قومیت کے تشخص و شناخت کی بنیادی علامت ''دو قومی نظریے'' کی بھی نفی کر دی تھی۔ برصغیر کی تاریخ میں اکبر کا یہ دو قومی نظریے کے خلاف پہلا عملی اظہار تھا۔ اکبر کے دور میں:

> ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا سفینہ ہندوستان میں ہمیشہ کیلئے غرقاب ہو جائے گا۔''(۱۵)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''دو قومی نظریے کے محافظِ اوّل''

اِن حالات میں احیائے اسلام، تجدید دین اور متحدہ قومیت کے خلاف مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے اور غیر مسلم معاشرے میں جذب ہونے سے بچانے کیلئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور آپ کے بعد شیخ احمد سرہندی نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اُس دور میں اصلاحِ احوال اور دو قومی نظریے کے تحفظ کی جو عملی صورتیں پیدا ہوئیں، اُس میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱ء۔۱۶۴۲ء) اور شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ء۔ ۱۶۲۵ء) کی مجددانہ کاوشیں نمایاں رہیں۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو برصغیر میں احیائے دین کی تحریک کے رہنماؤں میں اوّلین مقام حاصل ہے۔ برعظیم میں اسلامی علوم کے احیاء و فروغ میں آپ کی جذبہ عشق و محبتِ رسول ﷺ سے لبریز تصنیفات نے مرکزی کردار ادا کیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تصنیف و تالیف کے علاوہ سماجی شعور کی بیداری اور اصلاحِ احوال کیلئے مختلف نمائندوں اور حکمرانوں کو خطوط بھی لکھے۔ جس کا مقصد اِن لوگوں کو احیائے دین کی جانب راغب کرنا تھا۔ آپ نے اکبری اُمراء شیخ فرید و نواب خان خانان وغیرہ کو اپنے مکاتیب کے ذریعے نہ صرف صحیح عقائد کی جانب متوجہ کیا بلکہ ترویجِ دین اور اقامتِ سنت کی اہمیت بھی واضح الفاظ میں پیش کی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اکبری دورِ الحاد میں جبکہ شان رسالت ﷺ کی بے حرمتی کی جا رہی تھی اور اسلام کی عظمتیں پامال ہو رہی تھیں آپ نے لوگوں کو مقامِ رسالت ﷺ سے روشناس کیا اور آداب و خصائص، اختیارات و تصرفات اور محبت و عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کو اپنی کتابوں میں پوری تحقیق کے ساتھ بیان کیا۔

آپ کی تصانیف کا ایک ایک صفحہ نہ صرف الحادی قوتوں کا رد بلکہ ناموس و مقام مصطفیٰ ﷺ کا محافظ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر خلیق نظامی آپ کی تصانیف کے ایک ایک صفحے کو اکبری الحاد کا توڑ قرار دیتے ہیں۔ (۱۶) اُس دور میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی

عادات واطوار ہندوانہ ہوچکی تھیں۔

اکبر کے دور میں علماء و مشائخ کا وقار کم کرنے کیلئے انہیں دور دراز علاقوں میں منتشر کیا گیا۔ بعض کو قلعوں میں نظر بند کیا گیا۔ بعض پر گونا گوں اخلاقی الزامات عائد کئے گئے اور بعض کو ملک بدر کردیا گیا۔ مغلیہ دور کا مشہور مورخ و مترجم اور ''منتخب التوریخ'' کا مصنف ملا عبدالقادر بدایونی (ف ۱۵۹۵ء) دور اکبری کے حالات اور اُس کی مذہبی رواداری کی پالیسی کے حوالے سے لکھتا ہے:

''اکبر نے ہندوستان کو ایک ایسی سرزمین بنادیا تھا، جہاں پر جو جس کا جی چاہے وہ کرتا پھرتا تھا۔''(۱۲) اکبر نے رعایا کے مابین مذہبی اختلافات کو فرو کرنے کیلئے ہندو ازم اور عیسائیت پر مشتمل ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی، جس کو دین الٰہی یا توحید الٰہی کا نام دیا گیا۔(۱۳)

برصغیر میں دین الٰہی کا اِجرا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔

''سولھویں صدی عیسوی میں اِس کے اِجرا میں اُس باطل تصور نے بھی نمایاں کردار ادا کیا کہ حضور اکرم ﷺ کی نبوت کا دور ہزار سال تک محیط تھا اور یہ کہ اب وہ ختم ہورہا ہے۔ اِس تصور نے برصغیر کی مسلم مذہبی سرگرمیوں میں بہت اضافہ کردیا اور اِس حوالے سے کئی مہدی، مجدد، یہاں تک کے کہ نبوت کے جھوٹے دعویدار بھی پیدا ہوگئے۔''(۱۴)

بظاہر اکبر نے اپنے خود ساختہ دینِ الٰہی کے ذریعے رعایا کے درمیان مذہبی اختلاف کی جڑ کو ہی اکھاڑ پھینکا تھا۔ مگر حقیقت میں اُس نے ہندوستان میں اسلام کی برتری و تفوق کو ختم کر کے لادینی مملکت میں تبدیل کردیا تھا اور مسلم قومیت کے تشخص و شناخت کی بنیادی علامت ''دوقومی نظریے'' کی بھی نفی کردی تھی۔ برصغیر کی تاریخ میں اکبر کا یہ دوقومی نظریے کے خلاف پہلا عملی اظہار تھا۔ اکبر کے دور میں:

''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کا سفینہ ہندوستان میں ہمیشہ کیلئے غرقاب

ہوجائے گا۔''(۱۵)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''دوقومی نظریے کے محافظِ اوّل''

اِن حالات میں احیائے اسلام، تجدید دین اور متحدہ قومیت کے خلاف مسلمانوں کے ملی تشخص کو برقرار رکھنے اور غیر مسلم معاشرے میں جذب ہونے سے بچانے کیلئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور آپ کے بعد شیخ احمد سرہندی نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اُس دور میں اصلاحِ احوال اور دوقومی نظریے کے تحفظ کی جو عملی صورتیں پیدا ہوئیں، اُس میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۵۵۱ء۔۱۶۴۲ء) اور شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۴ء۔ ۱۶۲۵ء) کی مجددانہ کاوشیں نمایاں رہیں۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو برصغیر میں احیائے دین کی تحریک کے رہنماؤں میں اوّلین مقام حاصل ہے۔ برعظیم میں اسلامی علوم کے احیاء و فروغ میں آپ کی جذبۂ عشق و محبتِ رسول ﷺ سے لبریز تصنیفات نے مرکزی کردار ادا کیا۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے تصنیف و تالیف کے علاوہ سماجی شعور کی بیداری اور اصلاح احوال کیلئے مختلف نمائندوں اور حکمرانوں کو خطوط بھی لکھے۔ جس کا مقصد اِن لوگوں کو احیائے دین کی جانب راغب کرنا تھا۔ آپ نے اکبری اُمراء شیخ فرید و نواب خان خانان وغیرہ کو اپنے مکاتیب کے ذریعے نہ صرف صحیح عقائد کی جانب متوجہ کیا بلکہ ترویج دین اور اقامتِ سنت کی اہمیت بھی واضح الفاظ میں پیش کی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اکبری دورِ الحاد میں جبکہ شان رسالت ﷺ کی بے حرمتی کی جارہی تھی اور اسلام کی عظمتیں پامال ہورہی تھیں آپ نے لوگوں کو مقامِ رسالت ﷺ سے روشناس کیا اور آداب و خصائص، اختیارات و تصرفات اور محبت وعظمتِ مصطفیٰ ﷺ کو اپنی کتابوں میں پوری تحقیق کے ساتھ بیان کیا۔

آپ کی تصانیف کا ایک ایک صفحہ نہ صرف الحادی قوتوں کا رد بلکہ ناموس و مقام مصطفیٰ ﷺ کا محافظ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر خلیق نظامی آپ کی تصانیف کے ایک ایک صفحے کو اکبری الحاد کا توڑ قرار دیتے ہیں۔(۱۶) اُس دور میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی

تصنیفات نے گم کشتگان راہ کو ہدایت سے ہمکنار کیا اور اسلام کو دینِ حق پر استقامت بخشی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی زندگی کا آدھے سے زیادہ عرصہ دورِ اکبری میں گزارا۔آپ نے اپنے شاگردوں کا پورے ملک میں جال بچھانے کے ساتھ اُمراء سے خصوصی رابطے کرکے عقلی ونقلی علوم کے خزانے اُن کے حوالے کیے۔

> ''شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے گیارہویں صدی ہجری کے اُس پُر آشوب دور میں جہاں ایک طرف سیاسی مقتدرِ اعلیٰ وحدتِ ادیان کا حامی تھا تو دوسری طرف لبرل ازم کے حامی فشاری گروہ وحدتِ قومیت کا نعرہ بلند کررہے تھے، تیسری طرف مقام رسالت ﷺ پر نظریاتی حملے کیے جارہے تھے، ایسے میں آپ نے ناموسِ رسالت ﷺ کا پاس رکھتے ہوئے شریعتِ محمدی ﷺ کیلئے جہاد کیا۔''(۱۷)

برصغیر پاک وہند میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی اکبری الحاد اور لبرل ازم کے مقابلے میں اسلامی قومیت کی توضیح پیش کرنے والے سب سے پہلے فرد تھے۔یعنی:

> ''دورِ جدید میں اسلامی قومیت کی توضیح سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے کی۔''(۱۸)

بقول ڈاکٹر محمد یونس قادری:

> ''برصغیر میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی دوقومی نظریے کی خشت اوّل ہیں۔''(۱۹)

اور ''اسلام تیرا دیس ہے، تو مصطفوی ﷺ'' ہے۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا نظریہ اُمت ہے۔

دوقومی نظریہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے محدث بریلوی تک

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد اکبر کی مذہبی گمراہی، دینِ الٰہی کے قیام اور اکبر کے کفر الحاد کے خلاف شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانی کی کوششوں سے کسی طور صرفِ نظر ممکن نہیں۔کچھ محققین نے حضرت مجدد الف ثانی کو دوقومی نظریے کا ''موسّس اوّل'' قرار

دیا ہے۔لیکن ڈاکٹر یونس قادری کے تحقیقی دلائل اِس کے برخلاف ہیں۔یہی رائے ڈاکٹر خلیق نظامی کی بھی ہے، جو لکھتے ہیں:

> ''شیخ مجدد نے اُس دور (عہدِ جہانگیر) میں اپنی کوششوں کا آغاز کیا تھا، یہی وجہ ہے کہ کسی معاصر تذکرے میں دورِ اکبری کے حوالے سے شیخ احمد سرہندی کی کاوشوں کا تذکرہ نہیں ملتا ہے۔''(۲۰)

تاہم اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُس دور میں حضرت مجدد الف ثانی نے اسلامی نظریات اور اُس کے صحیح خدوخال کو حقیقی اسلامی روح کے مطابق محفوظ رکھنے کیلئے غلط عقائد ونظریات کے خلاف بھرپور جدوجہد کی اور حضرت مجدد کی تجدیدی کوششوں سے ہندوستان میں اسلام کو حیاتِ نو ملی۔

حضرت مجدد الفِ ثانی نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی طرح اراکین سلطنت کو مکتوبات لکھ کر انہیں ترویجِ شریعت کی تلقین کی اور عام ارشاد وہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔انہوں نے انقلابی قدم اٹھانے کے بجائے اصلاحی اور تجدیدی طریقہ کار اختیار کیا اور بادشاہ وقت کو زیادہ سے زیادہ مذہبی بنانے کی کوشش کی۔

> ''شیخ ہندی کا حقیقی فکری کارنامہ صوفیانہ مابعدالطبیعات وحدت الوجود کے مقابلے میں وہ نظریہ پیش کرنا ہے، جسے عام طور پر فلسفہ وحدت الشہود کا عنوان دیا جاتا ہے۔یہ نظریہ مظہریاتی اَحدیت پر مبنی ہے اور اِسے برصغیر کے مسلم فکر کے اِرتقا کا حاصل قرار دیا گیا ہے۔''(۲۱)

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اِس مقام پر یہ وضاحت کردی جائے کہ فلسفہ ''وحدت الوجود'' اور ''وحدت الشہود'' کی حقیقت کیا ہے۔؟ بنیادی طور پر وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے فلسفے خالق اور مخلوق کے باہمی تعلق کی وضاحت کرتے ہیں جو باطنی مشاہدے پر مبنی ہے۔حضرت مجدد الف ثانی وحدت الوجود کو باطنی مشاہدے کی ابتدائی منزل قرار دیتے ہیں جس پر پہنچ کر سالک پر خودفراموشی کی ایسی کیفیت طاری ہوجاتی اور وہ ذات باری میں اتنا محو ہوجاتا ہے کہ غیر خدا کا احساس تک نہیں رہتا۔

وحدت الوجود حقیقت نہیں محض ایک احساس ہے ایک کیفیت ہے۔ اُن کے نزدیک وحدت الوجود کا تجربہ (جس میں سالک اپنے آپ کو ذات باری سے متحد خیال کرتا ہے اور غیر کو معدوم سمجھنے لگتا ہے) حقیقت کے بجائے التباس ہے، حقیقت کا مشاہدہ نہیں۔

اِس کا تجربہ سکر کی حالت میں ہوتا ہے اِس لیے قابل اعتماد نہیں۔ حقیقی تجربہ کثرت دوری اور عبدیت کا ہے جو شعور اور ہوشیاری کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ جس میں خدا اور فرد کے درمیان خالق ومخلوق کا رشتہ باقی رہ جاتا ہے اور سالک محسوس کرتا ہے کہ اُس کا وجود خدا سے مختلف ہے۔ اُس کے تابع ہے مگر اُس سے جدا ہے یہی مقام عبودیت ہے جو روحانی ارتقا کی اعلیٰ منزل ہے جسے آپ ''وحدت الشہود'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

درحقیقت برعظیم میں آزاد خیالی کی اساس جس فلسفے نے فراہم کی اُس کا ماخذ وحدت الوجود قرار پایا۔ ہندومت اور اسلام، ویدانت اور تصوف کے درمیان ترکیب وامتزاج کا عمل، اکبر کا وضع کردہ دین الٰہی، متحدہ قومیت کا نظریہ اور صلح کل کی پالیسی، اِن سب کی بنیاد اسی فلسفہ کی غلط تاویلات پر رکھی گئی۔ جس نے اسلام اور مسلم قومیت کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔

آپ نے اپنی خداداد بصیرت سے آزاد خیالی کے اِس حقیقی منبع کو تلاش کیا اور اُس پر بھرپور حملہ کرنے میں کامیاب ہوئے اور وحدت الشہود کے ذریعہ اِس فلسفہ پر کاری ضرب لگا کر آزاد خیالی کو اُس کی بنیادوں سے محروم کردیا جس کے نتیجہ میں احیائے اسلام کو تقویت حاصل ہوئی اور مسلم قومیت کا تصور اجاگر کرنے میں مدد ملی۔

حضرت مجدد الف ثانی کا پیش کردہ فلسفہ وحدت الوجود کے منفی اثرات کا ازالہ تھا۔ آپ نے وحدت الوجود کی اُن تعبیرات کی پرزور مخالفت کی جن سے اتحاد وحلول کا شائبہ پیدا ہوتا تھا۔ آپ نے واضح کیا کہ ''دنیا اور خدا میں وہی رشتہ ہے جو خالق ومخلوق میں ہوتا ہے، اتحاد وحلول کی تمام تقریریں الحاد ہیں جو سالک کی باطنی غلط فہمی سے پیدا ہوتی ہیں۔

آپ نے اِس موقف کی بھی سختی سے تردید کی کہ ''رام'' اور ''رحمان'' ایک ہستی ہیں۔ اِس فلسفہ وحدت الشہود کے فروغ کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ انسان دوستی کی اُس فکر کو مسترد کردیا گیا جس کا درس صوفیوں اور بھگتی تحریک کے رہنماؤں اور اکبر اعظم نے دیا تھا۔ (۲۲)

مشہور مورخ اور فلسفی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی (۱۹۰۳ء۔۱۹۸۱ء) کے مطابق:

> ''وحدت الوجود کا رد اُس عہد کی سب سے بڑی ضرورت تھی اور اسلام اُس وقت جس مرض میں مبتلا تھا اُس کی تشخیص اسی پر مبنی تھی...... حضرت مجدد کی تبلیغی مساعی کا حاصل یہی تھا کہ اسلامی تعلیمات کو ہندومت کے ساتھ اشتراک عمل سے روکیں اور انہیں وحدت الوجودی تعلیمات نہ بننے دیں۔ مسلمانوں کی ملت اور اسلامی پاکیزگی اسی طرح برقرار رہ سکتی تھی کہ اُن کی جداگانہ ہستی اور انوکھی نوعیت پر اصرار کیا جائے۔'' (۲۳)

حضرت مجدد الف ثانی کا ایک زبردست کارنامہ مسلم معاشرہ اور سیاست کو غیر مسلموں کے اثرات سے محفوظ کرکے اسلام کیلئے حالات سازگار کرنے کا بھی ہے۔ آپ مسلمانوں کو غیر مسلموں میں جذب کرنے کی سازشوں کو بے نقاب کرنے کے ساتھ اُن رسوم ورواج کو ترک کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشابہت پیدا کرنے کا ذریعہ تھیں۔ نیز آپ نے مسلمانوں میں اُن کی قومی وحدت، یکجہتی اور غیر مسلموں سے علیحدگی کے تصور کو تقویت بھی دی۔ یہی وہ جذبہ فکر تھا جو آنے والی نسلوں میں موجزن رہا اور غلامی اور انحطاط میں بھی یہ تصور اُن کے احساس میں زندہ رہا۔

حضرت مجددؒ کی پیروی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ (۱۷۰۳ء۔۱۷۶۳ء) نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ اُنہوں نے اصلاح احوال کیلئے حجۃ اللہ البالغہ میں بادشاہوں کے اوصاف و فرائض بتا کر اُن کو صحیح راستہ پر چلنے کی تلقین کی اور مغل دربار اور سیاست کا رنگ بدلنا چاہا۔ شاہ ولی اللہ نے سیاسی اقتدار کی بحالی پر سب سے زیادہ زور دیا اور اِس مقصد کے حصول کیلئے اپنے عہد کی اسلامی قوتوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور انہیں ہند پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔

انیسویں صدی کے درمیان میں علامہ فضل حق خیر آبادی (۱۷۹۷ء۔۱۸۶۱ء) نے حضرت محدث دہلوی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے اصلاحی اور تجدیدی طریقہ کار کے بجائے انقلابی طریقہ کار اختیار کیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر آپ نے جہاد کے

واجب ہونے کا فتویٰ دے کر پاک و ہند کی تاریخ میں حریتِ فکر ایک نئی مثال قائم کی۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق:

''مولانا کی یہ جرات اور اعلان کلمۃ الحق جنگِ آزادی کی تاریخ میں ہی نہیں دنیا کی تاریخ میں ایک یادگار واقعہ ہے۔'' (۲۴)

علامہ فضل حق خیر آبادی کا یہ فتویٰ جہاد دراصل دوقومی نظریہ کا اوّلین عملی اظہار تھا۔ جس نے حصول آزادی کیلئے لوگوں کی ذہن سازی کے ساتھ سامراجی ظلم واستبداد کے حقیقی چہرے سے بھی دنیا کو آگاہ کیا۔ اور مسلمانوں کے دلوں میں غیرملکی تسلط اور غلامی کا پھندا اُتار پھینکنے کے ارادوں کو مزید راسخ اور مستحکم کردیا۔ جب بھی ہندوستان کی جنگِ آزادی کی مستند اور مکمل تاریخ تعصب وتنگ نظری سے بلند ہوکر لکھی جائے گی تو مولانا فضل حق خیر آبادی کا نام اور کام سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتدا میں جب برصغیر میں ہندومسلم اتحاد کی طوفانی آندھیاں چل رہی تھیں اور کئی نامور علماء اِس طوفان بلاخیز کی رُو میں بہہ کر اسلامی تعلیمات واقدار کو فراموش کر بیٹھے تھے۔ اُس وقت مولانا احمد رضا خاں محدث بریلوی (۱۸۵۶ء۔۱۹۲۱ء) اِسی دوقومی نظریے کے پہلے سب سے بڑے شارح ،علمبردار اور محافظ بن کر سامنے آئے۔

آپ نے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے اسلامی نظریہ اُمت کی تجدید کرتے ہوئے اُسے پوری شدومد کے ساتھ پیش کیا۔آپ کی محققانہ کتب ورسائل ''انفس الفکر فی قربان البقر(۱۲۸۹ھ)،اعلام الا علام بان ہندوستان دارالاسلام (۱۳۰۶ھ)،تدبیر فلاح و نجات و اصلاح (۱۳۳۱ھ).دوام العیش فی الائمۃ من قریش (۱۳۳۹ھ)،المحجۃ الموتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ(۱۳۳۹ھ)،الطاری الداری لھفوات عبدالباری(۱۳۲۱ھ) ''وغیرہ نے سیاستِ ملّیہ میں اہم کردار ادا کیا اور سیاستدانوں کی رہنمائی کی۔ یہ کتب ورسائل آپ کی مومنانہ بصیرت اور مدبرانہ سیاست کے آئینہ دار ہیں۔

وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد حسن امام کے مطابق ''مذکورہ بالا کتب ورسائل کے مطالعے کے بعد آپ کا سیاسی مسلک بہت صاف و واضح نظر آتا ہے کہ ابتدا سے اِنتہا تک اِس میں نہ کوئی نشیب وفراز آیا اور نہ ہی کوئی لچک پیدا ہوئی۔'' (۲۵)

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد (۱۹۳۰ء۔۲۰۰۸ء) ''حیاتِ مولانا شاہ احمد رضا فاضل بریلوی'' میں لکھتے ہیں:

''محدث بریلوی روز اوّل سے دوقومی نظریہ کے علمبردار رہے اور آخر تک اِس کیلئے کوشاں رہے۔ وہ ہنود کی سیاسی چالوں سے بخوبی باخبر تھے۔ اِس لیے سیاستِ ملیہ کے ہر اہم موڑ پر آپ نے مسلمانوں کو خبردار کیا۔ ہنود کے چھپے ارادوں اور ہندو مسلم اتحاد کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب قائد اعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۸ء) اور ڈاکٹر اقبال (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) متحدہ قومیت کی بات کررہے تھے۔'' (۲۶)

روزنامہ نوائے وقت پاکستان میں نصف صدی سے جاری رہنے والے کالم ''نور بصیرت'' کے بانی کالم نگار میاں عبدالرشید شہید لکھتے ہیں:

''برعظیم پاک وہند کے مسلمانوں کو سیاسی خودکشی سے بچانے اور اُن کے ایمان کو اندورنی اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے سلسلہ میں حضرت احمد رضا خاں بریلوی نے جوگراں قدر خدمات سرانجام دیں وہ لائق صد ستائش ہیں۔ (۲۷)

تحریکِ خلاف،تحریکِ ہجرت اور ترکِ موالات کے ہیجانی دور میں جب بڑے بڑے مسلمان زُعما اِس کی رُو میں بہہ گئے اور ڈاکٹر اقبال و قائداعظم جیسے رہنماؤں نے اِس طوفان بلاخیز کے آگے ہتھیار ڈال کر خاموشی اختیار کرلی۔ اُس وقت محدث بریلوی نے سخت مزاحمت کی اور وحدت ملّی کے چراغ روشن کیے۔ (۲۸) اُس زمانے کے حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے میاں عبدالرشید لکھتے ہیں:

''گاندھی کی آندھی نے جو خاک اڑائی تھی، اُس میں بڑوں بڑوں کے
پاؤں اُکھڑ گئے اور بینائی زائل ہوگی مگر علامہ اقبال اور قائد اعظم کے
علاوہ تیسری بڑی شخصیت جو اِس شور وغوغا اور ہلڑ بازی سے قطعاً متاثر نہ
ہوئی، حضرت احمد رضا خاں بریلوی تھے۔'' (۲۹)

محدث بریلوی نے علامہ اقبال اور قائد اعظم کی طرح حالات کے آگے ہتھیار نہیں
ڈالے اور نہ ہی خاموشی اختیار کی بلکہ

''جن لوگوں نے میدان میں آکر خلافت، ہجرت اور ترکِ موالات
جیسی نقصان دہ تحریکوں کی (بانگ دہل) مخالفت کی اور اُن کے
حامیوں اور لیڈروں کا زور توڑا، وہ حضرت احمد رضا خاں اور اُن کے
احبا، رفقا اور عقیدت مند ہی تھے۔'' (۳۰)

اِس تناظر میں ممتاز مورخ اور سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی ڈاکٹر اشتیاق حسین
قریشی کی رائے بہت اہمیت کی حامل ہے، آپ لکھتے ہیں:

''اِس سے بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ بریلوی مکتبِ فکر سے متعلق علما
مسلمانوں کیلئے کانگریس کی قیادت کے خلاف تھے۔ کیونکہ انہیں یہ یقین
تھا کہ اِس سے مسلمان بتدریج اپنے مذہبی تشخص سے محروم ہوجائیں
گے اور وہ ہندوؤں کے عقائد اور روایات قبول کرلیں گے۔'' (۳۱)

ہم دیکھتے ہیں کہ ''پاک وہند کی تاریخ میں دو ایسے ادوار آئے جب
''اسلامی نظریہ اُمت'' یعنی دوقومی نظریہ کے تصور کے احیا کی کوشش کی
گئی۔ پہلی بار سولھویں صدی عیسوی میں اکبر بادشاہ نے جب اسلامی
شعائر کو مٹانے کی کوششیں کیں اور کئی علماء اور خواص سب مذہب سے
دور ہٹے ہوئے تھے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی کوششوں کا آغاز
کیا، جس کا تسلسل اورنگزیب عالمگیر (۱۶۵۸ء۔۱۷۰۷ء) کی اسلامی
حکومت کی صورت میں مکمل ہوا۔ دوسری بار انیسویں صدی کے نصف

آخر میں غیر اقوام کی چالبازیوں سے مسلمان اسلامی شعائر کو چھوڑنے
لگے تو ایسے میں مولانا احمد رضا محدث بریلوی نے دوقومی نظریہ کا احیاء
کیا جو کہ بذات خود شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا تسلسل ہیں۔'' (۳۲)

محدث بریلوی نے آزادی وحریت کیلئے جو راہ متعین کی آپ کے بعد آپ کے
صاحبزادگان، خلفا، تلامذہ، متبعین اور محبین نے اِس راہ پر چلتے ہوئے آپ کے افکار ونظریات کو
آگے بڑھایا اور اِس تحریک کو جاری رکھا۔ اِن میں ایک نمایاں نام پروفیسر سیّد محمد سلیمان
اشرف بہاری (۱۸۷۸ء۔۱۹۳۹ء) کا بھی ہے۔جن کی حیات وخدمات اور کارناموں کا
تذکرہ اگلے ابواب میں آرہا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) قائداعظم محمد علی جناح کا ۸، مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا سے خطاب، محمد متین خالد، اسلام کا سفیر، علم وعرفان پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۲۳

(۲) اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص:۱۲۶

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں ''جذبہ انفرادیت اور اُس کے بقا کی خواہش ہی دراصل ہماری قومیت کی بنیادیں ہیں۔ اِس برعظیم کے مسلمان چودہ سوسال سے ساتھ رہنے، ایک ضابطہ حیات کا پابند ہونے، عروج وزوال، ترقی وانحطاط میں شراکت کی وجہ سے ایک قوم بن گئے اور تمام ذیلی اختلافات کے باوجود اُن میں صدیوں میں جذبہ قومیت پرورش پاکر مستحکم ہوگیا۔ اگر یہ جذبہ قومیت استوار نہ ہوتا تو برعظیم کے مسلمان کبھی کے ہندوؤں میں مدغم ہوگئے ہوتے۔'' (نظریہ پاکستان کے تاریخی، سیاسی اور معاشرتی پہلو۔ نظریہ پاکستان فاونڈیشن، لاہور ۱۹۹۹ء، ص:۱۲)

(۳) بھگتی تحریک کی ابتدا بارہویں صدی عیسوی میں جنوبی ہند میں ہوئی۔ یہ تحریک تصوف کی ہندوستانی شکل تھی۔ اُس کے بانی سوامی رامانج (۱۰۱۶ء۔۱۱۳۷) مادھو (۱۱۹۹ء۔۱۲۷ء)، آنند تیرتھ، وشنوسوامی اور باسو تھے۔ جنوبی ہند کے بعد شمالی ہند میں اِس کی ترویج کرنے والے رامانند تھے۔ (سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔ کراچی مکتبہ دانیال۔۲۰۰۲ء، ص:۱۵۸ اکبر کے عہد حکومت میں بھگتی تحریک نے اپنے اثرات پھیلائے گو''لودھی خاندان کے عہد حکومت میں بھگت کبیر اور گورونانک کو اپنے ترکیبی نظریات کی بنا پر قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑی تھیں۔ اِس طرح برصغیر میں روشن خیالی اور راسخ الاعتقادی کی باہمی کشمکش نے بالآخر بالائی اور نچلے طبقات کے درمیان آویزش کی صورت اختیار کرلی۔ اِس آویزش میں عوامی قوتوں کو فتح حاصل ہوئی۔ مغلیہ سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی اِن قوتوں کی بالادستی نے اپنا اظہار شروع کردیا تھا، تاہم اِس کا شدید ترین اظہار مغل اعظم ابوالفتح جلال الدین محمد

اکبر کے عہد حکومت میں ہوا۔'' (قاضی جاوید، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، نگارشات لاہور، ۱۹۸۶ء، ص:۸۰)

(۴) ڈاکٹر ازکیا ہاشمی، مضمون برصغیر پاک وہند میں مسلم قومیت کے احیاء میں وحدت الشہور کا کردار'' مشمولہ فکر ونظر اسلام آباد، جلد۳۴، شمارہ۴، ۱۹۹۷ء

(۵) معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۶ء، ص:۶۴

(۶) نظریہ پاکستان نمبر، چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۰ء، ص:۱۳۵

(۷) یونس قادری، ڈاکٹر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی موضوعاتی مطالعہ (پی ایچ ڈی مقالہ) مکتبہ الحق کراچی، ۲۰۰۷ء، ص:۶۳

(۸) اکبر نے ہندوؤں کو خوش کرنے کیلئے گاؤکشی بند کرادی۔ دربار اور محل میں بہت سی ہندو رسوم سرکاری طور پر منائی جانے لگیں۔ مندروں کی تعمیر کی عام اجازت دے دی گئی۔ یاترا ٹیکس ختم کردیا گیا۔ جزیے کی وصولی موقوف ہوگئی۔ لوگوں کو اپنا آبائی مذہب اختیار کرنے کی اجازت دے دی گئی اور غیر مسلموں کی اجتماعی اجتماعات پر سے تمام پابندیاں ہٹالی گئیں۔ ''مولانا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ اکبر اپنے زمانے کے علماء کو رازی اور غزالی سے بہتر خیال کرتا تھا۔ لیکن اُن کی رکاکتیں دیکھ کر علمائے سلف کا بھی منکر ہوگیا اور پھر انہی علما نے ملا مبارک ناگوری جیسے ذہین اور فہیم عالم کو بھی اپنے سے بیگانہ کردیا۔ جس کی وجہ سے اُن کا سارا دینی تجبّر اکبر کو مجتہد اعظم ثابت کرنے اور اُن کے لڑکوں ابوالفضل اور فیضی کی ساری ذہانت اور لیاقت دینِ الٰہی کی حمایت میں صرف ہوئی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکبر قرآن مجید، حیات بعدالموت اور یوم جزا کا منکر ہوگیا۔ اُس نے حکم دیا کہ کلمہ کی جگہ ''لاالٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ'' پڑھا جائے۔ شراب اور سُور کا گوشت حلال کردیا گیا لیکن گائے کا گوشت حرام قرار پایا، حج منسوخ کردیا گیا، تقویم اسلامی کے بدلے الٰہی ماہ وسال رائج ہوگئے، عربی کا مطالعہ تحقیر سے دیکھا جانے لگا، دربار میں نماز باجماعت موقوف کردی گئی، مساجد اور نماز کے کمرے گوداموں میں تبدیل کردیئے گئے۔'' (سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ص:۴۱)

پروفیسر محمد اسلم اپنے مضمون ''اکبر کا دین الٰہی اور اُس کا پس منظر'' مطبوعہ ماہنامہ الفرقان

لکھنو، ماہ محرم الحرام ۱۳۸۹ھ صفحہ ۴۷ پر لکھتے ہیں کہ ''قصہ مختصر اکبر نے جملہ شعار اسلامی مٹادیئے، بقول ڈاکٹر محمد یٰسین صاحب اگر اُس صورت حال کا اصلاحی ذہن سے مطالعہ کیا جائے تو وہ دین اسلام سے منحرف ہو چکا تھا۔'' یہی وجہ تھی کہ جون پور کے مشہور عالم قاضی ملا محمد یزدی نے اکبر کے مرتد ہونے کا فتویٰ دیتے ہوئے کہا اُس کے خلاف صف آراء ہونا ہر مسلمان کا فرض ہے۔(دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔جلد۴۔ص ۱۲۶،مشمولہ ماہنامہ الفرقان لکھنو، ماہ محرم الحرام، ۱۳۸۹ھ ص:۴۹)

(۹) معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی، ۱۹۷۶ء، ص:۶۴

(۱۰) ڈاکٹر ازکیا ہاشمی، مضمون برصغیر پاک وہند میں مسلم قومیت کے احیاء میں وحدت الشہور کا کردار'' مشمولہ فکرونظر اسلام آباد، جلد۳۴، شمارہ۴، ۱۹۹۷ء

(۱۱) ایضاً

(۱۲) ایس ایم برکے، اکبرنامہ، مترجم مسعود مفتی، علم وعرفان پبلیشرز لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۱۴۳

(۱۳) اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر، برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۸۷ء، ص:۱۸۵

(۱۴) قاضی جاوید، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، نگارشات لاہور، ۱۹۸۶ء، ص: ی۹۔۹

(۱۵) صباح الدین عبدالرحمٰن، سید، ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ص:۴۱

(۱۶) یونس قادری، ڈاکٹر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی موضوعاتی مطالعہ (پی ایچ ڈی مقالہ)، مکتبہ الحق کراچی، ۲۰۰۷ء ص:۱۷۸

(۱۷) ایضاً ص:۱۷۶

(۱۸) ایضاً ص:۳۳۸

(۱۹) ایضاً ص:۱۷۹ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دوقومی نظریہ کے حوالے سے مقالے کا مطالعہ کیجئے)

(۲۰) ایضاً ص:۱۷۸

(۲۱) قاضی جاوید، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقاء، نگارشات لاہور، ۱۹۸۶ء، ص:۱۴۸

(۲۲) دیکھئے ڈاکٹر ازکیا ہاشمی کا، مضمون برصغیر پاک وہند میں مسلم قومیت کے احیاء میں وحدت

الشہور کا کردار'' مشمولہ فکرونظر اسلام آباد، جلد۳۴، شمارہ۴، ۱۹۹۷ء

(۲۳) اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر، برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ، شعبہ تصنیف وتالیف کراچی، ۱۹۸۳ء، ص:۲۰۱

(۲۴) ناصر کاظمی، انتظار حسین، ۱۸۵۷ء خیال نمبر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء، ص:۲۵۹

(۲۵) حسن امام، ڈاکٹر، مولانا احمد رضا فاضل بریلوی اور برصغیر کی سیاسی تحریکات، مجلہ معارف رضا کراچی، شمارہ ۳۲، ۲۰۱۲ء، ص:۸۰

(۲۶) محمد مسعود احمد، ڈاکٹر، حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی، اسلامی کتب خانہ اقبال روڈ، سیالکوٹ ۱۹۸۱ء، ص: (۱۷۔۱۷!)

(۲۷) عبدالرشید، میاں، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۱۵

(۲۸) محدث بریلوی کافر ومشرک، یہود ونصاریٰ، آتش پرست وستارہ پرست سب ہی کو مسلمانوں کا جانی دشمن گردانتے تھے، اور آپ گاندھی کی قیادت کو مسلمانان ہند کیلئے سم قاتل سمجھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے تحریک خلافت، تحریک ہجرت، تحریک ترک موالات اور تحریک ترک گاؤ ذبیحہ وغیرہ کی سختی سے مخالفت کی اور اِن تحاریک میں شامل مسلمان زعما کا بھی محاسبہ کیا۔ اِس دوران محدث بریلوی نے اسلام کی خاطر اپنے عزیز ترین دوستوں سے بھی اختلاف کیا اور اُن کی رنجشیں مول لیں۔ جیسے مولانا عبدالباری فرنگی محلی جن کو محدث بریلوی ''فاضل اکمل'' کہا کرتے تھے اور جو محدث بریلوی کے مخصوصین میں سے تھے۔ جب مولانا عبدالباری جیسے فاضل پر گاندھی کا جادو چل گیا اور وہ تحریک خلاف وترک موالات میں گاندھی کے ساتھ ہوگئے اور اُس کو اپنا قائد تسلیم کرنے لگے تو محدث بریلوی نے باوجود ذاتی تعلق ومحبت کے اُن کا تعاقب کیا اور سخت گرفت کی۔ ترک موالات اور ہندومسلم اتحاد کے موضوع پر دونوں کے درمیان مراسلت ہوئی جو ''الطاری الداری لھفوات عبدالباری'' کے نام سے تین حصوں میں محدث بریلوی کے صاحبزادے مولانا محمد مصطفےٰ رضا خاںؒ نے ۱۹۲۱ء میں بریلی سے شائع کی۔ ڈاکٹر اشیاق حسین قریشی محدث بریلوی کی اصابت رائے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''اِس مخالفت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اِس اتحاد کے بڑے بڑے حامی افراط وتفریط میں اِس قدر بہہ گئے تھے کہ ایک عالم اِس کی حمایت نہیں کرسکتا تھا۔ مولانا احمد رضا بریلویؒ نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی بعض تحریروں اور افعال پر اعتراض کیا، جنھوں نے خود اِن الفاظ میں

اِس کا حسین اعتراف کیا ''مجھ سے بہت سے گناہ سرزد ہوئے ہیں، کچھ دانستہ اور نادانستہ مجھے اِن پر ندامت ہے، زبانی، تحریری اور عملی طور پر مجھ سے ایسے امور سرزد ہوئے جنہیں میں نے گناہ تصور نہیں کیا تھا۔ لیکن مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ انہیں اسلام سے انحراف یا گمراہی یا قابل مواخذہ خیال کرتے ہیں۔ اُن سب سے میں رجوع کرتا ہوں جن کیلئے پیش روؤں کا کوئی فیصلہ یا نظیر موجود نہیں۔ اُن کے بارے میں مولانا احمد رضا خاںؒ کے فیصلوں اور فکر پر کامل اعتماد کا اظہار کرتا ہوں۔'' مقالہ ''دوقومی نظریہ اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی'' یہ مقالہ نیٹ پر موجود ہے۔

(۲۹) عبدالرشید، میاں، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۹ء، ص: ۱۲۰

(۳۰) ایضاً ص: ۱۱۶۔۱۱۷

(۳۱) اشیاق حسین قریشی، ڈاکٹر، مقالہ ''دوقومی نظریہ اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی'' یہ مقالہ نیٹ پر موجود ہے

(۳۲) یونس قادری، ڈاکٹر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی موضوعاتی مطالعہ (پی ایچ ڈی مقالہ)، مکتبہ الحق کراچی، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۷۸

باب سوم

شعورِ بیداریٔ ملت

شعورِ بیداریٔ ملت

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف بہاری صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ گزشتہ صدی کے اُن علمائے ذی وقار میں شمار ہوتے ہیں جن کی ذات علم وعمل کی جامع تھی۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اُن لائق تکریم اساتذہ میں سے ایک ہیں، جن کے حلقہ احباب میں وہ مختلف الخیال علما و اہل علم ودانش شامل تھے جو سیّد صاحب کی صحبت اور محفل میں حاضری کو اپنے لیے باعث فخر وسعادت سمجھتے تھے۔ مولانا سادہ مزاج، نفاست پسند اور انتہائی خوددار طبیعت کے مالک تھے۔

سیّد سلیمان اشرف معقولات کے عالم، لسانیات کے ماہر، فقیہ ومدرس اور ادیب تھے اور اپنے استاد مولانا ہدایت اللہ خان جون پوری سے بے انتہا محبت وعقیدت رکھتے تھے۔ مولانا ہدایت اللہ جون پوری کے علاوہ سیّد محمد سلیمان اشرف اپنی زندگی میں جس دوسری عظیم شخصیت سے متاثر ہوئے وہ محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی ذات گرامی تھی۔

سیّد سلیمان اشرف کے شاگرد ڈاکٹر سیّد عابد احمد علی، ڈائریکٹر بیت القرآن لاہور کے مطابق:

> ''استاذ محترم کی طبیعت اُنہی کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ وہ معتقدات اور ایمانیات میں منطقی استدلال اور علوم عقلیہ میں خوش کلامی اور قوت بیان میں حضرت مولانا کے انداز اور کیفیات کو اپنا چکے تھے۔ غیر اسلامی

شعائر کی مذمت میں تشدد ،کانگریس اور ہندوؤں کی ہم نوائی کرنے
والے لیڈروں اور عالموں کے متعلق سخت گیر رویہ،مشرکین کونجس سمجھنا
اور اُن کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت روا نہ رکھنا، یہ سب صفات
دونوں بزرگوں میں مشترک تھیں۔''(۱)

یہ محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں کا ہی فیضان نظر تھا کہ سیّد سلیمان اشرف نے زندگی بھر مجاہدانہ کردار ادا کیا۔اُنہوں نے قومی زندگی کے ہر اہم موڑ پر مومنانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کی فکری رہنمائی کی اور کبھی بھی باطل فکر و نظریات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ گویا اُن کی زندگی ''مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ'' کی مصداق تھی۔

سیّد سلیمان اشرف اور عالم کفر کی طاغوتی یلغار

بیسویں صدی کا ابتدائی عشرہ مسلمانان عالم اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کیلئے چیلنجز کا عشرہ ہے۔ایک طرف عالمِ اسلام پر مصائب و آلام کے بادل چھائے ہوئے تھے تو دوسری جانب مسلمانانِ ہند بہت سے سیاسی،معاشرتی اور مذہبی مسائل سے دوچار تھے۔ترکی کی خلافتِ عثمانیہ اور حجازِ مقدس میں مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت جیسے اہم قومی وملّی مسائل نے انہیں سخت اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی کی سامراجی حکومت نے فرانس کی شہ پر خلافتِ اسلامیہ کے شہر طرابلس پر قبضہ کرلیا۔(۲)

جناب نسیم احمد ''حجاز ریلوے عثمانی ترک اور شریف مکہ'' میں لکھتے ہیں:

''سلطنت عثمانیہ کے خلاف اتحادی ممالک کے جارحانہ حملے سے
پورے عالمِ اسلام کے مسلمانوں میں بے چینی اور اضطراب پھیل گیا۔
دنیا بھر کے اسلامی خطوں میں تمام تر ہمدردیاں ترکوں کے حق میں
تھیں۔اور وہ اُن کی کامیابی کے متمنی تھے۔ہر لحظہ مقاماتِ مقدسہ حرمین
الشریفین کی طرف پھیلتی آگ کی تپش اُن کے دلوں میں نفرت کا لاوا
بھڑکا رہی تھی۔''(۳)

اِن حالات میں مسلمانانِ ہند جو خلافِ عثمانیہ سے جذباتی محبت و لگاؤ رکھتے تھے،

میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا ہونا ایک قدرتی اُمر تھا۔ابھی یہ بے چینی کم نہ ہونے پائی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی چار عیسائی ریاستوں مانٹی نیگرو، سرویا، بلغاریہ اور یونان نے یہ بہانہ تراش کر کہ سلطنتِ عثمانیہ میں عیسائیوں پر ظلم ہو رہا ہے، ترکی پر حملہ کر دیا۔ترکی کیلئے بیک وقت دو محاذوں پر لڑنا مشکل تھا۔لہٰذا ترکی نے طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر کے صلح کر لی اور ۳۰ مئی ۱۹۱۳ء کو برطانیہ کی مداخلت پر مذکورہ بالا چاروں ریاستوں اور ترکی کے درمیان جنگ بندی کا معاہدہ طے پا گیا۔یوں بلقان پر ترکوں کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

اُدھر جنگِ طرابلس اور بلقان میں ترک مسلمان بڑی بے رحمی سے شہید کیے گئے۔ اِس المناک سانحہ کی منظر کشی کرتے ہوئے مولانا محمد علی جوہر کی زیرادارت نکلنے والے اخبار ''کامریڈ'' نے ۸، فروری ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں لکھا:

''مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا۔مسلمان عورتوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا۔
اُن کے خاوندوں کو قتل کر دیا گیا۔دو لاکھ چالیس ہزار مسلمان شہید کیے
گئے۔''

ایک طرف سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف اتحادی ممالک کے صلیبی مظالم اور مقاماتِ مقدسہ کی طرف پھیلتی آگ کی تپش مسلمانانِ عالم کے دلوں کو کچوکے لگا رہی تھی۔مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف غم و غصہ پہلے سے موجود تھا پھر جب انہوں نے دیکھا کہ انگریزوں کے اشارے پر یونانیوں نے بھی سمرنا پر حملہ کر دیا ہے اور نہتے ترکوں کا قتل عام ہو رہا ہے تو اُنہیں یقین ہوگیا کہ برطانیہ اپنی مملکت کو مضبوط کرنے کیلئے انتقامی جذبے کے تحت مسلم ممالک کی آزادی سلب کر رہا ہے تاکہ وہ برِعظیم میں مزید قدم جما لے۔اُن میں یہ احساس بھی شدت اختیار کر رہا تھا کہ یورپی اقوام نے مسلمانوں کے خلاف دوبارہ صلیبی جنگوں کا آغاز کر دیا ہے۔دوسری طرف خود عیسائی دنیا کے مزموم عزائم کا اظہار کرتے ہوئے برطانوی وزیر خارجہ مسٹر اسکوئتھ کہہ رہا تھا کہ:

''ساتویں صدی سے سترھویں صدی تک مغرب کو جو صدمات اسلام
نے پہنچائے ہیں اب اُن سب کے بدلہ کا وقت ہے۔اِس لیے ایک

طرف ترکی اور دوسری طرف پرشیا (ایران) سے اسلامی طاقت کو تباہ کیا جائے گا۔"

اِس تناظر میں یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک عامی مسلمان بے چین نہ ہوتا اور اُس کا دل خون کے آنسو نہ روتا۔ چہ جائیکہ سیّد سلیمان اشرف۔ جو اِس اَمر سے بخوبی واقف تھے کہ دین اسلام تمام مسلمانوں کو تنِ واحد کے اعضا کی طرح ایسا مربوط و منظّم کرتا ہے کہ ایک عضو کی تکلیف کا اثر دوسرے اعضا پر لازمی پڑتا ہے اور اعظائے رئیسہ کے صدمے سے تمام بدن متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ اِن حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ کسی مسلمان کے دکھ، درد اور تکلیف کو اپنا دکھ، درد اور تکلیف محسوس کرنے والے سیّد سلیمان اشرف بے چین نہ ہوتے۔ اُن کا دل خون کے آنسو نہ روتا اور وہ تقریراً و تحریراً اپنے جذبات و احساسات کا اظہار نہ کرتے۔ چنانچہ آپ اِس تکلیف دہ کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے:

"جب تک رمق حیات باقی ہے۔ احساس بھی ضروری ہے۔ اور یہ اُسی احساس کا نتیجہ ہے کہ جب ایک جگہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ہوگا تو دوسری جگہوں کے مسلمان یقیناً مضطرب و بے قرار ہوجائیں گے۔ (۴)

ملتِ اسلامیہ کیلئے درد مند دل رکھنے والے سیّد سلیمان اشرف یہ کیوں کر گوارا کر لیتے کہ اِس موقع پر مہر برلب رہیں اور خاموشی اختیار کرکے اپنے دینی و ملّی فرائض اور اخلاقی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کے مرتکب ہوں۔ جبکہ آپ اِس اَمر سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ لوگ اِس وعظ و نصیحت کو ناپسند کرتے ہوئے آپ کے خلوصِ نیت پر شک کریں گے۔ اور آپ پر دشنام طرازی سے باز نہ آئیں گے۔ مگر اِس کے باوجود آپ نے اظہارِ حق سے گریز پسند نہ کیا۔ اور رخصت کے بجائے عزیمت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے اپنے دینی و ملّی اور اخلاقی فریضہ کی ادائیگی کو مقدم جانا۔ اور سلطنت عثمانیہ کی ضرورت و اہمیت اور مسلمانانِ عالم سے اُس کی نسبت و تعلق کو واضح کرتے ہوئے لکھا:

"مسلمانوں کا تعلق جو سلطنت ترکی سے ہے وہ زائد بکل و مضطر کرنے والا ہے اِس سلطنت کی مثال سر کی مثل ہے اور دیگر دول اسلامیہ مثل

دیگر اعضا و جوارح کے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے دونوں ہاتھ کٹ جائیں اور وہ زندہ رہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کسی کے دونوں پاؤں قطع ہوجائے اور وہ حیات کے ایام پورے بسر کرلے۔ لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ایک سر بُریدہ ایک لمحے کے لیے بھی زندہ کہا جاسکے یا رہ سکے۔ لہٰذا باسباب ظاہر سلطنت ترکی کا زاول اسلامی محافظ کا زوال و نیابت الٰہی کا دنیا سے فنا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ گو قدرتِ خداوندی سے یہ اَمر مستبعد نہیں کہ وہ اُن کو مٹا کر کسی اور کے ہاتھ میں اسلامی شمشیر کا قبضہ عطا فرمادے۔ وَمَاذٰلِکَ عَلَى اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ۔ ("اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں" سورہ فاطر، آیت: ۱۷) لیکن جب تک اِن کے ہاتھوں میں لوائے احمدی ہم دیکھتے ہیں ہمارا دل بے ساختہ اُس طرف کھینچ جاتا ہے اور اسلامی غیرت کشاں کشاں اُس جھنڈے کے نیچے مسلمانوں کو دامے درمے قدمے سخنے غرض کہ کسی نہ کسی طرح لے ہی آتی ہے۔" (۵)

آپ نے ۱۹۱۱ء میں شائع ہونے والی کتاب "البلاغ" میں سلطنتِ عثمانیہ کے زیروبم سے آگاہی دیتے ہوئے اُس کے عروج زوال کی داستان ہی نہیں سنائی بلکہ مسلمانانِ عالم پر ڈھائے جانے والے مظالم اور یورپی ممالک کے جبرو استبداد اور اسلام دشمنی کے اسباب وعوامل کو بھی کھول کر بیان کیا۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح فرمادیا کہ بحیثیت ایک قوم وملت ہم پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ سیّد سلیمان اشرف نے تاریخ کے اِس اہم اور نازک موڑ پر خاموشی کو قومی وملّی اور اخلاقی جرم سمجھتے ہوئے اپنے بیباکانہ مؤقف برملا اظہار کیا اور "البلاغ" میں لکھا:

"اے اہل نعمت! تمہیں تمہاری نعمتیں مبارک۔ مسکین عاشق کو تلخ گھونٹ پینے دو۔ میں خوب جانتا ہوں کہ اِس مضمون کی قوم کی نگاہوں میں اِس قدر وقعت بھی نہ ہوگی کہ ایک مرتبہ نگاہِ حقارت ہی سے سہی اِس کو دیکھا جانا نصیب ہو۔ لیکن پھر بھی میں اِس کے لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا۔

دو چیز طیرۂ عقل ست دم فروبستن
بوقت گفتن و گفتن بوقت خاموشی

اِس وقت جو اضمحلال کہ مذہب اسلام پر طاری ہے۔وہ نتیجہ ہے اسی بے موقع خموشی کا اور ثمرہ ہے بے محل تقریر کا۔احقاق حق کیلئے زمانے کا رنگ اور اہل زمانہ کا رخ ہرگز نہ دیکھنا چاہیے اور جس نے ایسا کیا اُس نے سچائی اور دیانت پر بہت ہی ظلم روا رکھا۔پس اِن حالات میں مجبور ہوکر فقیر نے بھی ایسے وقت میں خاموشی کو ایک اخلاقی جرم سمجھ کر چند سطریں لکھ کر گزارش اَمرِ واقعی کردی ہے۔اب اربابِ ایمان جو چاہیں وہ کہیں، اپنی نیت حتیٰ الامکان اخلاص پر مبنی ہے۔''(۶)

یہ درست ہے کہ زندگی میں اتار چڑھاؤ قانون فطرت جبکہ ہر حالت میں مطمئن رہنا اور ربّ تعالیٰ سے بہتری کی اُمید رکھنا مسلمان کا خاصہ ہے۔ انتہائی سنگین اور پُر خطر حالات کے باوجود ایک مسلمان ہمیشہ نوید اور اُمید کا دامن تھامے رہتا ہے اور اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتا۔کیوں کہ مایوسی اور نا اُمیدی کا اسیر بن جانا مسلمان کا کام نہیں۔

یہ جوہر سیّد سلیمان اشرف کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھا۔آپ کسی حال میں بھی مایوس ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔چنانچہ اُمت مسلمہ کی پژمردگی اور خستہ حالی کے باجود اُمید کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے پُر امید رہتے ہوئے کہ وہ قادر مطلق ہے کسی لمحہ بھی حالات بدل سکتا ہے، کسی لمحہ بھی سوئے ہوئے مردہ قلوب کو ایمان کے نور سے منور کرکے بیداری کے اسباب پیدا کرسکتا ہے، لہٰذا مایوس نہیں ہونا چاہیے۔آپ لکھتے ہیں:

''اگرچہ روح اسلامی ہمارے شامتِ اعمال کی بدولت نیم جاں ہوکر پژمردہ وافسردہ ہوگئی ہے لیکن پھر بھی آخری سانس باقی ہے اسی سے اُمید ہے کہ شاید کسی دلسوز کا نعرۂ اللہ اکبر پھر اِن نام نہاد زندوں میں ایک حیاتِ ایمانی پیدا کردے۔اور ایک زندہ کروڑوں مسلمانوں کو اِس بے حیا موت سے نجات دلاکر اسلامی زندگی کے لطف سے آشنا کردے۔''(۷)

مسلمان ایک جسد واحد کی مانند ہیں

دین اسلام رنگ ونسل، ذات پات اورلسانی وعلاقائی تعصبات سے پاک ہے۔اسلام وہ دین ہے جو امن وسکون، اخوت ومساوات، اتفاق واتحاد اور بھائی چارہ کا درس دیتا ہے۔حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے کہ''مسلمان کی مثال ایک جسد واحد کی ہے۔اگر جسم کے کسی حصے میں تکلیف ہوتو اُس تکلیف کی وجہ سے پورا جسم متاثر ہوتا ہے۔''بقول علامہ اقبالؒ۔

اخوت اِس کو کہتے ہیں چبھے کانٹا جو کابل میں
تو ہندوستان کا ہر پیرو جواں بیتاب ہو جائے

اِس مقام پر یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دو احادیث مبارکہ پوری دنیا کو دو اقوام میں تقسیم کرتی ہیں۔ایک''الکفر ملة واحده'' پورا کفر ایک قوم ہے''اور دوسرا آپ ﷺ نے مسلمانوں کے بارے میں ایک لفظ استعمال فرمایا''جسدِ واحد''یعنی ایک جسم۔ ایک ایسا جسم جس کا تمام نظام مربوط ہوتا ہے، ایک اعصابی نظام، ایک انہضام، ایک دل، ایک دماغ۔ اِس جسد واحد یا ایک جسم کے دو دماغ نہیں ہوسکتے۔

اِس تصور کی نفی کرنے اور اِس جسد واحد کو توڑنے کیلئے ہی دنیا میں قومی ریاستیں وجود میں لائی گئیں اور نظام خلافت کا خاتمہ کیا گیا۔تاکہ مرکزیت ختم ہوجائے۔لیکن مسلمان دنیا کی وہ واحد قوم ہے جو اِن ریاستوں کی جغرافیائی سرحدوں کو پامال کرتے ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کی مدد کیلئے نکلتی ہے۔

چنانچہ اِس اتحاد واخوت اور باہمی ہمدردی وتعلق کے اسلامی جذبے کو ختم کرنے کیلئے اُمت کے تصور کی نفی کی جاتی ہے۔لہٰذا آپ اِسی اسلامی فکر کی روشنی میں اُمت کا تصور واضح کرتے ہیں جو دوقومی نظریے کی بنیادی اساس ہے۔سیّد سلیمان اشرف لکھتے ہیں:

''ایران وترکی پر جو موت لائی جارہی ہے اُس سے اگر مسلمانوں میں بے قراری واضطراب پیدا ہوتو یہ موجب تعجب نہیں۔اِس لیے کہ اسلام نے جس ہمدردی ورافت ورحمت کا سبق مسلمانوں کو پڑھایا ہے وہ اُن کے قلوب سے محو ہونہیں سکتا۔کتے اور بلی کی تکلیف سے بھی اُن کا دل بلبلا

اٹھتا ہے چہ جائیکہ انسان اور پھر انسانوں میں اُن کے دینی بھائی، جن کے باب میں حدیث یوں ارشاد فرمائے۔ تمام مؤمنین کی مثال ایک شخص واحد جیسی ہے، جب کہ اُس کی آنکھ دکھتی ہے تو تمام جسم دردمند ہو جاتا ہے اور جب سر میں درد اٹھتا ہے تو سارا بدن آزار مند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں کے کانوں میں یہ صدا پہنچی کہ ایران میں بھائی روسیوں کے بے رحم خنجروں سے شہید ہوئے تو وہ اپنے بستروں پر تڑپ جاتے ہیں۔ جب یہ خبر ملتی ہے کہ عربوں کے خون سے طرابلس کی زمین لالہ زار بن گئی تو اُن کے قلوب سینے میں خون ہو کر بہنے لگتے ہیں۔ اِس لیے مسلمانوں کے افراد کا مجموعہ بہ منزلہ شخص واحد کے ہے گو اجسام متعدد ہیں مگر روح سب میں ایک ہی ہے اور یہ وہی روح ہے جسے آج سے تیرہ سو برس پیشتر اُمی رُوحی فداہ نے مکے کے ریگستانوں اور طیبہ کی وادیوں میں بیٹھ کر۔ لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر پھونکی تھی۔"(۸)

یورپی جبر واستبداد اور مظالم کی وجوہات

یورپی ممالک کے مسلمانوں پر ظلم وستم اور مظالم کی بنیادی وجہ مسلمانوں کی تعلیمات اسلامی سے اعراض اور دین سے دوری تھی۔ علامہ اقبالؒ نے اُمت کی اِس حالت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمت خرافات میں کھو گئی

دراصل اسلام دشمن طاقتوں کا اصل مقصد بھی یہی تھا کہ مسلمانوں کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات مبارکہ کی والہانہ محبت سے دور کر کے حبِ دنیا میں ایسا مشغول کر دیا جائے کہ اُن پر غلبہ پانا آسان رہے۔

سیّد سلیمان اشرف اسلام دشمن طاقتوں کے اِن حربوں کا باریک بینی سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے درد سے لبریز دل رکھنے والے سلیمان اشرف ملتِ اسلامیہ کو اِس

کے اثرات وعوامل سے بچانا اور مسلمانانِ ہند کو زبوں حالی اور ذلت وپستی کی گہرائیوں سے نکالنا چاہتے تھے۔

ایک سچے مومن اور عاشق رسول ﷺ سیّد سلیمان اشرف کا دل وضمیر اُمت کے دکھ درد اور تکلیف سے زخمی تھا۔ اور فہم وآگہی کے بعد خاموش رہنا آپ کیلئے ایک اَمر محال تھا۔ چنانچہ اِس موقع پر آپ نے اُن کے جبر واستبداد اور انسانیت سوز مظالم کے بنیادی سبب سے نہ صرف آگاہی دی بلکہ اُن کی اسلام اور مسلمان دشمن چالوں اور نفسیاتی حربوں کو بھی منکشف کرتے ہوئے "البلاغ" میں لکھا:

"مسلمانوں کو ایک مدت ہوئی کہ تعلیماتِ اسلامی سے کہیں دور جا پڑے۔ ایک حیوانی و لایعنی زندگی میں مصروف ہیں۔ انسانی زندگی اُن سے ایسی گم ہوئی ہے کہ اب پھر ملنے کی اُس کے کوئی اُمید نہیں رہی۔ الحاد و دہریت کی ہر آن فراوانی ہے اور یورپ کی محبت میں بے ہوشی و مدہوشی۔ جس کے باعث سطح ہستی سے ہر آن ایک درجہ نیستی کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ دوستو! ہوشیار ہو جاؤ اور اپنی ذمہ داریوں کو سمجھو۔ اسلام ایک امانت الٰہی ہے اور تم اِس کے امین۔ خدا نے تمہیں اِس امانت کی قدر سمجھنے کو عقل دی ہے۔ فہم وفراست عطا فرمائی ہے۔ پھر دین سے بے پروائی کی کیا وجہ۔ اِس وقت تمام بلادِ اسلامیہ پر جو ستم و جفا کے بادل ٹوٹ پڑے ہیں وہ صرف اِس علت میں کہ مسلمان لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کیوں کہتے ہیں۔ نہایت ہی حسرت وافسوس کی بات ہوگی کہ جس جرم میں دنیا ہمیں مٹا رہی ہو، اُس کی لذت سے ہم نا آشنا رہ جائیں۔ اور خَسِرَ الدُّنیاَ وَالاٰخِرَۃَ کے مصداق ہوں۔"(۹)

ایک کلمہ گو مسلمان کا فرضِ منصبی

سیّد سلیمان اشرف خوابِ غفلت میں مبتلا اسلامیانِ ہند کو جھنجوڑ کر فکر وتدبر کی راہ دکھاتے ہیں اور ایک کلمہ گو مسلمان کو اُس کا فرضِ منصبی یاد دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے اِس وقت مسلمانوں کو صرف اِس اَمر کی طرف توجہ دلانی مقصود ہے کہ بعد اِس کے کہ کسی شخص نے کلمۂ شہادت کی تصدیق دل سے اور اقرار زبان سے کرلیا ،اُس پر یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اِس تصدیق کے آثار اُس کے اقوال وافعال سے صادر ہوا کریں۔اور اگر کوئی موقع ایسا پیش آجائے کہ جو اظہار کا مزاحم ہو تو اُسے دفع کرے۔ مزاحمتوں کی کشاکش سے دست وگریباں ہونا ایک بہت معرکتہ الآراء اَمر ہے۔ اِس لیے اسلام نے مذہب کا بازو سیاست سے قوی کردیا۔ تا کہ مذہبی تبلیغ وترغیب واظہار میں اگر کچھ رکاوٹ پیدا ہوجائے۔تو زور سیاست اُسے محو کان لم یکن(جیسے کچھ ہوہی نہ) کردے۔''(۱۰)

گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجلس الاماں

آپ بعض سطحی خیال لیڈروں کے اِس طرز عمل کو بھی غلط قرار دیتے ہیں جو عالم اسلام کے مظلوم مسلمانوں کیلئے جلسے جلوس، گرما گرم تقریریں اور قرار دادیں منظور کراکے یا اُن کی مدد واعانت کیلئے چندہ جمع کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ فرض ادا ہوگیا۔ یا پھر یہ کہ قومی جذبات کے فروغ واحیا میں فرائض وواجبات کا ترک ہوجانا کوئی گناہ نہیں۔یعنی

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب

سیّد سلیمان اشرف اِس فکری کجی کی نفی کرتے ہیں اور مسلمانوں کو باعملی اختیار کرنے پر زور دیتے ہوئے سیاسی وملّی جذبوں کے فرق کو یوں واضح کرتے ہیں:

''بعض سطحی خیال کے اشخاص یہ خیال کرنے لگے کہ اگر چہ اِس جماعت میں نماز روزہ و دیگر اعمال کا فقدان پایا جاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ جذبات قومی تو اُن میں زندہ ہوگئے ۔اب قوم کے مردہ دلوں کو زندہ کرلیں گے۔لیکن دوستو۔یہ سخت مغالطہ ہے جذبہ سیاسی اور ہے اور جذبہ ملّی اور۔ملکی حقوق کا طلب کرنا اور مالی نقصان یا جاہ کی کمی سے بلبلا

اٹھنا ایک اَمر آخر ہے اور اسلامی شعار کو مٹتے دیکھ کر خصائص اسلامیہ کو تباہی میں مبتلا پا کر بیکل ہوجانا کچھ اور ہی چیز ہے ......ہم جبکہ تعلیم یورپ کے بدولت نہ صرف کتاب اللہ سے بے خبر اپنے پیغمبر کے احوال وفضائل سے لاعلم ،مذہبی اُمور سے نا آشنا بلکہ گریزاں ہوں۔ تو پھر کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا جذبہ قومی ہے۔''(۱۱)

دراصل سیّد سلیمان اشرف نے اپنے افکار کی بنیاد قرآن اور صاحب قرآن کو بنایا اور اُمت مسلمہ کو یہ احساس دلایا کہ

عشق ختم الانبیاء ترا اگر سامان ہو
زندگی کا ہر سفر تیرے لیے آسان ہے

سیّد سلیمان اشرف کا نظریہ دین وسیاست

اِسی طرح سیّد سلیمان اشرف مروجہ دنیاوی سیاست جو جھوٹ ،فریب اور مکرودجل پر مبنی ہے کے سخت خلاف تھے۔آپ کے نزدیک یہ وہ دھوکہ تھا جسے انسانی حقوق آزادیٔ اظہار اورعوام کی حکمرانی جیسے خوبصورت تصورات کا لبادہ اوڑھا کر پیش کیا گیا تھا۔اورجس کو آزادی کی نیلم پری قرار دیتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

دراصل سیّد سلیمان اشرف اُس پاکیزہ اسلامی سیاست کے حامی اور علمبردار تھے جس کا مقصد صرف مذہبی وروحانی اقدار کا فروغ وقیام نہیں بلکہ ظلم واستحصال کی ہر شکل کے خاتمہ، فتنہ وفساد کی سرکوبی اور ایک ایسی ریاست کا قیام ہے جس کی:

''اسلامی سیاست قوانین الٰہی کی محکوم ہے(جس میں رہنے والے) ایک مسلمان کی تلوار خدا کے حکم سے اٹھتی ہے اور اُسی کے حکم سے نیام میں جاتی ہے۔''(۱۲)

سیّد سلیمان اشرف دین اور سیاست میں تفریق کے قائل نہیں۔ اُن کے نزدیک

سیاست دین کا حصہ اور ایک لازمی جز ہے۔جس کا اظہار کرتے ہوئے آپ ''النور'' صفحہ ۱۶۹۔۱۶۸، پر لکھتے ہیں:

''نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ﷺ کی ذات کو حق سبحانہٗ نے خاتم النبین فرما کر ہمیشہ کیلئے نبوۃ کا دروازہ بند فرمادیا اب محالِ قطعی ہے کہ کوئی دوسرا نبی یا رسول ہو اِسی طرح شریعت محمدی ﷺ کو خاتم الشرائع اور ہر پہلو سے کامل وتمام فرما کر اِس سے آگاہ کردیا کہ قیامت تک یہی شریعت قائم رہے گی کسی نئی شریعت کا نزول نہ ہوگا۔پس ایک ایسی شریعت جسے قیامت تک دنیا میں قائم رکھنا تھا اُس کے لیے اِس کی ضرورت تھی کہ اِس خاکدانِ عالم میں جہاں فرزند آدم بستے ہیں نہ کہ ملک وفرشتہ،اِس کی حفاظت اِس طرح کی جائے کہ مذہب کا بازو سیاست سے قوی کردیا جائے۔''

علامہ اقبالؒ اِس تصور کو شعری جامہ پہناتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

آپ طاقت کے بغیر دین کو محض ایک ایسا نظریہ اور فلسفہ سمجھتے ہیں، جسے عملاً نافذ نہیں کیا جاسکتا۔دین کے عملی نفاذ کیلئے آپ کے نزدیک قوتِ نافذہ کا حصول ضروری تھا۔یہی وہ بنیادی کلیہ ہے جو دنیا بھر میں اُمت مسلمہ سلامتی کا ضامن ہے۔چنانچہ آپ ملتِ اسلامیہ کو اُن کے تحفظ وبقاء اور امن وسلامتی کے اِس اصول سے آگاہی دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو مذہب اپنی حفاظت نہیں کرسکتا اور اپنی مامون زندگی کیلئے طاقت روانہیں رکھ سکتا ہے اُس کا وجود محالاتِ عادلہ میں سے ہے اور وہ ایک فلسفۂ خیالی سے زائد مرتبہ نہیں رکھتا۔وہ ہاتھ جس میں اخلاق حسنہ کی کتاب ہو نہایت ہی مقدس و واجب التعظیم ہے۔اُس ہاتھ کو بوسہ دیجئے،آنکھوں پر رکھیئے۔لیکن سلامت وہی ہاتھ رہ سکتا ہے جس میں

خونچکاں شمشیر کا قبضہ دکھائی دے۔''(۱۳)

ڈاکٹر وحید عشرت(سابق ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان وریسرچ آفیسر ومدیر معارف اقبال،شعبہ اقبالیات اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب،لاہور) سیّد سلیمان اشرف کی کتاب ''البلاغ'' طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''غالباً علامہ اقبالؒ نے یہ قول سیّد سلیمان اشرف سے ہی لیا ہوگا کہ طاقت کے بغیر دین محض ایک نظریہ یا فلسفہ ہے.....حضرت علامہ محمد اقبالؒ نے یہ جو فرمایا ہے کہ۔

قوموں کیلئے موت ہے مرکز سے جدائی!
ہو صاحبِ مرکز تو خودی کیا ہے خدائی!

ایسے ہی خیالات سیّد سلیمان اشرف کے بھی ہیں.....علامہ اقبالؒ کے افکار سیّد سلیمان اشرف سے کتنے ہم آہنگ ہیں اِس میں کوئی کلام نہیں علامہ بھی مسلمانوں کو سُوئے حرم لے جانے کا داعیہ رکھتے ہیں اور حضرت محمد ﷺ سے وفا کو لوح وقلم کا مالک گردانتے ہیں۔''

ذرا غور کیجئے کہ ''البلاغ'' کے مندرجہ بالا اقتباسات کتنی وضاحت کے ساتھ بیان کررہے کہ اسلام اور عالم اسلام کے خلاف طاغوتی یلغار کے وقت مصلحت آمیز اور ملت گریز رویہ قابل ملامت ہی نہیں ایک اخلاقی جرم بھی ہے۔سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک ایسے وقت میں ہر کلمہ گو مسلمان پر قولاً وفعلاً مزاحمت فرض ہوجاتی ہے۔

چنانچہ آپ اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے مسلمانوں میں اعلائے کلمۃ الحق کی بلندی کا احساس جگاتے ہیں اور سیاست کو مذہب کا ایک مضبوط وتوانا بازو قرار دیتے ہوئے دین سے جدا سمجھنے کے باطل تصور کی بھی نفی کرتے ہیں۔آپ اِس بات پر کف افسوس ملتے ہیں کہ احکامِ شرعیہ سے ناواقف لوگ اُسے سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کرتے اور:

''بر بنائے جہل مرکب یہ کہہ دیتے ہیں کہ اسلام صرف تزکیہ نفس سکھلاتا ہے باقی اُسے دنیاوی اُمور میں کوئی دخل نہیں۔اِس تیرہ صدی

میں جبکہ الحاد و جہل کی گھٹا مسلمانوں پر اُن کی بدنصیبی کی طرح چھائی ہوئی ہے۔اِس طرح کی آوازیں اور بھی اسلام سے بے پروا کرنے والی ہیں۔لہٰذا یہ بتادینا کہ اسلام ہی ہے جس نے تمدن و سیاست و حرب تمام دنیا کو سکھلایا۔ایک نہایت ضروری بات ہے۔''(۱۴)

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک دینِ اسلام علمائے اسلام کو لوگوں پر حکومت اور سیاست کا پورا پورا حق دیتا ہے اور مسندِ ارشاد پر فائز اہلِ علم اور فقہاء اسلام کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کے قومی، ملکی اور سیاسی معاملات کی قیادت کریں تاکہ عوام کے اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں بالفعل قانون کی عمل داری قائم ہوسکے۔اور معاشرے میں امن وسکون اور اخوت و مساوات کا دور دورہ ہوسکے۔

ملتِ اسلامیہ کا ایک ہمدرد و غمخوار مفکر

سیّد سلیمان اشرف کی زندگی کا ایک قیمتی اور روشن پہلو ملتِ اسلامیہ کیلئے دردمند دل رکھنے والے ہمدرد و غم خوار مفکر کا بھی ہے۔اُن کا سینہ اُمتِ مسلمہ کی زبوں حالی سے آزردہ اور آنکھیں زوالِ اُمت پر اشکبار ہیں۔سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ پستی اور تنزلی کی دیگر وجوہات میں سے ایک اہم وجہ سیاسی معاملات سے دوری اور لاتعلقی بھی ہے۔چنانچہ آپ مسلمانوں کے قومی و ملّی انحطاط اور سیاسی زوال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب سیاست سے ملت کا اثر کم ہوگیا تو بعض اہم اُصول جو مذہب نے بقائے وجود کیلئے ہمیں سکھائے تھے ہمارے ہاتھوں سے ایسے کھوگئے کہ پھر نہ ملے۔''(۱۵) یہی وجہ ہے کہ آج ہم پر ''یہ وقت آپہنچا ہے کہ اٹلی جیسی بزدل قوم مسلمانوں کو یہ دھمکی دے کہ طرابلس سے دست بردار ہوجاو۔ورنہ خانہ کعبہ اور روضہ رسول ﷺ پر گولہ باری کرونگا۔خاکش بدہن۔یہ تو اُس کی جرأت و بیباکی۔اور ہماری بے شرمی و بے حسی۔یہ کہ اُس صدا کو نغمہ دلفریب سمجھا۔غیرت اسلامی وحمیت ایمانی بس اِس

قدر تھی کہ دومنٹ کیلئے غافل قلب وآلودہ زبان سے دست بدعا ہوگئی اور اسلام پر اپنے پندار میں کچھ احسان و کرم کرلیا۔آہ! ایک ہمارے اسلاف تھے جنھوں نے اسلام کی ایک ایک ادا پر اپنی بے شمار قیمتی جانیں قربان کرکے اُس کی عظمت وعزت کو قائم رکھا......اور خود اسلام پر سے نثار ہوکر آئندہ آنے والی نسلوں کو ایک بلیغ سبق دے کر جہاں کیلئے پیدا کیے گئے تھے یہ کہتے ہوئے وہاں چل بسے۔

جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

(اور آج ایک ہم ہیں) اگر اُن کی عزت وحمیت کا جوش و حیا سے مقابلہ کریں تو شاید اِس قدر ہم بے حیا و بزدل ثابت ہونگے کہ بے حیائی اور جبن (نامردی، بزدلی اور کم ہمتی) کو بھی ہم سے ندامت آئے گی۔''(۱۶)

سیّد سلیمان اشرف کی ملت سے ہمدردی اور عملی حقیقت پسندی کا اندازہ اِس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُنہوں نے برسوں پہلے جب سلطنتِ عثمانیہ کوئی دم کی مہمان تھی اور مسلمان شدید مضطرب و بے چین تھے،لکھا اور مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر جگانے کی کوشش کی، کہ ہم اب بھی نہ جاگے اور ترکوں کی اصلاح نہ کی گئی یا ترکوں نے اپنے طور طریقے اور انداز نہ بدلے تو عنقریب خلافتِ عثمانیہ کا زوال ہوجائے گا، جس کے نتیجے میں پورا عالم اسلام ایک ناقابل تصور بحران سے دوچار ہوجائے گا، پھر مسلمانوں کو کفِ افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔حالانکہ اُس وقت سیاسی قیادتیں اسلام کے نام پر خودفریبی میں مبتلا تھیں لیکن سیّد سلیمان اشرف سلطنتِ عثمانیہ کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوئے لکھ رہے تھے:

''سلطنتِ ترکی کی یہ چند خرابیاں سیاسی و مذہبی اِس وجہ سے...... لکھی گئیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ سلطنتِ ترکی سے دل سوزی و ہمدردی و معاونت کرنے کیلئے جو کہہ رہا ہے وہ ترکوں کے احوال سے محض ناواقف نہیں اور اُس کی ہمدردی عدم واقفیت کے باعث نہیں۔بلکہ وہ بہت کچھ جانتا ہے اور اُس

کے علم کے ذرائع زائد قابلِ وثوق ہیں۔"(۱۷)

آپ ترکی سے محبت، اخوت اور برادرانہ جذبہ اسلامی کی مثال دیتے ہوئے واضح کرتے ہیں:

"اگر آپ کا بھائی یا فرزند مریض ہو اور امتدادِ مرض نے اُسے بد پرہیز بھی کر دیا ہو طبیب کی ہدایت پر کار بند نہ ہوتا ہو تو آپ ایسی صورت میں اپنے اُس لختِ جگر فرزند یا قوتِ بازو بھائی کو نصیحت فرمائیں گے۔ اور خود اُس کے پرہیز و دوا میں زائد سرگرم ہوں گے یا زہر کا پیالہ پلا دیں گے۔ اگر کسی باپ نے اپنے بیٹے کو یا بھائی نے اپنے بھائی کو اُس کے مرض یا بد پرہیزی سے خفا ہو کر زہر پلا دیا ہے تو آپ بھی سلطنتِ ترکی کو عیسائیوں کے تسلط وتخریب کا زہر ہلاہل پلا دیجئے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی اسلام کا درد ہوگا وہ ایسے بارِ عذران کے سبب ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے تباہی اسلام کا تماشا دیکھتا رہ جائے۔ جس دل میں خدائے واحد قہار کا خوف اور اُس اُمت نواز پیغمبر ﷺ کی محبت ہے اُسے سکون واطمینان کیوں کر ہوگا۔ جن میں کچھ بھی حیا وغیرت ہوگی وہ اِن واقعاتِ ہائلہ سے کیوں کر بیداری حاصل نہ کریں گے۔"(۱۸)

ذرا سیّد سلیمان اشرف کے جملوں پر غور کیجئے۔ اُن کے کرب واذیت کو سامنے رکھیے اور غور کیجئے تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ وہ کس درد میں مبتلا اور بے چین ہیں۔ اور کیوں متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اگر بفرضِ محال اِس وقت بھی مسلمانوں نے اپنے آپ کو نہ سنبھالا تو پھر کوئی اُمید اُن سے نہیں کی جاسکتی۔ آج سے پیشتر جس قدر محاربات وقوع میں آیا کیے اُن میں کوئی ایسا نہ تھا جس کا نتیجہ اس قدر ہیبت ناک ہوتا۔"(۱۹)

آپ اپنی قلبی کیفیت کا اظہار کرنے کے بعد ایک پانچ نکاتی لائحہ عمل بھی پیش کرتے ہیں جو اِس بات کا گواہ ہے کہ اُن کے پاس جوش ہی جوش اور درد ہی درد نہ تھا، مرض کا علاج اور مریض کی جان بچانے کا ٹھوس اور عملی منصوبہ بھی تھا۔ آپ لکھتے ہیں:

"یہ سلطنت اسلامی اُس وقت سے مٹ رہی ہے جب کہ عام طور سے مسلمانوں سے تدین رخصت ہو چکا ہے اور کوئی طاقت کسی قسم کی کہیں بھی مضبوط نہیں رہی ہے۔ پس ہم کو بہت جلد اپنے فرائض کو نہایت سرگرمی سے سرانجام دینا چاہیے۔ اِس وقت پانچ اُمور پیش نظر ہیں۔ مصلحین اُمت غور فرمائیں اور کار بند ہونے کی کوشش کریں۔ ا۔ بہت ضروری اَمر ہے کہ عرب کی قوم اِس وقت بیدار کی جائے۔ ۲۔ قومیں مٹی سے سونا پیدا کررہی ہیں ہم اشرفیوں کو خاک میں ملا رہے ہیں۔ ایام حج میں حجاج جو قربانیاں کرتے ہیں اُن کا کوئی مصرف بجز اِس کے نہیں ہوتا کہ مذبوح جانور خاک میں دفن کر دیئے جائیں ...... کاش مسلمانوں کی ایک جماعت سلطان سے اجازت طلب کر کے وہاں کسی مناسب مقام پر ایک کارخانہ جاری کرے جس میں یہ تمام مذبوح جانور پہنچ جائیں اور اِن کے گوشت کو خشک کر کے ڈبوں میں بند کیا جائے اور چمڑے کی دباغت کر کے چرمی اشیاء تیار کی جائیں ...... اِس طرح کروڑوں روپے کی آمدنی ہوجاتی ہے۔ اگر دوسرے ملک کا باشندہ اِس کام کو انجام نہیں دے سکتا یا ازروئے شریعت اِس سے نفع نہیں اٹھا سکتا تو خود سلطان کو اِس کی طرف توجہ دلائی جائے تا کہ وہ ایسا انتظام کر کے اِس آمدنی سے مدارس دینی اپنے تمام حدودِ سلطنت میں قائم کریں۔

۳۔ ایام حج جس میں تقریباً ہر ملک کے مسلمان جمع ہوتے ہیں..... کوئی عام تحریک وہاں ایسی نہیں کی جاتی جس سے مسلمانوں کو دین کے ساتھ شفقت پیدا ہو اور اُن کے ایمانی جذبات کو حرکت۔ یہ عظیم الشان مجمع

وہاں سے کھجوریں و تسبیح و مسواک لے کر واپس آتا ہے...... حالانکہ اِس جمعیت میں جو نکتہ سیاسی مضمر ہے اُسے اربابِ فہم و ذکا خوب سمجھتے ہیں۔ لہٰذا علماء ومشائخ کا یہ فرض ہے کہ اُس جگہ جو کہ مرکز اسلام ہے اور جہاں سے اسلام کا دریا رواں ہوا ہے۔ ایام حج میں حمیتِ اسلامی کا ایسا جوش وہاں پر پھیلائیں کہ غفلت وہواوس کے وسوسے بجھ کر خاک ہوجائیں اور حجاج کا ظاہر وباطن للّٰہیت و اتباع سنت سے آراستہ ہو جائے کہ وطن پہنچ کر اُن کی صوری ومعنوی یک رنگی دیگر ابنائے وطن کو بھی اُسی توحید کے رنگ میں رنگ ڈالے۔

۴۔ ہر مسلمان اپنی آمدنی کا ایک سہل حصہ سالانہ خدماتِ اسلامی کیلئے نکالا کرے اور ایک جگہ تجویز کر لی جائے جہاں سب کے مرسلہ روپے جمع ہوا کریں۔ پھر ایک جماعت ذمہ دار اُمنا کی مقرر کی جائے اور اُس روپے میں سے ایک معینہ رقم سالانہ سلطان کی خدمت میں مصارف حرمین کیلئے بھیجی جائے تا کہ سلطان کو کسی قدر مصارف حرمین سے فراغ ہو اور وہ اپنے محاصل کو اپنے سیاسی و ملکی ضرورتوں میں صرف کر سکیں۔ اِس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ہر چھوٹی سی چھوٹی ضرورت کے وقت مسلمانوں کو ملک کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی حاجت ہوتی اُس میں بہت کچھ کمی ہو جائے گی۔

۵۔ پانچویں بات سب سے زائد قابلِ لحاظ ہے۔ وہ ہر بلاد کے مسلمانوں کی دین دارانہ زندگی ہے۔ اِس کیلئے علما کا ایک مضبوط تعلق قائم ہونا چاہیے جس طرح سلاطین کے سفرا ایک دوسرے کی سلطنتوں میں مقیم رہا کرتے ہیں اُسی طرح چند علماء جو شیخ الاسلام کے نائب ہوں ہندو افغانستان وغیرہ میں اقامت اختیار کر لیں تا کہ باہمی جمعیت و مشورہ سے دین داری کا اثر مسلمانوں میں پیدا کر لیں۔'' (۲۰)

عظمتِ رفتہ کے حصول کا لائحہ عمل

اِن حالات میں سیّد سلیمان اشرف مسلمانوں کو احساسِ ذمہ داری یاد دلاتے ہیں۔ خوابِ غفلت سے جھنجھوڑتے ہیں اور ذلت وپستی سے نکلنے اور کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کے حصول کا لائحہ عمل دیتے ہوئے ''البلاغ'' میں لکھتے ہیں:

''اِس مہیب اور وحشت ناک زمانے میں جبکہ تمہاری ایک بیمار سلطنت جسے خلافت کا منفرد لقب حاصل ہے......اُس کا تمام افق پُر آشوب و گرد آلود ہو رہا ہے۔ کیا اِس وقت بھی تم اسی خوابِ خرگوش میں پڑے سوتے رہو گے۔ کیا اب بھی اپنی حالت نہ سنبھالو گے...... مسلمانوں خدا کا کلام تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا عملی نمونہ تمہارے پیشِ نظر ہے۔ پھر تمہیں کیا ڈر ہے۔ اُس کو پڑھو اور اپنی حالت سنبھالو...... صدقِ دل سے توبہ کرو...... اور اُس کی رحمت کو اپنے اعمالِ حسنہ سے اپنی جانب متوجہ کرو...... اگر ہم میں تقویٰ وخشیت ایزدی پیدا ہوجائے تو آج پھر ہماری وہی ہیبت، وہی دبدبہ دنیا ماننے لگے جو کبھی تسلیم کی جاتی تھی۔'' (۲۱)

اقبالؒ نے اِس خیال کو شعری جامہ پہناتے ہوئے خوب فرمایا۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا شجاعت کا امامت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک اسلام اور عالم اسلام کے تحفظ و بقاء کیلئے ایک مرکز کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اِس تناظر میں آپ اُمتِ مسلمہ کو مکہ معظّمہ، مدینہ طیبہ اور ذات رسالت مآب ﷺ کی جانب متوجہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلام کے محفوظ و مامون رہنے کا ایک بڑا اصل یہ قرار دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز ہونا چاہیے اور اُس مرکز کا کوئی محافظ۔ چنانچہ مکہ معظمہ یعنی بیت اللہ اور مدینہ طیبہ یعنی حرم رسول اللہ تمامی دنیائے اسلامیہ

کے مرکز قرار دیئے گئے ۔ اور ذاتِ بابرکات آنحضرت ﷺ اِن دونوں جگہوں کی محافظ۔اور مسلمانوں کی ہر طرح کی حاجتوں کا ماواو ملجا۔'' (۲۲)

سیّد سلیمان اشرف کی بیان کردہ اِس ابدی حقیقت کو سمجھنے کیلئے تاریخ اسلام کے اوراق پر نظر ڈالیے تو دکھائی دے گا کہ قومیں اور ملتیں اُس وقت تک زندہ رہیں جب تک کہ وہ دہلیز مصطفیٰ ﷺ کی دریوزہ گری کرتی رہیں اور جب وہ بدبختی کی وجہ سے درِ مصطفیٰ ﷺ سے بے نیاز ہوگئیں تو گردش لیل ونہار نے انہیں نظر انداز کر کے قعر مذلت میں دھکیل دیا اور پھر سے بولہبی اُن کا مقدر بن گئی۔

یہی وہ تصور ہے جسے سامنے رکھ کر اقبالؒ مردِ مومن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنی ہستی کو ذاتِ مصطفیٰ ﷺ میں اِس طرح فنا کر دے کہ نہ تو تیرا انفرادی تشخص نسبت مصطفیٰ ﷺ کے بغیر باقی رہے اور نہ ہی تیرا قومی وملی امتیاز۔ تو جہاں کہیں بھی جائے غلامیٔ مصطفیٰ ﷺ کے حوالے سے پہچانا جائے۔ کیونکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ نہ صرف فرد کا امتیاز و انفرادی وجود بلکہ قوموں کا جداگانہ تشخص بھی نسبتِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستگی کا مرہون منت ہے اور اگر وہ اِس سے مستغنی و بیگانہ ہونے کی کوشش کریں گے تو پھر اُن کی بقاء مبدل بہ فنا ہو جائے گی۔

تاشعارِ مصطفیٰ از دست رفت
قوم را رمز بقاء از دست رفت

جداگانہ قومیت کا احساس دوقومی نظریہ کی اساس

سیّد سلیمان اشرف مسلمانوں کے درمیان اندرونی اختلافات کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔اور اِس بات کو انتہائی معیوب خیال کرتے ہیں کہ مسلمان استعمار کے ہاتھوں میں کھلونا بنیں۔ اُن کا ماننا تھا کہ جب مسلمانوں کی طاقت کو ضعف واضمحلال نے آلیا تو استعمار کو در اندازی کا موقع ملا۔لہٰذا اِس کمزوری کو دور کرنے کیلئے آپ مسلمانوں کو آپس کی باہمی رنجشیں اور کدورتیں مٹا کر بنیان مرصوص ''اُمت واحدہ'' بننے کا مشورہ دیتے ہیں۔

آپ اُس وقت اُن میں مسلم قومیت یعنی ''دوقومی نظریہ'' کا احساس جگاتے ہیں

جب ہندوؤں کے مطالبہ پر ۱۲، دسمبر ۱۹۱۱ کو شاہ جارج پنجم کی دہلی میں رسم تاج پوشی کے موقع پر تقسیم بنگال (جو اسلامیان ہند کیلئے نعمتِ غیر مترقبہ کا درجہ رکھتی تھی اور ہندوؤں کی بالادستی کا خاتمہ کرتی تھی) کی منسوخی کا اعلان ہو چکا تھا۔اور مسلمانان ہند اپنے سیاسی مستقبل کے حوالے سے شدید مایوس وفکرمند تھے۔

اُس وقت ہمیں سیّد سلیمان اشرف کا وہ جراُت مندانہ آہنگ سنائی دیتا ہے، جس میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کا تحفظ، حصول کا اُصول اور بقا کی ضمانت کی شامل ہوتی ہے۔ آپ مسلمانانِ ہند میں مسلم قومیت کا جذبہ بیدار کرتے ہیں اور انہیں اپنی جداگانہ قومیت کے اُصول کے تحت ایک منظم جدوجہد اختیار کرنے کا راستہ دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوستو سنو! ہماری قومیت کی حالت تمام دیگر اقوام سے جدا اور سب سے زیادہ محبوب ودلکش ہے۔نگاہ اٹھاؤ اور اکناف عالم پر غور کرو تو کہیں ہم وطنی ایک کو دوسرے کا ہم قوم بناتی ہے۔کہیں اتحاد زبان، کہیں یک رنگی شکل وصورت ۔ پھر باوجود ہم قوم ہونے کے تم دیگر اقوام میں متمول کو غیر متمول سے، اعلیٰ کو ادنیٰ سے ایسا برتاؤ کرتے ہوئے پاؤ گے جس سے ہم قومی کو ننگ و عار آتا ہوگا۔لیکن ہم مسلمانوں کی قومیت مذہب اور صرف مذہب سے ہے۔ ہماری قومیت کی بقاء اسلام وایمان سے قائم ودائم ہے۔جس قدر قوتِ ایمانی وجذباتِ اسلامی میں ہم مضبوط ہونگے اُسی قدر ہماری قومیت ٹھوس ومستحکم ہوگی اور جتنا اِس میں اضمحلال پیدا ہوگا اتنا ہی ہماری قومیت سُست وناتواں رہے گی۔'' (۲۳)

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

سیاسی وفکری شعور کی بیداری کا درس

یہ درست ہے کہ کسی قوم کے اجزائے ترکیبی میں اگر تہذیبی، ثقافتی، سماجی، مذہبی اور روحانی عوامل تو موجود ہوں، مگر سیاسی شعور غائب ہو، تو ایسی متذکرہ تمام خصوصیات کا حامل

انسانی گروہ، سیاسی شعور سے عاری ہونے کی وجہ سے ''ایک قوم'' کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اِس تناظر میں سیّد سلیمان اشرف برعظیم کے مسلمانوں میں سیاسی شعور کی اہمیت وافادیت اور ضرورت کو اِس لیے لازمی خیال کرتے ہیں کہ اِس کے بغیر قومی خودمختاری اور آزادی کے حصول کی جدوجہد ایک سعیٔ لاحاصل ہے۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں میں سیاسی شعور کی بیداری کیلئے بھرپور کوششیں کیں اور اپنی کتاب ''البلاغ'' کے حصہ ''اسلام اور خلافت، میں ''اسلام وتمدن، اسلام و سیاست، اسلام وحرب اور خلافت'' جیسے عنوانات قائم کرکے اِس احساس کو مزید مہمیز کیا۔

سیّد سلیمان اشرف کے افکار ونظریات کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اُنہوں نے مسلمانوں میں مسلم قومیت کا تشخص بیدار کیا۔ ایک مرکز سے وابستہ ہونے کی ترغیب دلائی اور عملی زندگی اختیار کرنے کا درس دیا تاکہ مسلمانانِ ہند اپنے قومی وملّی حقوق کا تحفظ اور اپنی آزادی وخودمختاری کا دفاع کرسکیں۔ آپ نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلام صرف تزکیہ نفس کی ہی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ سیاست سمیت جملہ شعبۂ زندگی کیلئے مکمل رہبری ورہنمائی کا سامان بھی فراہم کرتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) ڈاکٹر سید عابد احمد علی مزید کہتے ہیں کہ ''لباس اور وضع قطع میں بھی استاذ محترم حضرت مولانا (محدث ریلوی) کا تتبع فرماتے تھے، حتیٰ کہ مجھے یاد ہے کہ آپ عمامہ بھی اسی انداز کا رکھتے جیسا کہ حضرت مولانا مرحوم استعمال فرماتے تھے۔'' (ڈاکٹر سید عابد احمد علی، مقالات یوم رضا حصہ سوم، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۱ء ص ۱۰۔۹)

(۲) طرابلس (ترپیولی) شمالی افریقہ میں طرابلس الغرب خلافت عثمانیہ کی آخری ولایت تھی، جو انگریزوں اور فرانسیسیوں کے قبضے سے محفوظ رہ گئی تھی اور جس پر خلافت کا پرچم لہرارہا تھا، اُس پر اٹلی نے قبضہ کرلیا، دراصل اٹلی تیونس پر اپنا حق سمجھتا تھا مگر فرانس تیونس پر قابض تھا، فرانس نے اپنا دامن بچانے کیلئے اٹلی کو اندورن خانہ یہ سبق پڑھایا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرلے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کرلیا۔

(۳) نسیم احمد، حجاز ریلوے عثمانی ترک اور شریف مکہ، الفیصل لاہور ۲۰۰۸ء، ص:۱۲۹

(۴) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، اسلام اور خلافت، میں اسلام، کے تحت ص:۲۶، مشمولہ البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۵) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، اسلام اور خلافت میں اسلام اور حرب، کے تحت، ص:۲۷، مشمولہ البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۶) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، اسلام اور خلافت، میں اسلام، کے تحت ص:۲، مشمولہ البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۷) ایضا ص:۲۶

(۸) ایضاً ص:۲۶۔۲۵

(۹) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، اسلام اور خلافت، ص: ۲۴۔۲۳، مشمولہ البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۱۰) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، اسلام اور خلافت، میں اسلام، کے تحت ص:۲، مشمولہ البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۱۱) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، مسلمانوں کا ملی انحطاط، ص:۔۲۰۔۱۹، مشمولہ البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۱۲) ایضاً ص:۴

(۱۳) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، اسلام اور خلافت، ''اسلام'' ص:۳۔۲، مشمولہ البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۱۴) ایضاً ص:۹

(۱۵) ایضاً ص:۵

(۱۶) ایضاً ص:۱۰۔۹

(۱۷) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، اسلام اور خلافت، مشمولہ البلاغ، ص:۴۰، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۱۸) ایضاً ص:۴۱۔۴۰

(۱۹) ایضاً ص:۴۱۔۴۰

(۲۰) ایضاً ص:۴۵۔۴۱

(۲۱) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، مسلمانوں کا ملّی انحطاط، مشمولہ البلاغ، ص:۲۵، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۲۲) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، اسلام اور خلافت، ''اسلام''، ص:۳، مشمولہ البلاغ، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۲۳) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، مسلمانوں کا ملّی انحطاط، مشمولہ البلاغ، ص:۲۰، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

باب چھارم

جدید عصری علوم اور جذبۂ آزادی

جدید عصری علوم اور جذبہٗ آزادی

تعلیم قوموں کی قسمت کی کنجی ہوتی ہے، جو قوم جس قدر تعلیم یافتہ ہوگی وہ اتنی ہی ترقی یافتہ بھی ہوگی۔ دنیا میں کسی قوم و ملک کی ترقی کا دارومدار تعلیم پر منحصر ہوتا ہے۔ تعلیم ہی ہمہ جہت ترقی کی ضامن ہے۔ تعلیم کی اہمیت وافادیت قدیم زمانے سے ہر طبقہ وقوم میں رہی ہے۔ ماضی میں مسلمان تعلیم کی ضرورت واہمیت سے آگاہ تھے اِس لیے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں آگے رہے۔ اُنہیں عروج حاصل ہوا اور وہ دنیا میں ایک مضبوط سیاسی طاقت بن کر ابھرے۔

یہ درست ہے کہ جب کوئی قوم تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہوجاتی ہے تو اُس کی نمائندگی زندگی کے ہر شعبہ میں کمزور ہوجاتی ہے اور اُس کا معاشی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی وثقافتی ڈھانچہ بھی کمزور ہوجاتا ہے۔ یہی حال برِّعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلم حکمرانی کا سورج کیا ڈوبا۔ فکری وعلمی افلاس اپنے ساتھ غلامی، محکومی اور نقاہت کا دور لے کر بھی آیا۔ مسلمان سیاسی، سماجی، معاشی اور تعلیمی طور پر جمود وانحطاط کا شکار ہوگئے۔ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف اُس بحرانی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”جب اپنی سلطنت علوم اسلامیہ کی حمایت وحفاظت کیلئے نہ رہی تو ترقی کے سارے زینے ٹوٹ گئے اور مسلمانوں کے علوم وفنون کی عمارت

منہدم ہوگئی...... جب سلطنت جاتی ہے تو محاسن وکمال صرف اُس قوم
سے رخصت ہی نہیں ہو جاتے بلکہ کافی مدت کیلئے اُسے دامِ حیرت میں
ایسا گرفتار کر جاتے ہیں کہ وہ قوم اس انقلاب سے متاثر ہوکر عالم
سراسیمگی میں ششدر و حیران ہوجاتی ہے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔
ہندوستان سے مسلمانوں کی سلطنت جب زائل ہوئی اور ۱۸۵۷ء کے
واقعہ نے اُن کی آنکھیں کھولیں تو انہیں معلوم ہوا کہ سلطنت کے ساتھ
کمالات ومحاسن بھی اُن سے رخصت ہوگئے۔''(۱)

خوف اور سراسیمگی نے مسلمانوں کی عقل وخرد کو ماؤف کردیا۔ بے بسی و لاچاری
نے تمام راہیں مسدود کردیں۔ اگر کچھ کرنا بھی چاہتے تو کرنہیں سکتے تھے۔ حواس پراگندہ، عقل
حیران وششدر اور سوچنے، سمجھنے، پہچاننے اور تمیز کی طاقت وصلاحیت سے محروم۔ بقول شاعر

مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سُو
سکوتِ مرگ نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سُو

اسلامیانِ ہند کی اِس حالت کو بیان کرتے ہوئے سیّد سلیمان اشرف ''السبیل'' کے
صفحہ ۱۷، پر رقمطراز ہوتے ہیں:

''ہندوستان سے جب مسلمانوں کی رہی سہی سلطنت بھی فنا ہوگئی تو
دفعتہً اُن کے قلب پر ایسا صدمہ پہنچا کہ دل ودماغ اُن کے بالکل
ماؤف ہوگئے، عقل خیرہ ہوگئی اور حواس پراگندہ۔ اُس سراسیمگی میں
انہیں قطعاً اِس کا احساس نہ رہا کہ کس شے کو اخذ کرنا چاہیے اور کس چیز کو
ترک کرنا چاہیے۔ حیران وششدر تھے قوت ممیزہ بیکار ہورہی تھی اس
بے ہوشی میں بہت سے قابل ترک اُمور اختیار کرلیے گئے اور جنھیں کسی
حال میں بھی ترک کرنا روا، نہ ہوسکتا تھا انہیں قطعاً چھوڑ بیٹھے۔ انہی
فروگذاشتوں کی فہرست میں بہت جلی قلم اور نمایاں حروف میں علوم
اسلامیہ کا ترک بھی مندرج ہوگیا (اور) مسلمانوں نے خیال کیا جب

اپنی سلطنت اپنے علوم کی محافظت کیلئے نہ رہی تو پھر اس یتیم کی پرورش
ایک مفتوح قوم اور محکوم رعایا کیلئے کسی طرح سازگار نہیں ہوسکتی۔''

اِس مایوسانہ اور شکست خوردہ طرزِ فکر نے مسلمانوں کو علوم اسلامیہ سے ہی دور نہ کیا
بلکہ دنیاوی تعلیم میں بھی وہ دیگر اقوام سے پیچھے رہ گئے۔ اِس علمی، فکری، سیاسی، معاشی اور
معاشرتی زوال وانحطاط کو بیان کرتے ہوئے پروفیسر تعلیمات و پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونی
ورسٹی علی گڑھ خواجہ غلام السیدین (۱۹۰۴ء۔۱۹۷۱ء) لکھتے ہیں:

''اٹھاروں صدی اور انیسویں صدی کا نصف اوّل ہندوستانیوں کیلئے
نہایت تاریک زمانہ گزرا ہے۔ کیونکہ یہ عام طور پر دماغی افلاس اور جمود
کا دور تھا اور قوم کی تمام قوتیں اور کاروبار افسردگی کے عالم میں
تھے۔ سلطنت مغلیہ کا زوال ہوچکا تھا اور علوم وفنون، صنعت وحرفت،
فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر کے دورِ عروج کے بعد اب بالعموم لوگوں پر عام اس
سے کہ وہ مسلمان تھے یا ہندو، سستی، غفلت اور جہالت چھائی ہوئی
تھی۔ پرانا نظام درہم برہم ہوچکا تھا، پرانی بساط اُٹھ چکی تھی، پرانے
ادارے ٹوٹ چکے تھے یا ٹوٹ رہے تھے اور نیا نظام ابھی قائم نہیں ہوا
تھا۔ قومی زندگی کے ہر شعبے میں بدنظمی اور انتشار کا عالم تھا۔ اس بے
سروسامانی کے زمانے میں تمام قوم پر بحیثیت مجموعی ایک سکرات کا عالم
طاری تھا جس میں لوگ اپنی کھوئی ہوئی شخصیت اور وقار کو حاصل کرنے
کیلئے بالارادہ کوشاں نہیں تھے بلکہ اندھیرے میں چاروں طرف ٹٹول
رہے تھے۔''(۲)

نئی روشنی کے علمبرداروں کی علم دشمنی

اُدھر برعظیم پاک وہند میں انگریزوں کے قبضۂ اقتدار نے جہاں نظام سیاست کے
ساتھ ساتھ کم وبیش زندگی کا ہر شعبہ تہہ وبالا کردیا تھا۔ وہاں تعلیم کے شعبہ کا متاثر ہونا بھی ایک
لازمی اَمر تھا۔ تاہم یہ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ نئی روشنی کے علمبردار اِس موضوع پر بھی اپنی رعایا

سے وہ بدترین انتقام لیں گے جس کی مثال صدیوں میں بھی نہیں ملے گی۔ بقول جناب ڈاکٹر احسن اقبال:

> ''انگریزوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ ہندوستانی باشندے زیادہ سے زیادہ جاہل رہیں۔اُن کا خیال تھا کہ تعلیم حاصل کر کے یہ لوگ ہمارے اقتدار کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔اِس لیے اگر تعلیم کا نظم کیا بھی، تو وہ محض عیسائیت (کے فروغ) کیلئے، ورنہ اعلیٰ تعلیم کا ہندوستانی باشندوں کیلئے کوئی نظم نہ تھا۔''(۳)

کہتے ہیں کہ قوموں کے عروج و زوال کی ذمہ دار خود قومیں ہوا کرتی ہیں، دوسرے نہیں۔دوسرے اپنی حریف قوموں کی کمزوریوں کا فائدہ ضرور اُٹھاتے ہیں۔انگریز نے مسلمانوں میں پھیلے ہوئے خوف و ہراس اور سراسیمگی کا پورا فائدہ اٹھایا۔وہ اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اگر برصغیر میں مغربی طرز کے تعلیمی ادارے کھولے گئے تو اِس سے عوام میں بیداری آئے گی اور جس طرح امریکہ وغیرہ میں جدید علوم کی درسگاہیں قائم ہوجانے کے بعد ہمیں امریکیوں کو آزادی دینی پڑ گئی تھی۔ اُسی طرح برصغیر جو کہ سونے کی چڑیا سے کم نہیں ہے۔اگر ہم نے یہاں پر جدید تعلیمی ادارے قائم کردیئے تو ایک نہ ایک دن ہمیں یہاں سے لازماً بوریا بستر گول کرنا پڑے گا۔ اِس لیے بہتر یہی ہے کہ یہاں کے لوگوں کو تعلیمی لحاظ سے پسماندہ رکھا جائے۔(۴)

تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریز حکومت کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور حکومتی سرپرستی میں کئی تعلیمی ادارے وجود میں آئے۔جن کا پس پردہ مقصد عیسائیت کی فروغ واشاعت کے ساتھ ''تعلیم برائے ملازمت'' (۵) اور ہندوستانی سر میں انگریز دماغ رکھنا تھا۔(۶) یعنی ایک ایسا طبقہ وجود میں لانا تھا جو رنگ و نسل کے لحاظ سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، ذہن، اخلاق اور فہم و فراست کے اعتبار سے انگریز ہو۔ چنانچہ اِس اندازِ تعلیم کا سب سے بڑا نقصان بیان کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا:

> ''اِس تعلیم کے بندے اپنی روایات و تہذیب اور اپنے اخلاق اور تاریخ

> سے بیگانہ ہوجاتے ہیں۔ یہ چیزیں جو قومیت کی بنیاد ہیں، اُن کی نظروں میں حقیر معلوم ہونے لگتی ہیں، وہ مغربی تہذیب و رسوم کے رنگ میں رنگے جاتے ہیں ...... جو (ہمارے) قومی نظام کے لیے نہایت خطرناک ہے۔''(۷)

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام واغراض و مقاصد

چنانچہ اِن عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام (جسے بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا نام دیا گیا۔مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے قیام ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کے گیارہ سال سات مہینے بعد) دسمبر ۱۸۸۶ء میں عمل میں آیا۔اِس ادارے کا بنیادی مقصد علی گڑھ کے علاوہ دیگر علاقوں کے مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات پر غور و خوض اور اُن میں جدید تعلیم کا شوق پیدا کرنا، نیز مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کر کے اُن میں سیاسی شعور کی بیداری بھی تھا۔

سید الطاف علی بریلوی (۱۹۰۵ء۔۱۹۸۶ء) جو علی گڑھ یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے۔آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے اغراض و مقاصد اور نصب العین کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں میں تعلیمی بیداری اور سیاسی شعور پیدا کرنے کیلئے یہ قومی ادارہ وجود میں لایا گیا۔اور بلاشبہ آج کی تمام حسیات ذہنی اور انقلاب خیالات اِس کانفرنس ہی کے رہن منت ہیں۔جس نے اجتماع ملّی پر سب سے پہلے آواز بلند کی اور جلوسوں کے آئین و ضوابط اور مطالبات قومی پر بحث و مباحثہ کے طریقے سکھائے، اور اعلیٰ خیالات کا ایک ایسا بلند مینار تیار کیا جس پر چڑھ کر قوم نے اپنی حالت کو دیکھا اور تباہ کن راہوں کو ترک کر کے ترقی پذیر شاہراہوں پر گامزن ہوئی۔''

سید الطاف علی بریلوی آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

> ''کانفرنس نے اپنے مقصد اور نصب العین کے مطابق مسلمانوں میں ہر

ممکن اور مناسب طریقہ سے صحیح تعلیم کو رائج کیا،نہایت استقلال کے ساتھ تصنیف و تالیف و تراجم کے ذریعہ اسلامی لٹریچر اور تاریخ کی حفاظت ،اردو کی ترویج و اشاعت کے ذرائع کی بہم رسانی، معلومات تعلیمی کیلئے اعداد و شمار کی ترتیب وتدوین، اصلاح تمدن کے وسائل کی فراہمی، ہزار ہا ضرورت مند طلباء کو لاکھوں روپے وظائف ، مدارس و انجمن ہائے اسلامی کا قیام،اور اُن کی ہر قسم کی امداد کے علاوہ سب سے بڑی خدمت مسلم یونیورسٹی کو وجود میں لانے کی انجام دیں۔اِس طرح مسلم گرلز کالج علی گڑھ، ڈھاکہ یونیورسٹی ،انجمن ترقی اردو اور مسلم لیگ جیسے قابل فخر مسلمانوں کے قومی ادارے کانفرنس ہی کی تحریک وتشویق سے معرض وجود میں آئے۔''(۸)

مولوی انوار احمد زبیری نے اِس بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے لکھا:

''اٹھارھویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی کے چوتھائی سے زیادہ عرصہ تک مسلسل چالیس بیالیس برس کی مدت میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے مسلمانان ہندوستان میں جس استقلال و استقامت کے ساتھ تعلیم منادی کا فرض انجام دیا ہے اور جس طرح قوم کے اندر علوم جدیدہ کی اشاعت وتبلیغ میں پانی کی طرح روپیہ بہایا ہے جو بلاشبہ یہ ایک بیش بہا قومی خدمت ہے۔جس زمانہ میں اور جن حالات کے اندر کانفرنس قائم ہوئی اُس وقت دنیا متحرک تھی اور مسلمان ساکن و جامد۔قومی تعلیم کے لحاظ سے وہ ایک تاریک زمانہ تھا جس کے اندھیرے میں ہماری تمام حسیات ملّی مردہ ہو رہی تھیں۔ اِس مجلس کے میر مجلسوں نے دور حاضرہ کی ضرورت اور حقائق حالات کی بناء پر اپنے زبردست خطبوں کے ذریعہ سے قوم کو تعلیم پر متوجہ کرنے کی اہم کوشش کی۔''(۹)

سیّد سلیمان اشرف کا چشم کشا خطاب

چنانچہ مسلمانوں میں تعلیمی شعور کی بیداری اور فروغ کیلئے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ہر سال متحدہ ہندوستان کے مختلف مقامات مثلاً دلی،ڈھاکہ ،رنگون، بمبئ، مدراس، پشاور اور راولپنڈی وغیرہ میں منعقد ہوتے رہے۔جس سے ملک کے طول وعرض میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔دسمبر ۱۹۱۴ء میں اسی سلسلے کی اٹھائیسویں سالانہ کانفرنس راولپنڈی میں منعقد ہوئی۔جس میں برعظیم کی ممتاز سیاسی وسماجی شخصیات کے علاوہ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کو بھی بطور ماہر تعلیم مدعو کیا گیا تھا۔۲۹،دسمبر ۱۹۱۴ء کو پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے کانفرنس کے ساتویں سیشن سے خصوصی خطاب کرتے ہوئے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کے عروج وزوال کا مفصل جائزہ لیا اور مسلمانان ہند کی تعلیمی پسی وزوال کے اسباب وعوامل اور تدارک پر روشنی ڈالی۔اور اپنے خطاب میں مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی پر نوحہ کناں ہوتے ہوئے کہا:

''جب تک مسلمانوں نے اطاعت الٰہی کو اپنا شعار رکھا اور سراًواعلانیۃً خدا کے بھیجے ہوئے دستور کو اپنا نصب العین بنائے رکھا اور رسول اللہ ﷺ کی زندگی کا نمونہ اُن کے پیش نظر رہا اُس وقت اُن کی ترقی برق رفتار رہی،آج جس چیز کی بازارِ مسلمین میں کساد بازاری ہے قرون اولیٰ میں اُس کی ایسی فراوانی تھی کہ اپنے تو خیر اپنے ہی تھے بیگانوں تک کے گھروں کی رونق انہی مسلمانوں کے عطیات کا نتیجہ تھا۔دیکھئے آج یہ رونا ہے کہ مسلمان تمام اقوام سے تعلیم میں پیچھے ہیں اور اِس قدر موخر اور اِس قدر بطی السیر (سست رفتار) ہیں کہ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ یہ اُس قوم کے جو اُن کے دوش بدوش آباد ہے کب تک ہم سفر و ہم منزل ہونگے چہ جائے کہ اُن اقوام کے پہلو میں جگہ پانے کے قابل ہوں جو اِس وقت سر بفلک ہیں۔اور ذرا یہ دیکھو کہ مسلمان جب کہ سچ مچ مسلمان تھے تو کیا اسی طرح علوم دنیاوی سے بےنصیب تھے۔''

آگے فرماتے ہیں''کیا یہ وہی قوم ہے جو کسی وقت تمام دنیا میں سب کی استاد تھی اور آج شاگردی کے قابل بھی نہ رہی۔اُس عہد کے عام مذاق

کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہر رئیس اپنے مکان کی زینت کتب خانہ اور اپنی مجلس کی رونق مذاکرہ علمیہ کو سمجھتا تھا۔(اور آج) اُمرا کی جماعت عموماً ناؤنوش وفضول ولایعنی باتوں میں اوقات صرف کیا کرتی ہے لیکن اُس زمانہ میں علم کی ہمہ گیری سے وہ بھی نہ بچ سکے۔علمی کتابوں کا ہونا، دقیق مسائل پر مباحثہ قائم کرنا اور خود بحث میں محققانہ حصہ لینا لوازمات امارت سے تھا۔گلی کوچوں میں سے بھی کوئی گزر جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ سیکھ ہی لیتا ہے۔یہی حال صنعت وحرفت وتجارت کا تھا......مگر ہم نے اپنے آپ کو کیا بنا ڈالا۔افسوس تباہی خود ہم اپنے اوپر لائیں اور اتہام اسلام پر رکھیں......اب نہ علم ہے نہ تجارت، نہ صنعت ہے نہ زراعت، ہائے ہائے کیا کر دیا اسلاف کے کارنامہ پڑھ کر فخر ومباہات کرتے رہو اِس سے کیا ہوتا ہے۔"(۱۰)

آپ انتہائی دل سوز انداز میں مسلمانوں کی حالتِ زار کو بیان کرتے ہوئے مزید ارشاد فرماتے ہیں:

"آہ! اے گلشن اسلام کیا ہوئی تیزی بہار جس نے اپنے فیضِ کرم سے خار زار جفا کو لالہ زار وفا بنا دیا تھا، سوکھی کلیاں لبہائے جاناں کی طرح تروتازہ پنکھڑیاں نکال لائی تھیں، ہر شاخ نخل اثمار خوشگوار سے باردار تھی، اور ہر برگ ایک ایک رگ میں لاکھوں چشمے سرسبزی کی امانت رکھتی تھی، تیری بادسموم یورپ کی نسیم سحر سے کہیں بڑھ چڑھ کر خدمت صبا انجام دیتی تھی، اُس کا ایک جھونکا غنچہائے سربستہ کو کھلا دیتا تھا۔اب وہی تو ہے وہی تیرے مرغان طرب کی صدائیں ولیکن نہ کوئی کان اُن کو سننا گوارا کرتا ہے نہ کوئی دماغ اُن سے راحت پاتا ہے، عقل کو حیرت ہے اور ذہن کو چکر کہ آخر دیکھتے دیکھتے یہ رنگ چمن کیونکر بدلا۔باغبانی کی خدمت جن کے قبضہ قدرت میں دی گئی تھی وہ کیوں تبر لیے سڈول

وبیڈول کوئی شاخ نہیں دیکھئے چھانٹنے پر تلے بیٹھے ہیں۔"(۱۱)

علم وحکمت مومن کی گمشدہ میراث

سیّد سلیمان اشرف نے اپنے خصوصی خطاب میں جدید تعلیم وزبان کی اہمیت وافادیت اور ضرورت کو دین اسلام کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے اِسے مومن کی گمشدہ میراث قرار دیا اور مسلمانوں کو اِس کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا کہ یہ تمہاری اپنی چیز ہے، تمہیں جہاں سے ملے، حاصل کرلو۔آپ اِسی شعور کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کوئی وجہ نہیں کہ قرآن ہمیں جن اُمور کی طرف رہنمائی کرے، جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے، ہم اُسے مذہب کے خلاف سمجھیں......رہی یہ بات کہ کون سی زبان میں اِن علوم کو پڑھیں؟ اِس تنگ وقت میں زیادہ بحث کا موقع تو نہیں، لیکن اِس قدر سمجھ لیجئے کہ اردو، فارسی، پنجابی، پشتو، بنگلہ وغیرہ تو جائز ہوں، مگر یورپ کی زبان حرام، آخر اِس کی وجہ؟ اگر آج تمام یورپ یا کوئی اُس کا حصہ دائرہ اسلام میں آجائے تو کیا اُسے اپنی مادری زبان کا بولنا یا اُس میں پڑھنا حرام ہوجائے گا۔؟ کیوں خدا کی رحمت کو اِس قدر تنگ کیا جائے؟ اور ترجیح بلا مرجح دی جاوے؟ الحکمة ضالة المؤمن حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔اپنی چیز جہاں تمہیں مل جائے اُسے فوراً اٹھالو۔

سخن کز بہر حق گوئی چہ عبرانی چہ سُریانی
مکان کز بہر او جوئی چہ جابلقا چہ جابلسا (۱۲)

آزاد و دیگر رہنمائے خلافت کی فکری کجی

سیّد سلیمان اشرف کے اِن ارشادات کا پس منظر دراصل کچھ مسلمان رہنماؤں کی جانب سے انگریزی تعلیم کی اِس بناء پر مخالفت تھی کہ غیر ملکی اور غیر قوم کی زبان سیکھنا مذہباً جائز نہیں ہے۔اُس وقت برصغیر کے جن مسلم اکابرین نے اِس نظریہ تعلیم کو خصوصیت سے ہدف

تنقید بنایا، اُن میں ابوالکلام آزاد سرفہرست ہیں۔ آزاد کا خیال تھا کہ:

''تاریخ اِس طرزِ تعلیم کیلئے کوئی جواز پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جس کی میکالے (۱۸۰۰ء۔۱۸۵۹ء) نے (بنیاد) ڈالی تھی۔ میکالے کی یہ دلیل کہ سنسکرت اور فارسی کو ذریعہ تعلیم نہیں قرار دیا جاسکتا، غلط نہیں ہے لیکن اِس کے ساتھ ہی یہ حجت لغو ہے کہ ذریعہ تعلیم صرف انگریزی زبان ہو سکتی ہے۔'' (۱۳)

ابوالکلام آزاد کی اِس مخالفت اور عذر گناہی کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری نے لکھا:

''آپ (آزاد) نے اِس بات کی وضاحت تو نہیں کی کہ وہ کون سی زبان ہونی چاہئے جسے برصغیر کی اقوام کیلئے ذریعہ تعلیم بنایا جائے، تاہم ایک مستند عالم دین اور عبقری شخصیت ہونے کے ناطے ظاہر ہے کہ آپ کی پسندیدہ زبان (Choice) عربی ہی ہوسکتی ہے جو آپ کی مادری زبان بھی تھی۔ ورنہ کم از کم اردو، جس کے آپ صاحب طرز ادیب تھے۔'' (۱۴)

اَمر واقعہ یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد کے علاوہ اور بھی بہت سے افراد ایسے تھے جو مسلمانوں کیلئے جدید تعلیم کے حصول کے شدید مخالف تھے۔ جن کی تنگ نظری اور کوتاہ فکری کو نمایاں کرتے ہوئے ممتاز دانشور میاں عبدالرشید نے لکھا:

''موخرالذکر (دیوبند) کا طرزِ عمل یہ تھا کہ ہر مغربی چیز بری ہے۔ اس کے قریب نہ جاؤ۔ نہ انگریزی پڑھو۔ نہ مغربی معیشت اپناؤ...... اِس روش نے انہیں حقیقت پسندی اور مبنی بر معقولیت سوچ دونوں سے محروم کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے شرعی اور سیاسی دونوں معاملات میں ٹھوکریں کھائیں۔ حضراتِ دیوبند بالعموم مغربی تعلیم سے متنفر رہے اور ...... کانگریس کی تحریکِ وطنیت سے وابستہ رہے، جس سے بالآخر ہندو کو

فائدہ پہنچا...... وہ (حسین احمد مدنی) بالکل ہی کانگریس کی گود میں چلے گئے...... اُن کی کانگریس سے وابستگی نے مسلمانوں کو بہت سیاسی نقصان پہنچایا۔ سوائے مولانا شبیر احمد عثمانی (۱۸۸۵ء۔۱۹۴۹ء) اور اُن کے چند رفقا کے ان میں سے کسی قابل قدر ہستی نے تحریک پاکستان کا ساتھ نہ دیا...... انہوں نے اپنے بزرگوں کی وسعت نظری کو بھی ترک کردیا اور روح اسلام کو نظر انداز کر کے چھوٹی باتوں پر زور دینے اور لڑنے جھگڑنے لگے۔ خاص طور پر اُن کے افکارِ مغرب سے بیزاری نے انہیں بہت نقصان پہنچایا۔ اپنے ذہنوں کو مسدود کر لینے کے باعث اُن کے فکر کے سوتے خشک ہوگئے۔'' (۱۵)

جدید عصری علوم سے دوری و بے اعتنائی

ایسے وقت میں سیّد سلیمان اشرف جو جدید عصری علوم کی ضرورت و اہمیت سے آگاہ اور اِس کے حصول کو قومی و ملی حقوق اور سیاسی بیداری کیلئے لازم وملزوم سمجھتے تھے، آزاد اور اُن جیسی طرز فکر رکھنے والے رہنماؤں کی فکری کجی کی نفی کرتے ہیں اور علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کرتے ہوئے واضح کرتے ہیں کہ آج ظالم وغاصب حکمرانوں کے خلاف حقوق اور آزادی کیلئے سینہ سپر کوئی اور نہیں وہی لوگ ہیں جو جدید درس گاہوں کے تعلیم وسند یافتہ ہیں۔ چنانچہ اِس حوالے سے ''النور'' میں لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے، حقیقت ہے اِس سے انکار کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے کہ ہندوستانیوں کا حکومت کے سامنے آنا، اپنے مطالبات کو موثر پیرائے میں پیش کرنا، ثبات وقرار سے اپنے حقوق کے طلب میں مسلسل سرگرم کار رہنا اور پھر اپنی کامیابی کیلئے ایثار وقربانی سے دریغ نہ کرنا، یہ سب انگریزی تعلیم کا ثمرہ ہے۔ آئین سلطنت پر جنھوں نے نکتہ چینی کی ہے، وہ انگریزی خواں ہیں۔ حکومتِ خود اختیاری کا جنھوں نے نعرہ بلند کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔ غلامی کی ذلتوں کا جس نے

احساس پیدا کیا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔قید خانوں میں سب سے پہلا قدم جن کا پہنچا ہے وہ انگریزی خواں ہیں۔دارورسن سے جن کے گلے پہلے آشنا ہوئے وہ انگریزی خواں ہیں۔طرفگی یہ کہ سارے انگریزی خواں انہی کالجوں کے تعلیم یافتہ اور سند یاب ہیں جن کا الحاق گورنمنٹ کی یونیورسٹیوں سے ہے،سرکاری کالج یا امدادی کالج میں تعلیم پانے سے اُن کے جذبات قومی نہ فنا ہوئے نہ مٹے۔" (۱۶)

جدید تعلیم کے مخالفین کی نقاب کشائی

لیکن اِس کے باوجود جب جدید عصری علوم کے حامیوں کو اراکین خلافت کمیٹی اور جمعیت علمائے ہند کے قائدین ومفتیان کی جانب سے انگریز نوازی کا طعنہ دیا گیا اور ۱۹۲۰ء میں آزاد قومی یونیورسٹی کے قیام کی آڑ میں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،اسلامیہ کالج لاہور اور پشاور کو نشانہ بنایا گیا تو سیّد سلیمان اشرف نے اُس وقت حقیقت حال سے پردہ اٹھاتے ہوئے جدید تعلیم یافتہ افراد کی نہ صرف وجودی اہمیت سے آگاہ کیا بلکہ جدید تعلیم کے مخالفین کو آئینہ دکھاتے ہوئے اُن کی نقاب کشائی بھی فرمائی اور انہیں حقیقت کا آئینہ دکھاتے ہوئے لکھا:

"اِس وقت علمائے سیاسی میں جو جوش وخروش ہے وہ بھی نتیجہ اِن ہی انگریزی خوانوں کا ہے، اِن ہی کے ہاتھوں نے اُنہیں جھنجھوڑا، جب اُن کی آنکھیں کھلیں،انہی کے ہاتھوں نے سہارا دیا، جب اُن کے قدم اٹھے اِن ہی کی آوازوں نے اِن کی زبانیں کھولیں، جب یہ بولنے لگے۔ رہا گروہ علمائے ربانیین کا وہ پہلے بھی عُقلائے دنیا سے بے نیاز تھا اور آج بھی مستغنی ہے۔

ملک کا جناح اُن کے زیر قدم ہے
عزیزوں کا قد سامنے اُن کے خم ہے

اس وقت بھی انگریزی خواں جماعت اِن تحریکات سے الگ ہو جائے تو

سارے جمعیت العلماء کے فضلائے یگانہ اپنی اپنی درسگاہوں میں ہوں گے یا منبر ومحراب میں،کسی یتیم خانہ یا مدرسہ یا انجمن اسلامیہ کا وعظ فرما کر آخر میں تحریک چندہ فرماتے ہوں گے۔ وزرائے انگلستان کی آرا پر تنقید اور سیاست ہند پر مباحثہ کسی کے وہم میں نہ آئے گا۔ گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش،فرماتے ہوئے سیاست کے سارے ابواب طے فرما دیں گے۔" (۱۷)

اِک چشم کشا تبصرہ

جدید تعلیم کے مخالفین کی اِس روش پر چشم کشا تبصرہ کرتے ہوئے پاکستان میں تحریکِ سلیمان شناسی کے بانی ومحرک ظہور الدین امرتسری "الخطاب" طبع جدید کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ستم ظریفی دیکھئے کہ:

"یہ بدقسمتی کیسے اِس قوم کی ہمرکاب رہی کہ موہوم ومفروض خدشات کو بنیاد بنا کر علوم عصری پر رقیب اقوام کے برابر لانے بلکہ اُن پر سبقت لے جانے کی سعیِ جمیل کے خلاف علمائے دین سے ایسے فتاویٰ حاصل کیے گئے جس کے باعث اِس راہِ روشن کو تاریکیوں سے ڈھانپ کر ملت کی منزل کھوٹی کی گئی......بعض ایسے ایمان فروش مفاد پرست بھی ہیں کہ اِن فتاویٰ کے پشتارے اپنی کمر پر اٹھائے سر بازار نفرتوں کی تجارت سے پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں ......مقام صد اطمینان یہ ہے کہ ہر ہر دور میں صاحبان بصیرت نے بنظر غائر حقائق کو دیکھا اور رائے عامہ کی رُو میں بہہ نکلنے کے بجائے اپنی بات دوٹوک انداز میں کہی۔ چنانچہ فتاویٰ کی بھیڑ میں علامہ شاہ احمد نورانی (۱۹۲۶ء۔۲۰۰۳ء) کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی (۱۸۹۳ء۔۱۹۵۴ء) کا فتویٰ (جو رسالہ "الدلائل القاہرۃ علی الکفرۃ النیاشرۃ، مطبع اہل سنت و جماعت بریلی ۱۹۱۷ء، ص ۳۵ پر موجود ہے) ایک روشن

چراغ کی مانند آج بھی پوری آب وتاب کے ساتھ اُن کی دوررس نگاہ کو
خراجِ تحسین پیش کرتا نظر آتا ہے۔"(۱۸)

جدید عصری علوم اور پروفیسر سیّد سلیمان اشرف

اسلام زندگی آمیز اور زندگی آموز تعلیم کا داعی ہے۔ اِس کے پیش نظر محض نظریاتی تعلیم ہی نہیں بلکہ ایسی ہمہ گیر تعلیم ہے جو صرف طالب علم کیلئے ہی نہیں بلکہ ملک و ملت کیلئے بھی ہر پہلو سے مفید اور نافع ہو۔ اسلام کبھی بھی ترقی وارتقا کا مخالف نہیں رہا۔ اِس کے برعکس یہ افراد کی ذہنی و تعلیمی سرگرمیوں کو بنظر استحسان دیکھتا ہے۔

دنیا کے کسی مذہب نے تعقل وتفکر وتدبر پر اتنا زور نہیں دیا جتنا کہ اسلام نے دیا ہے، چنانچہ یہ خواہش کسی طرح بھی ناجائز نہیں کہ مسلمان بھی مغربی ممالک کی طرح سائنسی علوم وفنون میں ترقی کریں اور معاشی وسائل سے کما حقہ مستفید ہوں لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ احتیاط لازم ہے کہ اِس راہ میں مغرب کی ملحدانہ سوچ کے بجائے اسلامی فکر وفلسفہ کو رہنما اصول بنایا جائے۔

مندرجہ بالا تناظر میں دیکھا جائے تو پروفیسر سیّد سلیمان اشرف جدید عصری علوم کے حصول کے کبھی بھی مخالف نہیں رہے۔ آپ وقت اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ رہنے کیلئے اِس کی ضرورت واہمیت سے واقف تھے۔ چنانچہ "السبیل" میں اِس اِس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اِس حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ حکومت وسلطنت کے ساتھ صرف درہم ودینار ہی کا خزانہ عطا نہیں ہوتا بلکہ بہت سے کمالات ومحاسن اِس کے علاوہ ایسے ہوتے ہیں جن کی پرسش وقدردانی بعد از زوالِ سلطنت بھی باقی رہتی ہے۔ اِس وقت کے خطہ یورپ سریر آرائے سلطنت ہے وہاں کی زبانوں کا جاننا خالی از منفعت نہیں۔ اِس لیے انگریزی تعلیم سے اعراض وچشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔"(۱۹)

سیّد سلیمان اشرف دینی وعصری علوم میں امتزاج کے قائل اور اسے دور جدید کی

اہم ضرورت خیال کرتے ہیں۔ آپ جدید تعلیم کو اسلامی اقدار وروایات کی روشنی میں دیکھنے کے بھی حامی ہیں۔ اور ایسے نظامِ تعلیم جس کی بنیادیں مادہ پرستی اور ملحدانہ نظریات پر قائم ہوں جو فکری ونظری بالیدگی پیدا کرنے کے بجائے کج روی اور گمراہی کو فروغ دیتا ہو اور غلامانہ ذہنیت کی آبیاری کرتا ہو، کو مسلمانوں کیلئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔

آپ سمجھتے تھے جدید علوم اُس صورت میں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے جب علم وفن کے ذریعے حاصل کردہ قوت وحشمت میں لا الہ کا جوہر نمایاں ہو کیونکہ الحادی علم ایمان کی روشنی چھین لیتا ہے۔

جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف
تعلیم ہو گو فرنگیانہ

چنانچہ آپ نے مشرق ومغرب کے فلسفۂ تعلیم اور نظامِ تعلیم دونوں کو سامنے رکھا۔ ایک دوسرے سے تقابل کیا۔ خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیا اور بتایا ہے کہ ہماری درس گاہوں کو کس قسم کی تعلیم اور نظامِ تعلیم کی ضرورت ہے۔ آپ کے نزدیک مسلمانانِ ہند کیلئے جدید تعلیم کا حصول ایک ضروری اَمر تھا لیکن اس کے حصول کی تگ ودو میں غیر مسلم اقوام کے رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کی نقالی اور اندھی تقلید دین ومذہب سے دوری اور اپنی جداگانہ قومیت کی تباہی وبربادی تھی۔ چنانچہ اِس تناظر میں آپ نے مسلم معاشرے پر مغربی تہذیب وتمدن اور بودوباش کے منفی اثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

"مسلمانوں کی انتہائی بدقسمتی یہی ہے کہ یہ کسی غیر قوم کی طرف اِس غرض سے بڑھتے ہیں کہ اپنی حیاتِ دنیا سنوارنے کا طریقہ اُس سے سکھیں لیکن اِس سے پیشتر کہ اُن وسائل واسباب پر اُنہیں دسترس ہو دین ومذہب پہلے کھو بیٹھتے ہیں۔"(۲۰)

اِس کے منفی اثرات اور نقصانات کو مزید بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جب سے مسلمان یورپی تہذیب وتمدن میں جذب ہوئے:

"مسلمانوں کی شکل وصورت لباس وپوشاک طرز ماندوبود غرض ہر ایک

شعبۂ حیات میں یورپ کی ہی تجلّی تھی۔حتیٰ کہ نام تک یورپین تلفظ و املا
میں شامل کرلیا گیا۔ارکان اسلام سے بیگانہ وشی لوازم تہذیب و تعلیم
قرار پائے۔"(۲۱)

مسلمانان ہند کی بہتر معاشی اور معاشرتی زندگی کیلئے جدید تعلیم کا حصول اگر تقاضۂ وقت تھا تو قومی وملّی تشخص اور دینی زندگی کی بقاء کیلئے اسلامی علوم کا حصول ایک لازمی اَمر تھا۔سیّد سلیمان اشرف نے دونوں کی اہمیت اور افادیت کو مدنظر رکھااور متوازن راہ عمل اختیار کرتے ہوئے لکھا:

"مسلمانانِ ہند کو اپنی وجاہت ،اپنی معاشرت اور اپنے خوش منظر تمدن
کیلئے انگریزی تعلیم سے مفرنہیں لیکن اپنی قومیت اپنی ملّی خصوصیت اور
اپنی مذہبی زندگی کی بقا کیلئے علوم اسلامیہ سے بھی چشم پوشی نہیں کی
جاسکتی۔"(۲۲)

آپ کے نزدیک ملتِ اسلامیہ کا مستقبل اسلام اور صرف اسلام سے وابستہ ہے۔آپ دنیاوی جاہ ومنفعت کیلئے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے کو ترک کرنا پسندنہیں کرتے۔چنانچہ مسلمانوں کو دعوت فکر وعمل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"دوستو! کیا یہ بے انصافی نہ ہوگی کہ ہم اپنے مطیعوں سے تو کام لیں
کائنات سے بہرہ مند ہوتے رہیں،لیکن جس کی اطاعت کیلئے ہم پیدا
کئے گئے ہیں اُس کی طرف بھول کر بھی توجہ نہ کریں بلکہ اُسے ایک
لایعنی اَمر سمجھیں،یہ کیسی بے انصافی وصریح ہٹ دھرمی ہے۔اگر یہ پہلو
ہماری زندگی کا تاریک رہا تو ہم کمال انسانی کے عرفان سے قاصر رہے
اور سخت باز پرس منعم حقیقی کی اپنے اوپر عائد کرلی،بغیر اطاعت الٰہی
وعبادت معبود جو زندگی بسر ہوئی وہ حیوانی حیات سے ایک انچ بھی نہ
بڑھ سکی......اِس دورِ ایام کو کیا کہیے کہ ایک طرف تو جہالت کی گھٹا چھائی
ہوئی ہے،دوسری طرف تدین (دین داری وپرہیز کاری) سے دامان عمل

خالی ہے۔عامہ مسلمین کی حالت کا اندازہ کرجاؤ تو خود ہی معلوم
ہوجائے گا کہ ہم راہ مستقیم سے کس قدر منحرف ہوگئے ہیں۔"(۲۳)

کفر والحاد اور ملحدانہ نظریاتِ تعلیم اور اسلامی نظامِ تعلیم وتربیت

سیّد سلیمان اشرف ایسے جدید نظام تعلیم کے سخت مخالف تھے جس کی بنیادیں مادہ پرستی اور ملحدانہ نظریات پر قائم ہوں ،جو فکری ونظری بالیدگی پیدا کرنے کے بجائے کج روی اور گمراہی کو فروغ دیتا ہو،کفر والحاد کی پرورش کرتا ہو اور غلامانہ ذہنیت کی آبیاری کرتا ہو۔آپ ایسے نظام تعلیم کو مسلمانوں کیلئے زہر قاتل سمجھتے تھے۔

آپ کے نزدیک طلبا کی ذہنی تربیت واصلاح، صلاحیتوں کی نشوونما اور قومی وملّی نصب العین کی بیداری وحصول کیلئے ضروری تھا کہ انہیں جدید نظام تعلیم کے اِن مضر اثرات سے بچایا جائے اور اُن میں صداقت، دیانت، عدل وانصاف اور شجاعت جیسے اوصافِ حمیدہ کے ساتھ خوفِ خدا وحبِ رسول ﷺ کے جوہر پیدا کرنے کیلئے ایک ایسا نظام تعلیم وتربیت تشکیل دیا جائے جو ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت سے عبارت ہو۔چنانچہ اِس تناظر میں آپ لکھتے ہیں:

"جب علم کے پڑھنے سے خوف خدا پیدا نہ ہو،معاصی کی برائیاں معلوم
نہ ہوں،جذبات پر قوت حاصل نہ ہو،وہ تعلق جو خدا سے ہونا ضروری
ہے پایا نہ جائے تو پھر اُسے علم حقیقی کیونکر کہا جائے گا۔علم حقیقی تو وہی
ہے جس کے پڑھنے سے خشیتِ ایزدی دل میں پیدا ہوتی ہے اور یہی
کیفیت دل میں پیدا ہوکر عالم ومعاصی کے درمیان بطور پردہ کے حائل
ہوجاتی ہے۔اور یہ اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک دربار رسالت
سے لگاؤ نہ پیدا کرلیا جائے۔جس قدر دل میں یہ لگن بڑھتی جائے گی
اُسی قدر عبادات صحیح اور معاملات درست ہونگے۔"(۲۴)

پھر اُنہیں آپ زندگی کا صحیح مقصد ومحور متعین کرنے کا راستہ دکھاتے ہوئے غور و تدبر کی دعوت دیتے ہیں اور "الخطاب" صفحہ ۳۸، پر لکھتے ہیں:

"یہ بے سروپا زندگی کب تک۔ ہفوات و لایعنی کلمات کا ورد کہاں تک۔ عمر گراں بہا کا صَرف کس حد تک۔ آؤ ہم اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دیں تا کہ ہمارے اقوال وافعال ایک محور پر گردش کریں۔ جب تک اقوال و افعال کا کوئی محور قرار نہ دیں گے اُس وقت تک ہماری زندگیاں صحیح نتیجے پر نہ پہنچ سکیں گی۔"

دراصل سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک اسلامی نظام تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو اپنے دین پر کامل یقین رکھتے ہوں، اُسے اچھی طرح سمجھتے ہوں، جن کی زندگیاں اسلامی تہذیب وتمدن کا عملی نمونہ ہوں، جنھیں اسلامی تہذیب وثقافت پر فخر ہو، جو کردار و اخلاق میں دوسروں کیلئے مثالی نمونہ ہوں، جن میں اتنی قابلیت اور صلاحیت ہو کہ وہ زندگی کے مسائل کو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں حل کر سکیں اور جو ذاتی منفعت کو دینی وملّی تقاضوں پر قربان کرنے سے دریغ نہ کریں۔

آپ چاہتے تھے کہ تعلیمی درس گاہیں دماغ کے ساتھ روح کی غذا کا سامان بھی فراہم کریں۔ دنیا داری کے ساتھ ساتھ دین داری بھی سکھائیں۔ علم وفکر کی روشنی کے ساتھ ساتھ قلب ونظر کی تسکین کا سامان بھی فراہم کریں۔ ظاہر کے ساتھ باطن پر بھی نظر رکھیں اور زندگی کے مختلف مرحلوں میں مادی وسائل کے ساتھ ساتھ باطنی شعور اور خود آگہی کی قوتوں سے بھی کام لیں۔

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک یہ اُسی وقت ممکن تھا جبکہ نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں دینی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں کے نظام تعلیم میں علوم جدیدہ کے حصول کے ساتھ مروجہ نصابِ اسلامک اسٹڈیز کی اصلاح اور تاریخ اسلامی کی اہمیت وافادیت کو مدنظر رکھا اور ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے شامل کرنے پر بہت زور دیا۔ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے اِس موضوع پر مفصل اظہار خیال کرتے ہوئے ایک مجمل یادداشت متعلق اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ "السبیل" کے نام سے تحریر فرمائی۔ اور شعبۂ علوم دینیہ اور شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے نصابِ تعلیم اور طریقہ تعلیم پر اپنا اصلاحی نقطہ

نظر بھی پیش کیا۔

"السبیل" اسلامی نصاب تعلیم و تاریخ پر ایک جامع دستاویز

"السبیل" دراصل مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصابِ تعلیمات اسلامیہ کیلئے سیّد صاحب کی جانب سے دی گئی جامع اور تاریخی تجاویز پر مبنی وہ رپورٹ ہے جسے آپ نے وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خان کی دعوت اور قائم مقام وائس چانسلر نواب مزمل اللہ خاں شروانی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تحریک پر تحریر کیا۔ آپ کی یہ رپورٹ اکیڈمک کونسل میں پیش کی گئی جو منظور کر لی گئی۔ اِس رپورٹ کو نواب مزمل اللہ خاں شروانی نے نا صرف پسند کیا بلکہ اسے ۱۹۲۴ء میں شائع کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ

"چونکہ اصل یاداشت نوشتۂ مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب پروفیسر دینیات ایک نہایت بیش بہا اور مہتم بالشان تحریر ہے اور ایک معرکۃ الآرا مسئلہ پر خیالاتِ قدیم و جدید کا پورا لحاظ کر کے روشنی ڈالی گئی۔ لہٰذا میں بحیثیت چانسلر و خادم حقیر مسلم یونیورسٹی کے اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ کو روشناسی قوم سے اور قوم کو اِس معرکۃ الآرا مسئلہ کے افادہ سے محروم نہ ہونے دوں۔ لہٰذا میں اِس اصل یادداشت کو مع آرائے حضراتِ موصوف مقدم الذکر طبع کرا کے شائع کرتا ہوں۔" (۲۵)

نواب مزمل اللہ خاں شروانی نے نہ صرف آپ کی تجاویز سے کلی اتفاق کیا بلکہ آپ جیسے تجربہ کار ماہر تعلیم پرنسپل کی زیرنگرانی علوم عربیہ کالج کے قیام کی تجویز دیتے ہوئے یہ بھی لکھا:

"اِس یونیورسٹی میں ابتدائی مدارج اسکول وانٹرمیڈیٹ کالج سے لے کر یونیورسٹی کلاسوں تک باقاعدہ و مسلسل اسلامی تعلیم علوم دینی و دنیوی کی عربی زبان میں ہونی چاہیے اور انگریزی زبان بمرتبہ ثانیہ پڑھائی جائے اور جس طرح کہ یونیورسٹی کے شعبوں میں آرٹس کالج، سائنس کالج، ٹیکنکل کالج، ٹریننگ کالج قائم ہوتے ہیں اور ہونگے اُس ہی طرح علوم عربیہ اسلامیہ کالج علیحدہ قائم کیا جائے اور مولانا سیّد سلیمان

اشرف صاحب کے سے ماہرین علوم عقلیہ ونقلیہ جو ضروریاتِ موجودہ زندگی سے باخبر ہوں اِس کالج کے پرنسپل مقرر کیے جائیں۔'' (۲۶)

سر ڈاکٹر ضیا الدین احمد پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے بھی سیّد سلیمان اشرف کی تجاویز سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا:

''میں نے مولوی سلیمان اشرف صاحب کا نوٹ پڑھا..... مولوی سلیمان اشرف صاحب نے جو نوٹ لکھا ہے اُس میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن کے منشا کی توسیع کی ہے اور مجھے اِس سے کلی اتفاق ہے۔ اِسی اصول پر اسلامک اسٹڈیز کا کورس بننا چاہیے۔'' (۲۷)

اِسی طرح نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، رکن کونسل وکورٹ اور منسٹر ایجوکیشن بہار واڑیسہ جناب فخر الدین نے بھی سیّد سلیمان اشرف کی تجاویز کی تائید و توثیق کی۔ سیّد سلیمان اشرف نے اسلامک اسٹڈیز کے نصابِ تعلیم میں ترمیم واصلاح کی اِس بحث میں اپنے جذبہ قومی وملّی اور دینی کے تحت حصہ لیا اور مطالعہ اسلامی کے تحت نصاب میں اہم تبدیلیوں کی بابت اپنی صائب رائے پیش کی تاکہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کے حقیقی مقاصد کی طرف بڑھا جاسکے۔

سیّد سلیمان اشرف نے اپنی رپورٹ میں سرکاری یونیورسٹیوں اور بالخصوص مسلم یونیورسٹی میں رائج اسلامی نصابِ تعلیم اور طریقہ تدریس میں موجود خامیوں کی نشاندہی کی اور اِسے بہتر بنانے کیلئے اپنی تجاویز وآرا بھی دیں۔ اور اسلامی علوم وفنون سے مسلمانوں کی بے رغبتی کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھا:

''اِس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ سرکاری یونیورسٹیوں نے جو نصاب عربی ایم، اے کا مقرر کیا ہے اور جیسی تعلیم عربی کی یونیورسٹیوں میں دی جاتی ہے اُس نے بھی مسلمانوں کو بددل بنا رکھا ہے۔ لیکن چونکہ ایم، اے ہوجانے سے بعض ملازمتوں میں سہولت ہو جاتی ہے اِس لیے کچھ اشخاص اِس میں داخل ہوکر سند کامیابی کیلئے

کوشاں رہتے ہیں۔ طلبہ کا مقصد سند حاصل کرنا ہوتا ہے نہ کہ عربی زبان سے آشنا ہونا۔ میری یہ عرض داشت محتاج بیان نہیں کہ مسلم یونیورسٹی جس کی تعلیم عربی کا نصاب دیگر یونیورسٹیوں سے زیادہ مفید ہونا چاہیے وہ سب سے زیادہ مضحکہ انگیز اور وحشت افزا ہے۔ ایسی صورت میں علوم اسلامیہ کی طرف مسلمانوں کا میلان صرف اِس شعبہ کے قائم کردینے سے کیوں کر ہوجائے گا۔'' (۲۸) لہٰذا ''محض علوم اسلامیہ کا انگریزی درس گاہوں میں شعبہ قائم کردینا جذب وقلوب کیلئے ہرگز کافی نہ ہوگا۔'' (۲۹)

آپ کے خیال میں موجودہ خامیوں کو دور کرنے کے علاوہ طلبا میں علوم اسلامیہ کے حصول کی تڑپ ولگن پیدا کرنے کیلئے ضروری تھا کہ اُن میں ذوق وشوق کو بیدار کیا جائے، نصابِ تعلیم وطریقہ تدریس کو دلچسپ وموثر بنایا جائے، طلبا کی مالی مدد ومعاونت کیلئے وظائف مقرر کیے جائیں، اسلامک اسٹڈیز کی سند کو ایم، اے عربی کی سند پر فوقیت دی جائے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اِس شعبہ کا احترام اور اثر ورسوخ قائم کیا جائے۔

چنانچہ اِس کے اسباب وعلل کو واضح کرتے ہوئے آپ نے اسلامی علوم وفنون کی بہتری کیلئے بہت سی کارآمد تجاویز پیش کیں اور حکام کی توجہ اِس جانب مبذول کرائی کہ علی گڑھ کے مجوزہ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کو علوم اسلامیہ کیلئے ایسا نصابِ تعلیم اور نظام تعلیم بنانا اور رائج کرنا چاہیے جس میں علوم معقولات اور علوم منقولات پر ہی طلبہ کی مکمل دسترس نہ ہو بلکہ انگریزی کے حصول پر بھی پوری توجہ ہو۔ مزید یہ کہ مذکورہ علوم وفنون کے حاملین کو ایسی اسناد پیش کی جائیں جو گورنمنٹ کی نظر میں وقیع ہوں اور دوسرے شعبوں کے گریجویٹ کے مساوی ہوں۔ اِن تجاویز کو ارباب اختیار کے سامنے پیش کرتے ہوئے آپ نے لکھا:

''اِس وقت اِس کی ضرورت ہے کہ اسلامک اسٹڈیز کو دل گیر ودل پزیر بنانے کیلئے متعدد اور بار بار ذی رسوخ و ذی وجاہت ہستیاں مسلم یونیورسٹی کی تحریریں لکھیں، اِس کی اہمیت پر مستقل تقریریں کریں، گورنمنٹ سے استدعا کریں کہ جامع افراد کی قیمت کچھ گراں قرار دے

اِسی کے ساتھ طلبا کو وقیع وظیفہ دیا جائے ،معمولی ایم اے عربی کیلئے
جب کہ وظائف کی ایک اچھی رقم دی جاتی ہے جس کی بدولت چند
اشخاص عربی کے ایم اے میں دکھائی دیتے ہیں تو اسلامک اسٹڈیز کی
بنیاد بغیر وظائف کیوں کر استوار ہو سکے گی،تقریر وتحریر سے دلوں میں
تحریک پیدا کیجئے اور اچھی تعلیم اور وقیع وظیفے سے اِس تحریک کو دلوں
میں ثبات وقرار کی قوت عطا کیجئے۔گورنمنٹ سے یہ استدعا کرکے کہ
عربی ایم اے سے اسلامک اسٹڈیز کی سند بالاتر سمجھی جائے اِس شعبہ کا
رسوخ واحترام پیدا کیجئے۔''(۳۰)

مذکورہ تجاویز پیش کرتے ہوئے آپ نے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کیلئے تین الگ الگ شعبوں کے قیام کوضروری قرار دیااوراِن کیلئے نصابِ تعلیم بھی متعین کیا۔اِس متعین کردہ نصاب کے پہلے حصے میں سب سے پہلے عربی زبان کوفن ادب کی حیثیت سے داخل نصاب کیا گیا۔دوسرے حصے میں علوم اسلامیہ کی جوتفصیل درج کی گئی اُس میں ادب،منقول اورمعقول کو بحیثیت فن پڑھانے کی وکالت کی گئی اور تیسرے حصے میں اُن ماقبل اسلام علوم کوشامل کیا گیا جنھیں مسلمانوں کی سرپرستی نے بام عروج پر پہنچادیا۔اوراِس میں منطق،عنصریات، فلکیات،الٰہیات اور ریاضی کے جملہ مضامین کوبھی کو شامل کیا گیاہے،جبکہ علم کلام،تصوف، تاریخ،جغرافیہ،طب کوبھی اسی حصے میں رکھا گیاہے۔

مگرآپ کے مرتب کردہ مذکورہ تینوں اسلامک اسٹڈیز کیلئے مجوزہ شعبے اوراُن کے نصاب وائس چانسلر صاحب زادہ آفتاب احمد خان کے نزدیک ناقابل قبول قرار پائے اور یہ ساری اسکیمیں اورتجاویز اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے یونیورسٹی کیلئے مفید ثابت نہ ہوسکیں۔بعد میں وائس چانسلر کی جانب سے آپ کو بی اے کلاس کیلئے ایک ایسے نصاب کی تیاری کا حکم دیا گیا جو اسلامی تاریخ اور فلسفے پرمبنی ہواور جسے بی اے کے طلبا عربی اور فارسی مضامین کے متبادل کے طور پراختیار کرسکیں۔چنانچہ آپ نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ایک بار پھر اِس منصوبے پرکام کیا اورتینوں شعبوں کے الگ الگ نصاب تعلیم اور اسمائے کتب تجویز

کرتے ہوئے واضح کردیا کہ:

''اگرچہ اِس ترتیب نصاب پر''دست و پایم بشکستند و کمانم دادند''
(انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں توڑ دیے اور مجھے میری کمان دے دی)
صادق آئے گا،مگر المامور معذور''(۳۱)

الغرض سیّد سلیمان اشرف نے اِس یادداشت میں جدید علوم وفنون اور زبان و بیان کے علاوہ عربی زبان کی ضرورت اورمحاسن وفضائل کے ساتھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کیلئے نصابِ علوم اسلامیہ کا مفہوم وتفصیل بشمول علم کلام،تصوف،تاریخ وجغرافیہ اورطب وغیرہ کے فروغ واطلاق کا طریقۂ کار ہی بیان نہیں کیا بلکہ آپ نے علم ریاضی،علم ہندسہ،علم العدد،علم العدد کے دواہم شعبے اصول اعداد وارثماطیقی اورعلم ہیئت وعلم ہیئت میں مسلمانوں کے میلان وتحقیق اور کارناموں پربھی سیر حاصل گفتگو کی اورنصابِ تعلیم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، نصابِ تعلیم اسلامک اسٹڈیز شعبۂ معقول فن حکمت اورشعبۂ اسلامک ہسٹری کیلئے توجیہ وتعلیل تعین نصاب کا عملی خاکہ بھی پیش کیا۔

بلاشبہ آپ کی یہ یادداشت خطے میں مسلمانوں کی تعلیمی زندگی اور خاص طور پر مطالعاتِ اسلامی کے نشیب وفراز،ماضی کی کوششوں وکاوشوں،جدوجہد وعزائم اورمقاصد کو ہی ہمارے سامنے نہیں لاتی بلکہ اسلامی تعلیمات کے فروغ ونفاذ کا جذبۂ تحریک بھی دیتی ہے۔

سیّد صاحب کامقصود ومطلوب نظامِ تعلیم

دراصل سیّد سلیمان اشرف ایک ایسا نظام تعلیم چاہتے ہیں جس میں مشرق ومغرب کی ساری خوبیاں مجتمع ہوں اور وہ اُن نقائص سے یکسر پاک ہو جومشرق یا مغرب کے نظام تعلیم میں پائے جاتے ہیں۔سید صاحب چاہتے تھے کہ یہ تعلیم کتاب وسنت کی روشنی میں دی جائے تاکہ ان علوم سے جوفکری ونظری استعداد پیدا ہو وہ کج روی اور گمراہی سے مملونہ ہواور ان کے ذریعہ جوعلمی قوت حاصل ہو وہ دنیا کے اندرفساد کا سبب نہ بنے۔آپ چاہتے تھے کہ مسلمان طلبا سائنس اور فلسفہ وغیرہ کو مرعوبانہ ومقلدانہ ذہنیت کے ساتھ نہ حاصل کریں بلکہ وہ اِن کوایمانی بصیرت اورمومنانہ فراست کے ساتھ اپنے اندر جذب کریں۔پروفیسر دلاور خان

(پرنسپل کالج آف ایجوکیشن ملیر کراچی و جوائنٹ سکریٹری ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی)
سیّد سلیمان اشرف کی اِس فکر کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کے سائنسی میدان میں پیچھے رہ جانے کا ایک بنیادی سبب قرآن کے تصورِ کائنات کے مطالعہ کا ناپید ہونا ہے۔ اِس مذہبی کوتاہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ اپنی کج فہمی کی بنیاد پر سائنسی تعلیم کے حصول کو غیر اسلامی سمجھتا ہے۔ مطالعہ قرآن کے برعکس سائنس سے دور رہنا عین اسلام قرار دیتا ہے۔ اِس فکر نے اُمت مسلمہ کو قرآن کی سیکڑوں تکوینی آیات سے مستفید ہونے سے محروم کردیا۔ جب کہ مسلمانوں کا ایک قلیل طبقہ معرفت الٰہی سے عاری سائنس کے مطالعہ کا عادی ہے۔ یہ دونوں طبقات قرآن کی سیکڑوں تکوینی آیات سے انحراف کرتے دکھائی دیتے ہیں اور یہ کسی طرح بھی مسلم اُمّہ کے لوازماتِ حیات اور بقائے حیات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام دکھائی دیتے ہیں، اِن کی یہ کج فہمی مسلم اُمّہ کے زوال کا باعث ہے۔ سیّد سلیمان اشرف سائنسی تعلیم کو شجر ممنوعہ قرار دینے والوں کو مسلم اُمّہ کیلئے سم قاتل سمجھتے ہوئے قرآن کی روشنی میں اُن کی ذہنی، فکری اور مذہبی تربیت کرتے ہیں۔" (۳۲)

اِس مقام پر پروفیسر دلاور خان "الخطاب" کے مندرجہ ذیل پیراگراف کو بطور حوالہ استعمال کرتے ہیں جس میں سیّد سلیمان اشرف لکھتے ہیں:

"کیا سائنس الٰہی اِس اَمر کو منکشف نہیں کرتا کہ کس چیز کو ہم کس طرح کام میں لائیں؟ اگر یہی بات ہے اور ضرور یہی بات ہے تو میں ڈنکے کی چوٹ سے کہتا ہوں کہ تمدن و سائنس کی سنگ بنیاد قرآن کریم کی یہی تعلیمات ہیں۔ سائنس پڑھنا، اُس میں کمال پیدا کرنا، حقیقت میں مسخرہ مخلوق سے مستفید ہونا ہے اور اُن کے مسخر ہونے کو بامعنی بنانا

ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ قرآن ہمیں جن اُمور کی طرف رہنمائی کرے، جن سے بہرہ مند ہونے کی ترغیب دلائے ہم اُسے مذہب کے خلاف سمجھیں، تو پھر کھانا پینا، پہننا، رہنا سب دشوار ہوجائے گا۔" (۳۳)

مذکورہ حوالے کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ جدید عصری علوم کے سلسلے میں پروفیسر سلیمان اشرف کسی تنگ نظری کے قائل نہ تھے۔ بلکہ آپ سائنس اور معرفت الٰہی کو لازم وملزوم قرار دیتے ہیں۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ آپ کی کتاب "الخطاب" کا مطالعہ مسلم سائنس دان اور طالب علم کی قابلیت کے کمال کا اسلامی معیار متعین کرتا ہے اور اُنہیں اِس جانب راغب کرتا ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے کائنات کی تمام جان دار اور بے جان اشیا کے حقائق کے اسباب وعلل اور فوائد دریافت کرکے مسلم اُمّہ کو اِس قابل بنائے کہ وہ ترقی یافتہ اقوام کی سائنسی میدان میں قیادت وسیادت کرسکے۔ پروفیسر دلاور خان کے بقول:

"علامہ کے سائنسی افکار کا ایک نہایت ہی اہم نکتہ جو سیکولر سائنس سے اسلامی سائنس کو ممیّز وممتاز کرتا ہے، وہ مظاہر فطرت شناسی کے ساتھ ساتھ خدارسی کا تصور ہے۔ سائنسی میدان میں صرف اُس سائنس میں مسلمانوں کے درد کا درماں ہے جو خدا تک رسائی کا زینہ ہو۔ خلق میں محو ہوکر اُس کے خالق کو فراموش کردینا تمام سائنسی مسائل کی جڑ ہے۔ آپ مطالعہ سائنس میں خلق اور اُس کے خالق کی معرفت کو لازم وملزوم قرار دیتے ہیں۔ یہی فکر اسلامی فلسفۂ سائنس کی تشکیل کا نکتہ آغاز ہے۔" (۳۴)

سیّد سلیمان اشرف مغرب کے لادینی کے نظام تعلیم کو اس لیے غیر مؤثر اور بے روح خیال کرتے ہیں کہ اُس نے علم کے نام پر دین اور تہذیب کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اُن کے نزدیک یہ طرز تعلیم مذہب واخلاقیات کے خلاف ایک منظم سازش ہے۔ جس نے نئی نسل کو غلامانہ ذہنیت اور تنگ نظری کا شکار بنادیا تھا۔ اِس طریقہ تعلیم میں پڑھانے والوں میں نہ افکار کی ندرت ہے، نہ خیال کی جدت، نہ علم کی گہرائی، یہی حال پڑھنے والوں کا

ہے کہ نہ اُن میں تحصیلِ علم کا شوق ہے اور نہ ہی حقائق سے آشنا ہونے کی جستجو ہے۔

اِس لیے آپ نظامِ تعلیم کے ذمہ داران اور اداروں سے چاہتے تھے کہ وہ اپنے نظامِ تعلیم اور طریقۂ تدریس میں مغرب کی اندھی تقلید و پیروی کے بجائے تجدید و اجتہاد سے کام لیں، خود کو نسلی، لسانی اور علاقائی تعصّبات سے باہر نکالیں اور اپنی درس گاہوں کیلئے ملّی حریت پسندی کے شایانِ شان ایسا نصابِ تعلیم مرتب کریں جس کے رہنما اصول قرآن و سنت سے ماخوذ ہوں۔

سیّد سلیمان اشرف نصاب و درس کے تعلق سے جدیدیت کے اور طریقہ تعلیم کے لحاظ سے قدیم طرز کے قائل ہیں۔ آپ کے تعلیمی فلسفہ کی بنیاد مشرقی افکار اور مغربی نظریات میں ہم آہنگی و توازن پر مبنی ہے۔ نصاب اور طریقہ تعلیم کے حوالے سے آپ کی رائے بڑی معتدل اور معقول ہے۔ ایک عالم دین اور مشرقی اقدار کے علمبردار ہونے کے باوجود سیّد سلیمان اشرف جدید علوم و ٹیکنالوجی کے حصول کو مسلمان قوم کی ترقی کیلئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔

آپ کے نزدیک جدید عصری علوم سے دوری اور اجتناب کا نظریہ درست نہیں۔ آپ جانتے تھے کہ علوم جدیدہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کر کے معاشی و معاشرتی استحکام کا ہی سبب نہیں بنیں گے بلکہ اِس کے حصول سے فہم و آگہی کے کھلنے والے دروازے مسلمانوں کی سیاسی بیداری اور حصول آزادی کیلئے بھی معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

چنانچہ آپ برِعظیم کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے ہوئے انہیں احساس دلاتے ہیں کہ ہندو قوم اِس لیے ہم سے آگے نکل گئی ہے کہ اُس نے وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو جدید تعلیمی ضرورتوں سے ہم آہنگ کیا۔ جبکہ ہم ابھی تک اِس کی اہمیت و افادیت سے آشنا ہی نہیں ہوئے اور اگر ہوئے بھی تو ہماری حالت انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ اِس صورتحال کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انگریزی سلطنت جب اپنے ساتھ علوم مغربیہ ہندوستان میں لائی تو ہندوستانیوں نے دیکھا کہ اب بقا اور نمود کی زندگی بغیر علوم مغربی حاصل کیے ناممکن ہے، تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوؤں نے بڑھ کر تعلیم

انگریزی کا استقبال کیا اور خوش آمدید کا نعرہ بلند کیا۔ جب اِس قوم کے ایک خاص حلقہ میں یہ تعلیم پھیل گئی اور انگریزی واقف کار کچھ ہندوؤں میں تیار ہوگئے تو اُن میں احساس پیدا ہوا اور حکومت کے انداز فرماں روائی پر نکتہ چینی شروع کی، اپنے حقوق کے باب میں صدائے احتجاج بلند کی، ہوم رول، سلف گورنمنٹ یا سوراج کا تخیل سب سے پہلے علم مغربی سے آشنا دماغ میں آیا۔ حکومتِ خود مختاری کی صدا بھی جس نے اپنے منہ سے نکالی اور ہندوستان کے رہنے والوں کو یہ سامعہ نواز نغمہ جس نے سنایا وہ انگریزی دان ہندوستانی تھا۔ کانگریس جو سوراج کا سنگ بنیاد ہے اس کی تاسیس اور پھر اس عمارت کی تعمیر و تکمیل جن ہاتھوں نے کی وہ سب انگریزی خواں اور انگریزی داں ہیں۔ مسلمانوں میں جب علوم مغربیہ کا آغاز ہوا اور پھر ان میں بھی ایک تعداد تعلیم یافتوں کی تیار ہوگئی تو احساس و تاثیر یہاں بھی ظاہر ہونے لگے لیکن افسوس

ہم ابھرتے ہوئے جھونکے میں خزاں کے آئے۔(۳۵)

دراصل سیّد سلیمان اشرف اِس اَمر کو پا چکے تھے کہ صرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم کی ترقی واعلیٰ کامیابی کا راز اور دارومدار صرف اور صرف مسئلہ تعلیم کے عمدہ طریقے سے حل ہونے پر مبنی ہے۔ آپ جانتے تھے کہ دنیا میں وہی قومیں عروج حاصل کرتی ہیں جو زیورِ تعلیم سے آراستہ و پیراستہ ہوں۔ آپ نے مسلمانانِ ہند کے خیالات کی اصلاح کی۔ اور پرزُور مضامین و خطبات کے ذریعے ایسے اوہام و خیالاتِ فرسودہ کی نہ صرف تردید کی بلکہ ثابت کیا کہ مذہب علوم جدیدہ کا مخالف نہیں ہے۔

چنانچہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اٹھائیسواں سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے مسلم معاشرے میں در آنے والی خرابیوں کا ہی ذکر نہیں کیا بلکہ مسلم اُمہ کی زبوں حالی کا مرض تشخیص کر کے اُس کا تریاق بھی تجویز کیا۔ آپ نے لکھا:

''جب مسلمان اپنے دستور العمل سے جو خدا نے اُن کے صلاح معاش

و معاد کیلئے بھیجا تھا ہٹنے لگے تو سب خرابی آہستہ آہستہ اُن میں آنے لگی۔اب نہ علم ہے نہ تجارت، نہ صنعت ہے نہ زراعت، ہائے ہائے کیا کرو یا اسلاف کے کارنامے پڑھ کر فخر ومباہات کرتے رہو، اِس سے کیا ہوتا ہے۔عزیزو! جس طرح کل کا کھانا آج کی بھوک کو رفع نہیں کرتا، اُسی طرح گزشتہ اقبال کا تذکرہ آج ہمیں اقبال مند نہیں بنا دے گا۔ جس طرح میت پر نوحہ کرنے سے اُس کی مراجعت نہیں ہوئی، اسی طرح ہائے وائے کرنے سے وہ نعمت اسلامی واپس نہیں آتی ۔

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدی وصال
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

ہاں اسی چیز کو پھر حاصل کرو جس کے طفیل سب کچھ گیا تھا، بغیر اس کے ترقی محال ہے اور یہ استحالہ کا حکم میں نہیں دے رہا ہوں بلکہ قرآن کریم کا یہ فتویٰ ہے اور یہ وہ فتویٰ ہے جس کا مشاہدہ تم ہر روز ہر شخص میں کیا کرتے ہو۔اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْ امَابِاَنْفُسِھِم۔ اِن جذبات کو جو ہمارے نفوس میں ودیعت کیے گئے ہیں جب تک ہم صحیح راہِ اعتدال پر نہ لائیں گے ہرگز ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔(۳۶)

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

آپ دعوت غور وفکر دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

''اے حضرات غور کرو، یہ بے سروپا زندگی کب تک۔ہفوات و لایعنی کلمات کا ورد کہاں تک۔عمر گراں بہا کا صرف کس حد تک۔ آؤ اپنی زندگی کا کوئی مقصد قرار دیں تا کہ ہمارے اقوال و افعال ایک محور پر گردش کریں۔''(۳۷)

یہ درست ہے کہ کسی معاشرے کی ایک بہتر، مہذب، منصفانہ اور پرامن ترقی کے

سفر کی جانب پیش قدمی علماء و اہل علم و دانش کے بغیر ممکن نہیں۔علماء و اہل علم ہی وہ طبقہ ہے جو لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے علم روشنی کی طرف لے کر جاتا ہے۔شعور وفکر کے دریچے وا کرتا ہے اور معاشرتی مسائل و الجھنوں کو اپنی فکری صلاحیتوں سے سلجھاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایسے معاشرے جو علم، فکر، دلیل، فلسفہ اور تحقیق کی بنیاد پر آگے بڑھتے ہیں اُن میں علماء اور اہل علم و دانش کو بڑی قدر اور پزیرائی حاصل ہوتی ہے۔سیّد سلیمان اشرف اہل علم اور علماء کی معاشرتی ضرورت کو اجاگر کرتے ہیں اور اُنہیں زمانہ حال کے اہل علم کی اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے ''السبیل'' میں ''چند لبِ بام علمی آفتاب'' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

''چند ہستیاں ہنوز ایسی موجود ہیں جو صحت و استعداد اور جید مطالعہ کے ساتھ اپنے فیضِ علم کو طالبِ صادق تک متعدی کرسکتی ہیں۔لیکن اِن حاملانِ علم کی مثال آفتاب لبِ بام کی ہے اپنی زندگی کا دور پورا کر چکے ہیں اور ہماری بدشوقی و بدنصیبی کا منحوس منظر دیکھتے دیکھتے ایسے تھک گئے ہیں کہ زاویہ عزلت میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز اور اپنے ربّ قدیر کی جناب میں مصروفِ دعا گوئی اُمت مرحومہ ہیں کاش اب بھی مسلمان بیدار ومتنبہ ہوں اور اِن متبرک ہستیوں کے سینہ میں جو زر وجواہر کا خزینہ مکنون ہے اور وہ صرف انہی مسلمانوں کی بے بہا میراث ہے اُسے تہ خاک ہونے سے بچالیں تو اُن کی قومیت کچھ دنوں تک اور بھی بقاء کا فیض پاسکے گی۔ورنہ جب یہ آفتاب غروب ہوجائے گا تو پھر تاریک شب کی سیاہی مسلمانانِ ہند کی قومیت پر ایسی چھا جائے گی کہ چراغ وشمع کا تو کیا ذکر برقی روشنیاں بھی اُن کے خدوخال اور شکل وصورت کو عیاں نہ کرسکیں گے۔''(۳۸)

اسلامی فلسفۂ کامیابی وکامرانی

اسی تقریر میں سیّد سلیمان اشرف نام نہاد مذہبی و سیاسی لیڈروں کی جانب سے اُمت کی فلاح و بہبود کیلئے اُن کے تجویز کردہ حل کو ''شد پریشان خواب من از کثرت تعبیر ہا''

کے عنوان کے تحت رد کرتے ہوئے فلسفہ کامیابی و کامرانی یوں بیان کرتے ہیں کہ آج:

''اصلاح قوم کیلئے کوئی تجارت کی رغبت دلاتا ہے۔ کوئی علوم مغربی کے سحر آفریں فضائل سناتا ہے۔ کوئی علوم مشرقی کی ہدایت کرتا ہے۔ کوئی صنعت و حرفت کی طرف مائل کرتا ہے۔ لیکن خدا تو یہ فرماتا ہے کہ تم میرے مطیع ہو جاؤ پھر سب چیزیں تمہاری تابع فرمان ہو جائیں گی۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ (۳۹)

(یعنی تم بھی خدا کے حکم سے سرکشی نہ کرو تاکہ کوئی بھی تمہارے حکم سے سرتابی نہ کرے) تم اللہ کے ہو جاؤ تمام چیزیں تمہاری ہو جائیں گی۔ تم اللہ سے پھر جاؤ گے تمام نعمتیں تم سے منہ موڑ لیں گی۔

انیسویں اور بیسویں صدیاں ہندوستانی قوموں کی نشاۃ ثانیہ اور برّصغیر کے باشندوں کی سیاسی، سماجی، علمی اور اقتصادی ترقی کا نقطہ عروج ہیں۔ ان دونوں صدیوں میں پیدا ہونے والے اور اپنی قوم و ملت کی تاریخ اپنے خون جگر سے لکھنے والے اصحاب فکر کی تعداد یوں تو سیکڑوں میں ہے لیکن ملک و ملت کی ترقی و خوشحالی اور سماجی و سیاسی استحکام اور تعلیمی شعور کی بحالی کیلئے انتھک کوششیں کرنے والی شخصیات کی فہرست میں پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف کا نام نمایاں ہے۔

سیّد سلیمان اشرف نے برّعظیم کے مسلمانوں کو دینی و عصری تعلیم کی روشنی میں ایک صحیح قومی شاہراہ پر چلنے کی ترغیب دی اور برطانوی حکومت کے ظلم و استبداد سے نجات کا راستہ بتاتے ہوئے من حیث القوم اپنی شناخت بنائے رکھنے کے لیے راہ بھی ہموار کی۔ یہ آپ کی مومنانہ بصیرت و آگہی ہی تھی جس نے براہ راست طاغوتی طاقتوں سے ٹکراؤ کے بجائے مسلمانوں میں دینی و عصری علوم کے رجحان کے فروغ کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ جس سے طلبا میں انگریزی تسلط سے آزادی کا فکری شعور پیدا ہوا اور وہ مسلم لیگ کا دست و بازو بن کر قیام پاکستان کی تحریک کے ہراول دستے میں شامل ہوئے۔

قائداعظم محمد علی جناح نے اِن ہی عوامل کی بنیاد پر نوجوانان علی گڑھ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''علی گڑھ میری تحریک کا مرکز ہے۔ یہیں سے میرے نوجوان سفیر برّاعظم ہندوستان کے ہر کونے میں جاکر مسلمان عوام کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ اِن کا مشنری جذبہ اور تحریک سے بے لوث لگاؤ ہی میری ساری متاع ہے۔ میں علی گڑھ دس کام چھوڑ کر آتا ہوں اور اِن بچوں کی صحبت میں بیٹھ کر اور اِن سے باتیں کرکے اپنے عزم اور ارادے میں تقویت حاصل کرتا ہوں۔'' (۴۰)

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۱۱ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک برّعظیم کی ملّی تاریخ کے پُرخطر اور ہر کٹھن مرحلے میں ہمیں سیّد سلیمان اشرف کا ہی آہنگ سنائی دیتا ہے، جو اُن کی غیر معمولی دینی غیرت و حمیت اور مومنانہ حق گوئی و بے باکی پر شاہد و عادل ہے۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص: ۱۸۵۔۱۸۴

(۲) غلام السیدین، خواجہ، علی گڑھ کی تعلیمی تحریک، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۳۱ء، ص: ۷۔۶

(۳) احسن اقبال، ڈاکٹر، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۳ء، ص: ۳۹

(۴) طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، حماد الکتبی، شیش محل روڈ لاہور (س ن) ص: ۱۶۴۔۱۶۲

(۵) بقول پروفیسر سید محمد سلیم "لارڈ میکالے کے نظام تعلیم کو اگر تعلیم برائے ملازمت کا عنوان دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔" بحوالہ، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ' ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۸۹ء، ص ۱۱۹۔

(۶) نجیب جمال، یگانہ، ڈاکٹر، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، اظہار سنز لاہور، ۲۰۱۳ء، ص: ۴۷

(۷) عبدالحق، مولوی، خطبات عبدالحق، گلڈ، انجمن کتاب گھر وکٹوریہ روڈ کراچی، ۱۹۶۴ء، :۴۰۴

(۸) آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی صد سالہ تاریخی ڈائری، ۱۸۸۶ء لغایۃ جون ۱۹۸۶ء، مرتبہ سید الطاف علی بریلوی، طبع کراچی، ص: ۹۔۸

(۹) انوار احمد زبیری، مولوی، دیباچہ خطبات عالیہ حصہ اوّل، ص: ۲۰، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ ۱۹۲۷ء

(۱۰) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص: ۱۹۔ ۱۸۔ ۱۷

(۱۱) ایضاً ص: ۴۰۔۳۹

(۱۲) ایضاً ص: ۲۳۔۲۲

(۱۳) ابوسلمان شاہجہان پوری، ڈاکٹر، فیضان ابوالکلام آزاد، مکی دار الکتب میکلیگن روڈ لاہور ۲۰۰۴ء، ص: ۲۵۲

(۱۴) ایضاً ص: ۲۵۲

(۱۵) میاں عبدالرشید، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۲ء، ص: ۱۱۴۔۱۱۰

(۱۶) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص: ۱۹۳

(۱۷) ایضاً ص: ۱۹۴

(۱۸) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص: ۱۸، دیکھیے دیباچہ کا حاشیہ

(۱۹) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، السبیل، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴ء طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۱۴ء، ص: ۳۲

(۲۰) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، الرشاد، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، طبع جدید دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء، ص: ۱۹

(۲۱) ایضاً ص: ۱۹

(۲۲) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، السبیل، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۱۴ء، ص: ۲۴

(۲۳) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء، ص: ۲۴۔۲۳

(۲۴) ایضاً ص: ۲۸

(۲۵) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، السبیل، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۱۴ء، ص: ۱

(۲۶) ایضاً ص: ۵۔۴

(۲۷) ایضاً ص: ۷۔۶

(۲۸) ایضاً　ص:۲۵

(۲۹) ایضاً　ص:۲۵

(۳۰) ایضاً　ص:۲۵

(۳۱) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، السبیل، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۱۴ء، ص:۴۱

(۳۲) دلاور خان، پروفیسر، مضمون، اسلامی فلسفہ سائنس کی تشکیل میں پروفیسر سلیمان اشرف کا کردار، ماہنامہ معارف رضا، مارچ ۲۰۱۷ء جلد ۱۸، شمارہ ۳، ص:۳۸۔۳۳

(۳۳) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶، ص:۲۲

(۳۴) ایضاً　ص:۳۸۔۳۳

(۳۵) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۱۹۳۔۱۹۲

(۳۶) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶، ص:۱۹

(۳۷) ایضاً　ص:۳۸

(۳۸) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، السبیل، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۱۴ء، ص:۱۹۔۱۸

(۳۹) ایضاً　ص:۲۴

(۴۰) علی گڑھ اور تحریک آزادی، نواب مشتاق احمد خان، ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۶۹ء، بحوالہ کرامت علی خاں۔ جہاد آزادی، لاہور ۱۹۹۵ء۔ ص:۱۱۲

باب پنجم

تحریک ترک گاؤکشی اور تحفظ شعائر اسلامیہ

تحریکِ ترکِ گاؤ کشی اور تحفظِ شعائر اسلامیہ

مسئلہ قربانی گاؤ ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔قدیم ہندوستان کے ویدک ادب میں ایسی کئی شواہد ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں بھی گائے کے گوشت کا استعمال کیا جاتا تھا اور ''یگیہ'' (ایک مذہبی تقریب) کے موقع پر گائے کی قربانی دی جاتی تھی۔اُس وقت یہ بھی رواج تھا کہ اگر مہمان آجائے یا کوئی خاص شخص آجائے تو اُس کے استقبال میں گائے کوذبحہ کیا جاتا تھا۔شادی بیاہ کی رسم میں یا پھر گھر یاس (نئے گھر میں آباد ہونے کی رسم) کے وقت بھی گائے کا گوشت کھلانے کا رواج عام ہوا کرتا تھا۔یعنی عہد گپت (۵۵۰۔۲۳۰ء) سے قبل گائے کی قربانی مخصوص تقریب کا حصہ ہوتی تھی۔

مورخین کے مطابق ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہزار سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں ہندو معاشرے میں جانوروں کی قربانی ایک عام سی بات تھی۔یہ تبدیلی اُس وقت آئی جب سب سے پہلے گوتم بدھ نے ہندوؤں کے اس طرز عمل کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے نظریہ ''اھمسہ'' کی بنیاد رکھی۔حالانکہ گوتم بدھ نے نہ تو کبھی گائے کی عبادت کی اور نہ ہی اُسے ماتا کا درجہ دیا،مگر وہ جانوروں کی بے جا قربانیوں کے خلاف تھا۔یوں گوتم بدھ نے دنیا میں ایک ایسے نظریے کی بنیاد رکھ دی جس نے ایک گائے کے ذبیحہ پر برعظیم کے مسلمانوں کا جینا دوبھر کردیا۔

تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر دیجندر نارائن جھا نے جب اِن سچی مگر کڑوی باتوں کا ذکر اپنی کتاب "Holy Cow:Beef in Indian Dietary Traditions' میں کیا تو ہندو انتہاپسند اُن کی جان کے در پے ہوگئے۔جبکہ خود

تحریکِ ترکِ گاؤ کشی اور تحفظِ شعائر اسلامیہ

مسئلہ قربانی گاؤ ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔قدیم ہندوستان کے ویدک ادب میں ایسی کئی شواہد ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں بھی گائے کے گوشت کا استعمال کیا جاتا تھا اور ''یگیہ'' (ایک مذہبی تقریب) کے موقع پر گائے کی قربانی دی جاتی تھی۔اُس وقت یہ بھی رواج تھا کہ اگر مہمان آجائے یا کوئی خاص شخص آجائے تو اُس کے استقبال میں گائے کوذبحہ کیا جاتا تھا۔شادی بیاہ کی رسم میں یا پھر گھر باس (نئے گھر میں آباد ہونے کی رسم) کے وقت بھی گائے کا گوشت کھلانے کا رواج عام ہوا کرتا تھا۔یعنی عہد گپت (۵۵۰۔۲۳۰ء) سے قبل گائے کی قربانی مخصوص تقریب کا حصہ ہوتی تھی۔

مورخین کے مطابق ہندوؤں کی مقدس کتابوں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہزار سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں ہندو معاشرے میں جانوروں کی قربانی ایک عام سی بات تھی۔یہ تبدیلی اُس وقت آئی جب سب سے پہلے گوتم بدھ نے ہندوؤں کے اِس طرز عمل کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے نظریہ ''اھمسہ'' کی بنیاد رکھی۔حالانکہ گوتم بدھ نے نہ تو کبھی گائے کی عبادت کی اور نہ ہی اُسے ماتا کا درجہ دیا،مگر وہ جانوروں کی بے جا قربانیوں کے خلاف تھا۔یوں گوتم بدھ نے دنیا میں ایک ایسے نظریے کی بنیاد رکھ دی جس نے ایک گائے کے ذبیحہ پر برعظیم کے مسلمانوں کا جینا دوبھر کردیا۔

تاریخ پر گہری نظر رکھنے والے دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر وبجندر نارائن جھا نے جب اِن سچی مگر کڑوی باتوں کا ذکر اپنی کتاب ''Holy Cow:Beef in Indian Dietary Traditions'' میں کیا تو ہندو انتہاپسند اُن کی جان کے در پے ہوگئے۔جبکہ خود

پروفیسر جھا اِس تصور سے بھی اختلاف رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں گاؤکشی مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوئی۔اُن کے اِس مؤقف کی تصدیق اِس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مسلم حکمرانوں نے اکثر و بیشتر ہندوؤں کے مذہبی جذبات کے احترام اور متعدد موقعوں پر اُن کی حمایت حاصل کرنے کیلئے گائے کی قربانی سے اجتناب برتا۔(۱)

گائے سے ''ماتا'' کا روپ

پروفیسر جھا کا ماننا ہے کہ گائے نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جا کر جانور سے ماتا کا روپ دھارا اور اُس کے نام پر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہونے لگا۔ پروفیسر کانچا ایلیاہ بھی یہی رائے رکھتے ہیں کہ تاریخی طور پر برہمن سمیت تمام ہندو ویدک اور ویدک کے بعد کے ادوار میں گائے کا گوشت کھایا کرتے تھے۔

بھارتی آئین کی تیاری میں شریک ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی کتاب میں وید، رامائن اور مہابھارت جیسی کتابوں کے حوالوں سے ثابت کیا کہ ماضی میں ''The Myth of Holy Cow'' کھانے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ محقق دیو چندرا نرائن بھی اپنی کتاب میں یہی لکھتے ہیں کہ ہندو گائے اور بیل کی نہ صرف قربانی کرتے تھے بلکہ اُس کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ کیونکہ ہندو مذہب کی کسی کتاب میں یہ کوئی جرم نہیں تھا اِس لیے زمانہ قدیم میں اِس پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔(۲)

جب برعظیم میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو اُس دور میں مسلمان نا صرف گائے کا گوشت کھاتے تھے بلکہ عید قربان پر اُس کی قربانی بھی کیا کرتے تھے۔لیکن بادشاہ اکبر (۱۵۵۶۔۱۶۰۵ء) کے دور میں جب دیگر اسلامی احکام کے ساتھ جزیہ کی موقوفی اور گائے کی قربانی پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔تو علمائے حق نے اکبر کے اِس غیر اسلامی فعل کے خلاف سخت مزاحمت کی اور شیخ احمد سرہندی حضرت مجدد الف ثانیؒ نے قربانی گاؤ کو شعائر اسلام میں شمار کیا۔

حضرت مجدد الف ثانی کا موقف تھا کہ ہندوستان میں گائے کی قربانی شریعت کا ایک اہم رکن ہے۔ اِس لیے اِس سے انکار شریعت سے انکار ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کیلئے لازمی

ہے کہ وہ قربانی کر کے اپنے فرض کی ادائیگی کریں۔

''پھر آپ ہی کی کوششوں سے جہانگیر بادشاہ کے زمانے میں یہ پابندی اٹھادی گئی اور قلعہ کانگڑہ میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کی موجودگی میں خود جہانگیر نے گائے ذبح کر کے اس پابندی کو عملاً ختم کیا۔''(۳)

چونکہ عید الاضحیٰ کے موقع پر گائے کی قربانی شعائر اسلام میں سے ہے اور یہ مسلمانوں کے نزدیک خالصتاً مذہبی معاملہ ہے جس سے روکنا اُن کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی اور مداخلت فی دین کے مترادف ہے۔لہٰذا مسلمانوں نے اِس شعائر اسلامی سے دست برداری کو کبھی پسند نہیں کیا اور گائے کی قربانی کا سلسلہ جاری رہا۔

اٹھارویں صدی میں مغل حکومت کے خاتمے نے برعظیم کی مسلم تہذیب وتمدن کے ساتھ ساتھ اُس کے سیاسی ساجی اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے کو بھی بری طرح متاثر کیا۔ مسلمان حاکم سے محکوم بن چکے تھے۔ انہیں اپنے دینی تشخص و شناخت کے ساتھ تحفظ و بقاء جیسے اہم مسائل درپیش تھے۔

چنانچہ اِن حالات میں جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں گائے کی قربانی جاری رہی۔مگر جن علاقوں میں مسلمان اقلیت اور ہندو غالب اکثریت میں تھے، وہاں مسلمانوں نے گائے کی قربانی کو ترک کردیا تا کہ ممکنہ فساد سے بچا جاسکے۔مگر اِس احتیاط کے باوجود مسلمانوں کو بے شمار خونریز فسادات کا سامنا کرنا پڑا، جس کے پس پردہ برعظیم کے نئے حکمران انگریز سرکار کا بھی ہاتھ رہا۔ جوکشیدگی کو بڑھاوا دینے کیلئے ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت گائے قربان کرتے اور مسلمان قصابوں کے نام سامنے کردیتے تھے۔(۴)

خود ملکہ وکٹوریہ نے ۸، دسمبر ۱۸۹۳ء کو اپنے وائسرائے ہند کو ایک رقعہ لکھ کر یہ راز فاش کیا کہ ''اگرچہ محمڈنز (مسلمانوں) کی گاؤکشی کو ہنگامہ کرانے کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے لیکن دراصل اِس کا رخ ہماری طرف ہوتا ہے جو محمڈنز کی نسبت اپنی فوج کیلئے کہیں زیادہ گائیں ذبح کرتے ہیں۔''(۵) چنانچہ برٹش گورنمنٹ کی ایما پر ۱۸۸۰ء میں قربانی کے موقع پر خونریز فسادات ہوئے۔ اسی طرح ۱۸۹۳ء میں پراعظم گڑھ میں سیکڑوں مسلمان مارے

گئے۔۱۹۱۲اور۱۹۱۳ء میں اجودھیا اور ۱۹۱۷ء میں شاہ آباد میں بھی ہزاروں مسلمان اِن فسادات کی نذر ہوئے۔قربانی گاؤ کے موقع پر خونریز فسادات کا سلسلہ آج بھی دنیا کے سب سے بڑے جمہوریت کے دعویدار بھارت میں جاری ہے۔

تاریخ داں ''ڈی این جھا'' کے مطابق،اصل قضیہ انیسویں صدی میں اُس وقت شروع ہوا جب ہندوؤں نے سیاسی طور پر اپنے آپ کو مضبوط کرنا شروع کیا۔اُن میں اصلاحی تحاریک نے جب زور پکڑا تو گائے ہندوؤں کو اکٹھا کرنے اور اُن کے جذبات کو ابھارنے کا ایک بہترین ذریعہ بن گئی،حتیٰ کہ گائے کے تحفظ کیلئے آرگنائزیشنز بھی قائم کی گئیں۔جس کی ابتداء ۱۸۷۰ء میں پنجاب سے ہوئی، جس کے بعد ۱۸۸۲ء میں سوامی دیانند سرسوتی نے گورکھشنی سبھا قائم کی، جس میں گائے کو اتحاد کی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا۔(۶)

اِس پلیٹ فارم سے نا صرف ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو ابھارا گیا بلکہ مسلمانوں کو بھی خبردار کیا گیا کہ وہ گائے کی قربانی ترک کردیں۔چونکہ ہندو اِس معاملے میں انتہا پسندانہ رویہ رکھتے تھے اور وہ گائے کی قربانی کو اپنے مذہب پر حملہ خیال کرتے تھے اِس لیے انہوں نے قربانی گاؤ کو مذہبی سے زیادہ سیاسی رنگ دیا۔اب ہندوستان کی گائے صرف گائے نہیں رہی تھی بلکہ ہندوؤں کی جانب سے گائے کو ایک مقدس مذہبی علامت کے طور پر پیش کیا جانے لگا تھا۔اور وہ بھولی بھالی گائے کے دائرے سے نکل کر'' گاؤ ماتا'' کے مقام پر فائز ہو چکی تھی۔

یعنی ایک ایسی گاؤ ماتا جس کی حفاظت ہندووں کے نزدیک اپنی ماں سے بھی بڑھ کر تھی۔یوں یہ سارا تنازعہ انیسویں صدی میں اُس وقت شروع ہوا جب آریہ سماج کی تشکیل ہوئی اور سوامی دیانند سرسوتی نے ''گئورکشا'' کیلئے مہم چلائی اور کانگریس نے سیاسی اثر ورسوخ حاصل کرکے برعظیم کے سیاسی حالات پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی۔

قربانی گاؤ کے خلاف اہل ہنود کی مکارانہ سازشیں

ممتاز مورخ اور ماہر رضویات پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد قربانی گاؤ کے خلاف ہندوؤں کی پیہم اور مسلسل تگ ودو کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوؤں نے ایک بار پھر کوشش کی

کہ گائے کی قربانی پر پابندی لگادی جائے۔یہ وہ وقت تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کا قیام بھی عمل میں نہ آیا تھا۔ہندوؤں نے گائے کی قربانی سے متعلق علمائے ہند سے فتوے لیے مگر مسلمانوں کے پردے میں۔چنانچہ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء کو مراد آباد سے مولانا بریلوی کے پاس ایک استفتا آیا جس میں گائے کی قربانی سے متعلق متعدد سوالات تھے۔''(۶) سائل نے لکھا ''کیا فرماتے ہیں علمائے دین مذہب حنفیہ اِس مسئلہ میں کہ گاؤ کشی کوئی ایسا اَمر ہے جس کے نہ کرنے سے کوئی شخص دین اسلام سے خارج ہوجاتا ہے یا اگر کوئی (شخص) معتقد اباحت ذبح ہو مگر کوئی گائے اُس نے ذبح نہ کی ہو یا گائے کا گوشت نہ کھایا ہو ہر چند کہ اکل (کھانا) اُس کا جائز جانتا ہو تو اُس کے اسلام میں کوئی فرق نہ آئے گا اور وہ کامل مسلمان رہے گا۔گاؤ کشی کوئی واجب فعل ہے کہ جس کا تارک گناہگار ہوتا ہے یا اگر کوئی شخص گاؤ کشی نہ کرے صرف اباحت ذبح کا دل سے معتقد ہو تو وہ گناہگار نہ ہوگا۔جہاں بلاوجہ اِس فعل کے ارتکاب سے ثوران فتنہ وفساد اور مفضی بہ ضرر اہل اسلام ہو اور کوئی فائدہ اِس فعل پر مرتب نہ ہو اور عملداری اہل اسلام بھی نہ ہو وہاں بدیں وجہ اِس فعل سے کوئی باز رہے تو جائز ہے یا یہ کہ بلاسبب ایسی حالت میں بقصد اثارت فتنہ وفساد ارتکاب اس کا واجب ہے اور قربانی اونٹ کی بہتر ہے یا گائے کی۔؟''(۷)

محدث بریلوی کی ژرف نگاہی اور سیاسی فہم وتدبر

اِس سوال کی آڑ میں اہل ہنود کے ناپاک عزائم اور مقاصد کیا تھے، محدث بریلوی کی نگاہ بصیرت نے اُسے بھانپ لیا، چنانچہ آپ نے مستفتی کی اصل منشا ومدعا کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے مفصل جواب میں جو ارشاد فرمایا وہ ہنود کے فریب میں آنے والے جید علمائے کرام کیلئے رجوع اور زعمائے ملت وعوام الناس کیلئے دینی وسیاسی شعور کی بالیدگی کا سبب

بنا۔ محدث بریلوی لکھتے ہیں:

"(الف) گاؤ کشی اگرچہ بالتخصیص اپنے نفس ذات کے لحاظ سے واجب نہیں، نہ اِس کا تارک باوجود اعتقاد اباحت بنظر نفس ذات فعل گنہگار نہ ہماری شریعت میں خاص شے کا کھانا بالتعین فرض، مگر اِن وجوہ سے صرف اِس قدر ثابت ہوا کہ گاؤ کشی جاری رکھنا واجب لعینہ اور اس کا ترک حرام لعینہ نہیں، یعنی اِن کے نفس ذات میں کوئی اَمر اِن کے واجب یا حرام کرنے کا مقتضی نہیں۔ لیکن ہمارے احکام مذہبی صرف اسی قسم کے واجبات ومحرمات میں منحصر نہیں بلکہ جیسا اِن واجبات کا کرنا اور اِن محرمات سے بچنا ضروری وحتمی ہے یوں ہی واجبات ومحرمات لغیرہا میں بھی امتثال واجتناب اشد ضروری ہے، جس سے ہم مسلمانوں کو کسی طرح مفر نہیں اور ان سے بالجبر باز رکھنے میں بے شک ہماری مذہبی توہین ہے جسے حکام وقت بھی روا نہیں رکھ سکتے۔ ہم ہر مذہب وملت کے عقلاء سے دریافت کرتے ہیں کہ اگر کسی شہر میں بزور مخالفین گاؤ کشی قطعاً بند کردی جائے اور بلحاظ ناراضی ہنود اِس فعل کو کہ ہماری شرع ہرگز اِس سے باز رہنے کا ہمیں حکم نہیں دیتی یک قلم موقوف کیا جائے تو کیا اِس میں ذلت اسلام متصور نہ ہوگی، کیا اِس میں خواری ومغلوبی مسلمین نہ سمجھی جائے گی، کیا اس وجہ سے ہنود کو ہم پر گردنیں دراز کرنے اور اپنی چیرہ دستی پر اعلیٰ درجہ کی خوشی ظاہر کرکے ہمارے مذہب واہل مذہب کے ساتھ شماتت کا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ کیا بلاوجہ وجیہہ اپنے لیے ایسی دنائت وذلت اختیار کرنا ہماری شرع مطہر جائز فرماتی ہے؟ حاشا وکلا ...... ہرگز نہیں ...... نہ یہ متوقع کہ حکام وقت صرف ایک جانب کی پاسداری کریں اور دوسری طرف کی توہین و تذلیل روا رکھیں۔ سائل لفظ ترک لکھتا ہے یہ صرف مغالطہ اور دھوکا ہے، اُس نے

ترک اور کف میں فرق نہ کیا، کسی فعل کا نہ کرنا اور بات ہے اور اُس سے بالقصد باز رہنا اور بات۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اِس رسم سے جس میں صد ہا منافع ہیں یک قلم امتناع آخر کسی وجہ پر مبنی ہوگا اور وجہ سوا اِس کے کچھ نہیں کہ ہنود کی ہٹ پوری کرنا اور مسلمانوں ...... کے اسباب ومعیشت میں کمی یا تنگی کردینا۔ (۸)

(ب) باقی رہا سائل کا یہ کہنا کہ اس فعل کے ارتکاب سے ثوران فتنہ وفساد ہو، ہم کہتے ہیں جن مواضع میں مثل بازار وشارع عام وغیرہا گاؤ کشی کی قانوناً ممانعت ہے وہاں جو مسلمان گائے ذبح کرے گا البتہ اثارت فتنہ وفساد اُس کی طرف منسوب ہوسکتی ہے اور وہ قانوناً مجرم قرار پائے گا اور اِس اَمر کو ہماری شرع مطہر بھی روا نہیں رکھتی کہ ایسی وجہ سے مسلمانوں پر مواخذ ہے یا انہیں سزا ہونا بیشک توہین اسلام ہے جن کا مرتکب یہ شخص ہوا، نظیر اس سب وشتم آلہہ باطلہ مشرکین ہے کہ شرع نے اِس سے ممانعت فرمائی اگرچہ اکثر جگہ فی نفسہ حرج محقق نہ تھا۔ جہاں قانوناً ممانعت نہیں وہاں اگر ثوران فتنہ وفساد ہوگا تو لاجرم ہنود کی جانب ہوگا اور جرم انہیں کا ہے کہ جہاں ذبح کرنے کی اجازت ہے وہاں بھی ذبح نہیں کرنے دیتے، کیا اُن کے جرم کے سبب ہم اپنی رسوم مذہبی ترک کرسکتے ہیں، یہ حکم بعینہ ایسا ہوا کہ کوئی شخص اعتبار سے کہے تمہارا مال جمع کرنا باعث ثوران فتنہ وفساد وایذائے خلق اللہ ہے کہ نہ مال جمع کرو نہ چور چرانے آئیں، نہ وہ قید وبند کی سخت سخت سزا پائیں، اُس احمق کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ چوری چور کا جرم ہے اُس کے سبب ہمیں جمع مال سے کیوں ممانعت ہونے لگی، اور اگر ایسا ہی خیال ہنود کے فتنہ وفساد کا شرع ہم پر واجب کرے گی تو ہر جگہ ہنود کو قطعاً اس رسم کے اٹھادینے کی سہل تدبیر ہاتھ آئے گی جہاں چاہیں گے فتنہ وفساد

برپا کریں گے اور بزعم جہال شرع ہم پر ترک واجب کردے گی اور
اِس کے سوا ہماری جس رسم مذہبی کو چاہیں گے اپنے فتنہ وفساد کی بنا پر
بند کرادیں گے اور یہی واقعہ اُن کیلئے نظیر ہوجائے گا...... بالجملہ خلاصہ
جواب یہ ہے کہ شارع عام میں جہاں قانوناً ممانعت ہے براہ جہالت
ذبح گاؤ مرتکب ہونا بے شک مسلمانوں کو توہین وذلت کیلئے پیش کرنا
ہے کہ شرعاً حرام اور اِس کے سوا جہاں ممانعت نہیں وہاں سے بھی باز
رہنا اور ہنود کی بے جا ہٹ بجا رکھنا کیلئے یک قلم اس رسم کو اٹھا دینا ہرگز
جائز نہیں۔''(۹)

یہ استفتا مختلف فرضی ناموں نے برعظیم کے تمام بڑے شہروں کے علمائے کرام کی خدمت میں بھی روانہ کیا گیا تھا۔ پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد کے مطابق اِس سوال کا جواب ہندوستان کے مشہور فقیہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی (م۱۳۰۴ء/۱۸۸۶ء) نے بھی دیا۔ (جو ۱۳۰۵ء/۱۸۸۷ء میں اُن مجموعہ فتاویٰ میں شائع ہوا) انہوں نے سوال کے ظاہری پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے سیدھا سادا جواب دیا اور تحریر فرمایا:

''گاؤ کشی واجب نہیں، تارک گنہگار نہ ہوگا۔ بقصد اثارت فتنہ گاؤ کشی نہ
چاہیے بلکہ جہاں فتنہ کا ظن غالب ہو احتراز اولیٰ ہے، قربانی اونٹ کی
بہتر ہے۔''(۱۰)

مگر جب انہیں پس پردہ حقیقت کا پتہ چلا اور معلوم ہوا کہ اِس سوال کا اصل منشا خالص سیاسی ہے تو انہوں نے محدث بریلوی کے موقف کی طرف رجوع کرتے ہوئے دوسرے فتوے کے جواب میں لکھا:

''گائے ذبح کرنے کا جواز قرآن وحدیث سے ثابت ہے...... تمام
مسلمانوں کا خواہ بروز عید ہو اور روز تو مسلمان کو باز آنا درست نہیں ہے
اور ہندو کی ممانعت تسلیم کرنا جائز نہیں ہے۔ تسلیم کرنا موجب اُن کے
اعتقاد باطل کی تقویت وترویج ہوگا۔ یہ کسی طرح شرع میں جائز

نہیں۔ اونٹ اگرچہ گائے سے اولیٰ ہے مگر کوئی شخص اِس پر مجبور نہیں کیا
جاسکتا علی الخصوص جب ہنود بغرض تعصب کہیں کہ خواہ مخواہ اونٹ یا
بکری کرو، مسلمانوں کو ضرور ہے کہ قول ہنود تسلیم نہ کریں اور گاؤ کشی کہ
اسلام کا طریقہ قدیمہ ہے ترک نہ کریں بوجہ احتمال فساد ہنود گائے ذبح
کرنے سے رکنا نہ چاہیے۔''(۱۱)

محدث بریلوی اِس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولوی (عبدالحیٔ لکھنوی) صاحب ہنود کے دھوکہ میں آگئے، مسلمانوں
کے خلاف فتویٰ لکھ دیا، تنبیہہ پر متنبہ ہوئے، یہی سوال میرے پاس بھی
آیا تھا، بفضلہٖ تعالیٰ بہ نگاہ اوّلین مکر مکاران پہچان لیا اور ''گربہ کشتن
روز اوّل باید'' پر عمل کیا۔ وللہ الحمد (۱۲)

یہاں یہ بات واضح رہے کہ محدث بریلوی کے فتوے کی تصدیق علمائے رامپور نے کی۔ مولانا ارشاد حسین رامپوری نے لکھا ''الناقد بصیر'' یہ پرکھنے والی آنکھ رکھتا ہے۔ یعنی اس کا دیدۂ بصیرت نورالٰہی سے منور ہے کہ مکاروں کے خفی مکر کی تہہ تک پہنچ گیا اور اُس کا قلع قمع کیا۔

فتویٰ قربانیٔ گاؤ، اثرات وعوامل

محدث بریلوی نے جواب سے قبل اِس بات کو پیش نظر رکھا کہ کیا ہر حال میں گاؤ کشی مسلمانوں کے مفاد میں ہے یا ترک گاؤ کشی سے مسلمانوں کا فائدہ ہے۔؟ یا پھر وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، قربانی کا جاری رکھنا فائدہ مند ہے اور وہ علاقے جہاں مسلمان اقلیت اور ہندو اکثریت میں ہیں، ترک گاؤ کشی مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے۔ چنانچہ آپ نے اِن تمام عوامل کو سامنے رکھتے ہوئے رسالے کے شروع میں ہی اِس مسئلے کا حل تجویز کرتے ہوئے لکھا:

''گاؤ کشی واجب لعینہٖ نہیں اور نہ اِس کا ترک حرام ہے۔''

یعنی اِس کے نفس ذات میں کوئی اَمر اِس کے واجب یا حرام کرنے کا مقتضی نہیں۔ مطلب یہ تھا کہ صرف گائے کی قربانی لازم نہیں اور نہ ہی اِس کا ترک حرام ہے۔ مگر عرف و

حالات کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرنا ہوگا کہ کس جگہ اس کا ترک مسلمانوں کے حق میں بہتر ہے اور کس جگہ گاؤ کشی پر عمل مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے۔ الامور بمقاصدہا۔

چنانچہ دیگر مفتیان کرام کے برعکس محدث بریلوی نے اپنے فتویٰ کی بنیاد شعار مسلمین پر رکھی۔ آپ کے نزدیک یہی وہ علت خارجی ہے جس کی وجہ سے قربانی گاؤ واجب لغیرہ ہے۔ حالانکہ فی نفسہ گائے یا کسی خاص جانور کا ذبحہ شریعت میں واجب نہیں لیکن چونکہ ہندوستانی معاشرے میں قربانی گاؤ عرف میں مسلمانوں کا شعار بن چکا تھا اِس لیے آپ کے نزدیک اِس کا ترک استخفاف کا باعث تھا۔

اِس لیے محدث بریلوی نے ہنود کی ناراضگی کے خیال سے ترک گاؤ کشی کو شعائر اسلامی کی ذلت و توہین، مسلمانوں کی کمزوری و مغلوبی اور غلبۂ کفر جانا۔ جس سے قواعد شرعیہ بالیقین باز رہنے کی تحریم کرتے ہیں۔ آپ کا موقف بالکل واضح اور دور اندیشی پر مبنی تھا کہ اگر آج مسلمان قربانی کی رسم سے دست بردار ہو جائیں گے تو اہل ہنود کی جرأتیں بڑھ جائیں گی اور وہ کل کسی اور اسلامی شعائر سے دست برداری کا مطالبہ کریں گے۔

اِس لیے بخوف فتنہ وفساد اگر آج ہندوؤں کی زور اور زبردستی کو مان لیا گیا اور گاؤ کشی کو ترک کر دیا گیا تو اس سے اُن کو آئندہ کیلئے جواز مل جائے گا اور وہ کل ہماری جس اسلامی رسم کو چاہیں گے روکنے اور بند کرانے کی سعی کریں گے۔ یہی وجہ تھی جو آپ نے اہل ہنود کی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ترکِ گاؤ کشی سے منع فرمایا۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ محدث بریلوی نے تین مختلف مواقع پر قربانی گاؤ کی حمایت میں فتاوے جاری کئے۔ پہلا ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء میں مرادآباد، دوسرا ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء میں بریلی جبکہ تیسرا فتویٰ ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء میں ضلع مسلم لیگ، بریلی کی جانب سے پوچھے گئے سوالات کے جواب میں تھا۔ ۱۸۸۰ء میں "انفس الفکر فی قربان البقر" کے نام سے معروف پہلا فتویٰ دیتے وقت آپ کی عمر محض ۲۳/۲۴، برس تھی۔

اِس جواں عمری میں محدث بریلوی کی ژرف نگاہی اور سیاسی فہم وتدبر قابل توجہ ہے۔ بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ محدث بریلوی نے مستقبل میں اٹھنے والے جس

طوفان کا اندازہ لگایا تھا وہ صحیح نکلا۔

مومنانہ فراست اور بے مثال دینی حمیت کا اعتراف

سید انور علی ایڈوکیٹ (سپریم کورٹ آف پاکستان) محدث بریلوی کی دینی فہم و فراست اور نگاہِ بصیرت کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"برصغیر میں مسلمانوں کی وحدتِ ملّی کو فنا کرنے کی دوسری کوشش آل انڈیا کانگریس کے تعاون سے چلائی جانے والی تحریک ترکِ موالات اور مسلمانوں کے تعاون سے چلائی جانے والی تحریک ترکِ گاؤ کشی اور تحریک ہندو مسلم اتحاد کے ذریعہ کی گئی۔ یہ تحریکیں برصغیر میں پورے شدومد کے ساتھ چلیں اور اکثر مسلمان علما اور سیاستداں کانگریسی لیڈر مسٹر گاندھی کے ہم نوا بن کر میدان میں آئے۔ اُس نازک دور میں اہلسنّت وجماعت کے بطل جلیل مولانا احمد رضا خاں بریلوی آگے بڑھے اور موثر دلائل سے اِن تمام تحریکوں کو "اسلام دشمن" اور "مسلمان دشمن" ثابت کر کے علمائے حق کی رہنمائی فرمائی اور (گاندھی کے سحر میں مبتلا) مسلمان سیاستدانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ چنانچہ آپ کے فتاویٰ کی اشاعت کے بعد مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی اور دوسرے اکابرین نے اپنے سیاسی طرز عمل کا جائزہ لیا اور اِن تحریکوں سے علیحدگی اختیار کرلی۔ رفتہ رفتہ یہ جذباتی تحریکیں بھی ختم ہوگئیں اور مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کا احساس ابھرنے لگا جو مولانا احمد رضا بریلوی اور اُن کے زیر اثر علما اہلسنّت کی مساعی کا مرہون منت ہے۔" (۱۳)

ممتاز محقق اور دانشور پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد کے مطابق تحریک خلافت، ترک موالات، تحریک ہجرت اور ترکِ گاؤ کشی کے جذباتی دور میں جب کہ قائد اعظم محمد علی جناح اور ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی خاموشی اختیار کرلی تھی:

"محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں اسلامی حمیت و غیرت اور بے

مثال جوش وجذبے کے ساتھ منظر عام پر آتے ہیں نہ اُن کو اپنی جان کی
پروا، نہ عزت کی، وہ بسترِ مرگ پر پڑے تھے اور تہمتِ خلق کے سیاہ بادل
چاروں طرف منڈلا رہے تھے......اور اُن کے بعض خلفا وتلامذہ (سید
نعیم الدین مراد آبادی، مولانا امجد علی اعظمی، مولانا عبدالعلیم صدیقی، سید
محمد محدث کچھوچھوی (۱۸۹۴ء-۱۹۶۳ء)، مولانا برہان الحق جبل پوری
(۲۸۹۲ء-۱۹۸۴ء) اور بالخصوص پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف) نے
جس مومنانہ فراست کا ثبوت دیا وہ اب چاند کی طرح چمکتی ہوئی نظر
آتی ہے۔" (۱۴)

ترکِ قربانیٔ گاؤ کا حیرت ناک مطالبہ

چنانچہ ۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت کے زمانے میں سیاسی پلیٹ فارم سے ہندوؤں کی خاطر گائے کی قربانی ترک کردینے کا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی جانب سے مطالبہ کیا گیا۔ صدر کانگریس پنڈت مدن موہن مالویہ (جس نے ۱۸۹۷ء میں ہندی رسم الخط کی وکالت میں ایک پمفلٹ "'کورٹ کیرکٹر اینڈ پرائمری ایجوکیشن' شائع کیا اور مارچ ۱۹۹۸ء کو پنڈت مدن موہن مالویہ کی قیادت میں ہندو تعلیم یافتہ اُمرا کے ایک وفد نے لفٹنٹ گورنر سر میکڈانلڈ سے مل کر فارسی کی جگہ ناگری رسم خط کے اجرا کا مطالبہ بھی کیا تھا) اور صدر مسلم لیگ حکیم اجمل خاں نے بھی اِس قسم کے مطالبات کیے جو نہایت حیرت ناک ہیں۔

چنانچہ سیّد سلیمان اشرف نے مسلمان لیڈروں کے اِس طرزِ عمل کو ہندوؤں کے سحر وافسوں سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا:

"لیڈرانِ مسلم اِس کوشش میں سرگرم تھے کہ مسلمانوں کو گائے کی قربانی
سے باز رکھ کر ہنود کی رضا وخوشنودی حاصل کی جائے غالباً یہ اثر اُسی
سحر وافسوں کا ہوگا جو اخص لیڈرانِ ہنود نے بصیغۂ راز لیڈرانِ مسلم کے
کانوں میں پھونک دیا تھا۔" (۱۵)

مگر انہیں اصل مسئلہ یہ درپیش تھا کہ "اگر ہندو ترک قربانی کی تحریک

(پیش) کرتے تو عامۂ مسلمین ہرگز ہرگز اِس کو تسلیم نہ کرتے، لیڈر صاحبان
بھی اگر اِس کی اپیل سیاسی اور ملکی پہلو سے پیش فرماتے تو ناکامیاب
رہنے کا ظن غالب تھا۔" (۱۶)

لہٰذا ضرورت تھی کہ کوئی ایسا طریقۂ واردات اختیار کیا جائے جس سے مسلمان با آسانی گائے کے بجائے بھیڑ بکری اور اونٹ کی قربانی دینے پر راضی ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کو مذہبی لبادہ اوڑھانے کی کوشش کی۔ جس پر سیّد سلیمان اشرف نے لکھا:

"قربانی کا مسئلہ چوں کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں سے متعلق
تھا...... اِس لیے لیڈر حضرات کو کوئی ایسا حلیہ ایجاد کرنا ضرور تھا جس کی
وساطت سے قلوبِ عوام پر اِس طرح قابض ومتصرف ہو جائیں کہ
حامیانِ ملت ومذہب کے ہدایت کی گنجائش باقی نہ رہے۔" (۱۷) اُنہیں
"اِس جیسے مسئلہ کیلئے اسی کی ضرورت تھی کہ شرعی اور مذہبی لباس میں
اُسے مسلمانوں کے سامنے لایا جائے۔" (۱۸)

چنانچہ رائے عامہ ہموار کرنے اور مسلمانوں کو گائے کی قربانی سے روکنے کیلئے کچھ ناعاقبت اندیش مسلمانوں کی جانب سے ہندوؤں کے جذبات واحساسات کا خیال رکھنے کی ترغیب دلائی گئی۔ اور دین وشریعت کو بطور حیلہ استعمال کرتے ہوئے قرآن وحدیث سے گائے کی قربانی کا عدم جواز ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی (۱۹) جو کہ ایک قابل مذمت عمل تھا۔ اُس وقت ترک گاؤ ذبیحہ کے حامیوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اِس کے دینی سماجی اقتصادی اور سیاسی طور پر کس قدر خطرناک نتائج مرتب ہوں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد کے بقول:

"تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترک موالات میں جس ہندو مسلم اتحاد کو
پروان چڑھایا گیا، مسٹر گاندھی نے مسلمانوں کو آزمائش میں ڈال کر اُس
کو پرکھا۔ سب سے بری قربانی شعائر مذہبی کی قربانی ہے۔ اِس سلسلے
میں گائے کی قربانی ہندوؤں کیلئے ایک عرصہ سے وجہ اضطراب

تھی۔حالانکہ یہ قربانی خود اُن کے مذہب میں رائج تھی۔لیکن اِس مسئلے پر ہندو مسلم نظریات میں بعد المشرقین تھا۔ہندوؤں کیلئے گائے محبوب اور مسلمانوں کیلئے اُس کی قربانی محبوب۔چاہیے تو یہ تھا کہ مسٹر گاندھی ہندوؤں کو مجبور کرتے کہ وہ اپنی مذہبی قربانی کو پھر جاری کریں جو غالبًا گوتم بدھ کے اثرات کے تحت ہندوستان سے معدوم ہوگئی تھی۔مگر انہوں نے اِس مسئلے پر مسلمانوں کو مجبور کیا......(اور) ہندوؤں کی محبت کا مسلمانوں سے یہ صلہ چاہا گیا کہ وہ بیک قلم گائے کی قربانی موقوف کردیں اور ہندوؤں سے محبت کا عملی ثبوت دیں۔"(۲۰)

اِس مقام پر سیّد سلیمان اشرف علمائے حق کی دور بینی اور دینی وسیاسی بصیرت وبصارت کوخراج تحسین پیش کرتے ہوئے "النور" کے صفحہ ۸، پر لکھتے ہیں:

"مذہب وملت کے سچے ہمدرد اُسی وقت کھٹک گئے تھے کہ یہ عنایت اور باہمی آمیزش مسلمانوں کے کسی وطنی ومذہبی حق کو بغیر سلب کئے نہ رہے گی۔چنانچہ یہ نتیجہ آج اُسی عنایت اور قران کا ہے جو گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑائی جاتی ہے۔"

گائے ،گاندھی، اہمسا اور رام راج

گاؤ رکھشا دراصل ہندو دھرم کا خود ساختہ جزو ہے۔ایک موقع پر جب گاندھی سے سوال گیا کہ ہندو دھرم کی تعریف کیا ہے تو اُس نے صرف تین الفاظ میں جواب دیتے ہوئے کہا:

"گائے کی پوجا"(۲۱) اُس کے نزدیک "ہندو دھرم کی بنیادی حقیقت گائے کا تحفظ تھی۔"(۲۲)

گاندھی نے گائے کی دیوتائی حیثیت کا اعتراف اور اُس کی حفاظت کا عزم کرتے ہوئے بارہا کہا:

"میں گاؤ رکھشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بت پرستی سے انکار

نہیں کرتا، میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔"(۲۳) گاندھی کا یقین تھا کہ "ہندو دھرم اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک ہندو گائے کی حفاظت کیلئے موجود ہیں۔"(۲۴) اُس کا ماننا تھا کہ "ایک ہندو بھی ہندوستان کے طول وعرض میں ایسا نہیں جو ایک دن اپنی سرزمین کو گاؤ کشی سے آزاد کرانے کی اُمید نہ رکھتا ہو، ہندومت، عیسائی یا مسلمان کو تلوار کے زور سے بھی مجبور کرنے میں تامل نہیں کرے گا کہ وہ گاؤکشی بند کردیں۔"(۲۵)

گاندھی کے اِن کھلے منافقانہ عزائم کے باوجود ہمارے نادان لوگ اُسے مجسمۂ سچائی اور اُس اہمسا کا اوتار سمجھتے تھے، جس کا مطلب یہ تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو، کسی کے خلاف ہتھیار اٹھایا جائے نہ تشدد کیا جائے۔جبکہ گاندھی کا اہمسا (عدم تشدد) کہتا تھا کہ:

"جان و مال کی حفاظت ہتھیاروں کے ذریعے کی جائے اور ہندوؤں کو چاہیے کہ لیٹروں اور حملہ آوروں (یعنی مسلمانوں) سے اپنی حفاظت کا ڈھنگ سکھیں۔"(۲۶)

گاندھی کے بیانات سے واضح ہے کہ اُس نے عدم تشدد کے فلسفے کو بطور حربہ استعمال کیا اور سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے وہ تشدد کی پشت پناہی اور اُسے شہ دینے میں ہمہ وقت تیار رہا۔

یہی وجہ تھی جو ۱۹۲۲ء میں ممبئی کے گورنر سر جارج لائڈ نے اُس کے اہمسا (عدم تشدد) کی پول کھولتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا:

" Mr.Gandhi's preaching of non-violence was no more than a cloak for plans aimed at an ultimate revolution by violence."

(Louis Fischer,page 253)

"گاندھی کا عدم تشدد کا پرچار صرف ایک غلاف تھا جس کے اندر چھپا ہوا حتمی مقصد تشدد کے ذریعے انقلاب لانا تھا۔"

جبکہ لوئی فشر (Louis Fischer) گاندھی کی پوری زندگی کا تجزیہ کرنے کے بعد اِس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ:

''گاندھی کا دھرم (مذہب) سیاست سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔اُس کے دھرم نے اُسے سیاسی بنایا۔اُس کی سیاست مذہبی تھی۔ہندو دیو مالا اُس کے رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔'' (۲۷)

وہ خالص ہندو ذہنیت رکھنے والا ایک تنگ نظر، گھٹے ہوئے ذہن کا مالک، اُجڈ اور انتہائی کٹر متعصب انسان تھا۔جس کی ذہنیت تنگ نظری، انتقام جوئی اور مفاد پرستی سے ترتیب پائی اور نفرت و عداوت، فریب دہی اور روباہ بازی کے جذبات پر پروان چڑھی۔ ''لائف آف مہاتما گاندھی'' کے مصنف لوئی فشر نے صفحہ ۱۶۲، پر گاندھی کا ایک اعتراف نقل کیا ہے جس میں گاندھی خود تسلیم کرتا ہے:

"My patriotism is subservient to my religion"

''میری حب الوطنی میرے دھرم کے تابع ہے۔'' گاندھی یہ کہنے سے کبھی نہیں ہچکچایا کہ ''میری سیاست بلکہ جدوجہد کا سرچشمہ میرا مذہب ہے۔'' یا یہ کہ ''میرے جسم کا رُواں رُواں ہندو ہے۔''

گاندھی مسلمانوں سے سخت بغض وعناد رکھتا تھا۔اِس کا ثبوت گاندھی کا وہ بیان ہے جو اخبار ''ینگ انڈیا'' میں شائع ہوا۔جس میں اُس نے مسلمانوں سے اپنی دلی نفرت اور عناد کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''مسلمان عرب حملہ آوروں کی اولاد یا وہ لوگ ہیں جو ہم میں سے تھے اور اب ہم سے الگ ہوچکے ہیں۔اُنہیں اپنے ساتھ ملانے کے تین طریقے ہیں۔اوّل:۔مسلمانوں کو اسلام سے الگ کرکے پرانے (ہندو) دھرم پر لایا جائے۔دوم:۔اگر یہ ممکن نہ ہو تو مسلمانوں کو اُن کے اپنے قدیم علاقے (عرب) واپس بھیج دیا جائے۔سوم:۔اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اِن لوگوں کو ہندوستان میں رعایا یعنی کمین یا غلام بنا کر

رکھا جائے۔'' (۲۸)

یہی وجہ تھی جو قائد اعظم محمد علی جناح نے موہن داس کرم چند گاندھی کے اِن خوفناک عزائم اور اسلام دشمن کردار سے برعظیم کے مسلمانوں کو بروقت آگاہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''گاندھی ایک مکار لومڑی کی مانند ہے جس کا مقصد صرف ہندو مذہب کا احیا ہے۔'' (۲۹) اور یہ کہ ''گاندھی کا اصل مقصد ہندومت کی بقا اور ہندوستان میں رام راج قائم کرنا ہے۔'' (۳۰)

قائد اعظم کے نزدیک گاندھی ایک جھوٹا، ریا کار اور فریبی انسان تھا۔چالاکی، مکاری اور منافقت اُس کی شخصیت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔وہ زندگی بھر ''منہ میں رام رام اور بغل میں چھری'' کی حکمتِ عملی پر کاربند رہا۔اُس کے اِسی دوغلے پن اور منافقت کو عیاں کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا:

''گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو اُن کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے اُسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔'' (۳۱)

طلسمِ گاندھی کا اسیر گاندھوی ٹولہ

صد افسوس کہ اس کے باوجود بہت سے نام نہاد علما اور مسلمان زعما گاندھی کے شاطرانہ کردار کو نہ سمجھ سکے۔حالانکہ گاندھی نے اپنے عزائم اور اپنے دھرم کے بارے میں کوئی شک وشبہ اور مخفی گوشہ نہ چھوڑا تھا۔آپ اِسے خود فریبی کہیے یا گاندھی کا سحر، جس کے طلسم ہوش رُبا نے اُن کے ہوش وحواس تک سلب کر لیے۔گاندھی نے اُنہیں مئے اسلام فراموشی پلا کر ایسا مدہوش کیا کہ اُنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے بغاوت کو تو برا نہ جانا لیکن ''تعلیماتِ گاندھی'' سے سرِمو انحراف کو گناہ سمجھا۔

اِن کانگریسی علما نے گاندھی کی محبت میں وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا۔ڈولی میں قرآن اور گیتا کو رکھ کر جلوس نکلوائے۔گاندھی کو امام الہند قرار دیا۔اُس کی تصویریں اور بتوں کو گھروں میں آویزاں کروایا۔اور تو اور سوامی شردھا نند اور گاندھی جیسے کافروں کو مساجد کے

منبروں پر بٹھا کر ''گاندھی جی کی جے اور ہندو مسلم بھائی بھائی'' کے نعرے بھی لگوائے۔

اِس طرزِ مسلمانی نے گاندھی کے ذہن میں مسلم ملت کی جو تصویر بنائی، پروفیسر مرزا محمد منور اُسے اپنے مضمون ''حقیقتِ حال'' (نوائے وقت لاہور، ۲۱ ستمبر ۱۹۷۹ء) میں بیان کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

''گاندھی کیلئے عام مسلم ملت کے افراد مسلمان ہی نہ تھے۔ فقط وہی مسلمان تھے جو آشرم نشین ہو سکتے تھے۔ تلک لگوا سکتے تھے۔ ہندوؤں کے سے انداز میں پرنام کر سکتے تھے۔ ہندوؤں کی سی ٹوپیاں پہن سکتے تھے اور مسلمانوں کو ہندو قوم سے جدا نہ جانتے تھے۔ گویا خدا پرست اور بت پرست، گاؤ خوار اور گاؤ کے پرستار ایک ہی ملت کے فرد تھے۔''

شعائرِ اسلامی کی بے حرمتی اور توہین پر سیّد صاحب کا ردِ عمل

چنانچہ شعائرِ اسلام کی اِس بے حرمتی اور اعلانیہ توہین پر سیّد سلیمان اشرف کی روح تڑپ اٹھی۔ اور مسلمانوں کے ہاتھوں خانۂ خدا کے عظمت و تقدس کی شرمناک پامالی پر آپ بے اختیار پکار اُٹھے:

''مسلمانو! ذرا انصاف سے کام لو، تم نے مساجد کی کیسی بے حرمتی اپنے ہاتھوں سے کی ہے۔ کیا مسلمانوں کو یہ مسئلہ معلوم نہیں کہ نجس و ناپاک کا مسجد میں جانا شرعاً سخت ممنوع ہے۔ اہلِ ہنود کے مذہب میں بجز مسلمانوں کے وجود کے اور کوئی شے نجس نہیں، علاوہ نجاست کفر و شرک کے وہ دیگر نجاست ظاہری سے آلودہ رہتے ہیں۔ اُنہیں تم مسجد میں لے گئے، منبر یا مکبرہ جو ساری مسجد کا ایک ممتاز مقام ہے اُس پر تم نے ہنود کو جگہ دی، تبلیغ و ہدایت کیلئے اُن سے مصر ہوئے، ذرا ایمان کو سامنے رکھ کر کہنا منبر کس کی جگہ تھی اور اُس پر کس کی صدائے تلقین و تبلیغ بلند ہوئی تھی اور تم نے اُس کی عظمت کو کس بے دردی سے پامال کیا...... خاص خانۂ خدا اور توحید کے مکان میں مبلغ کی حیثیت سے ہنود

کو سر بلندی بخشا اِس صدی کے مدعیانِ اسلام کا خاصہ ہے۔'' (۳۲)

ناروا مذہبی جذب و انجذاب

آگے چل کر سیّد سلیمان اشرف مسلمانوں کی مشرکانہ حرکات پر سخت ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور الرشاد میں ''ناروا مذہبی جذب و انجذاب'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

''مسلمان خود مندروں میں گئے، مساجد چھوڑ کر وہاں نمازیں پڑھی گئیں، دعائیں مانگی گئیں۔ کیا بت خانہ میں عبادت کا زیادہ ثواب ہے یا صنم خانہ میں دعا مقبول ہوتی ہے۔ اِس سے زیادہ ستم تم نے یہ کیا کہ ہندوؤں نے تمہیں چندن کا ٹیکہ لگایا، تمہاری جبینِ توحید پر شرک کا قشقہ کھینچا گیا۔ ستیا گرہ کے دن مسلمانوں نے مہاتما گاندھی کے حکم سے روزہ رکھا...... وید الہامی کتاب تسلیم کر لی گئی، کرشن جی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب مان لیا گیا...... مسلمانوں نے اپنے ملکی بھائیوں کو مشرکین اور بت پرستوں کی صف سے نکال کر اہلِ کتاب کی صف میں لا کر داخل کر دیا، علی الاعلان بار بار نہایت پُرزور الفاظ میں یہ اقرار کیا گیا کہ سب سے پہلے ہم ہندوستانی ہیں اُس کے بعد جو کچھ بھی ہیں سو ہیں...... بدایوں جیسے شہر میں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے ایک ہندو یہ تحریک پیش کرتا ہے کہ امسال رام لیلا مسلمانانِ بدایوں (میں) منائیں اور محرم میں تعزیہ داری ہندو کریں گے۔ کسی مسلمان کو یہ توفیق نہیں ہوتی جو کھڑے ہو کر اُس کی شناعت از روئے مذہب بیان کرتا۔ ہولی کے موقعہ پر خوب مسلمانوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ صبغة الله ومن احسن من الله صبغة (یعنی اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے) اُسے چھوڑ کر ہولی کے رنگ سے کپڑے رنگین کئے گئے۔ غرض اِس طرح کی خرافات کا کہاں تک ذکر کیا جائے ہر جگہ ایک نئی شان سے اہلِ ہنود پر مسلمان اپنا دین اپنا مذہب نچھاور کر رہے ہیں۔'' (۳۳)

اِس مرحلے پر ایک نظر ''النور'' صفحہ ۸، پر بھی ڈالتے ہیں۔ جس پر سیّد سلیمان اشرف
اِس منظر کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آج:

''موحدین کی پیشانیوں پر قشقہ جو شعار شرک ہے کھنچا جاتا ہے، مساجد
اہلِ ہنود کی تفریح گاہیں، مندر مسلمانوں کا ایک مقدس معبد ہے۔ ہولی
شعارِ اسلام ہے جس میں رنگ پاشی اور وہ بھی خاص اہل ہنود کے
ہاتھوں سے جب کہ وہ نشہ ٔشراب میں بدمست ہوں۔ عجب دلکش
عبادت ہے بتوں پر ریوڑیاں چڑھانا، ہار پھولوں سے اُنہیں آراستہ
کرنا، پھولوں کا تاج اصنام کے سروں پر رکھنا، خالص توحید ہے۔ یہ
سارے مسائل اِن صورتوں میں اِس لیے ڈھل گئے کہ ہندوؤں کی
دلنوازی اور استرضا زیادہ اہم نہ توحید ہے نہ رسالت نہ معاد۔ نعوذ باللہ ثم
نعوذ باللہ۔''

لیڈرانِ قوم سے سوال

سیّد سلیمان اشرف اِن غیر شرعی حرکات پر علما، لیڈروں اور قوم کو احکام شریعت یاد
دلاتے ہیں اور اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے سوال کرتے ہیں:

''آپ ہی ارشاد فرمادیں کہ یہ افعال کیا آپ کا اضطرار ظاہر نہیں
کرتے۔ کیا اِن حرکات سے پراگندگی حواس نہیں سمجھی جاتی۔ کیا اِس طرز
عمل کو آپ للہ ربّ العالمین کہہ سکیں گے۔ کیا اِن اعمال کا ارتکاب دین
قویم اور ملتِ حنیف کا احیا قرار دیں گے۔ کیا اِن اُمور کو حسب منشا تعلیم
الٰہی اور ارشادِ مصطفوی آپ ثابت کرسکیں گے۔ حاشا وکلا ہرگز نہیں اور
کبھی نہیں۔ جذبات سے خالی ہوکر ذرا غور تو فرمایئے اِن شنیع اعمال کی
ایک لمحہ جانچ تو کیجئے معیار شریعت پر کھرے کھوٹے کو پرکھیئے تو سہی۔
تحسبونہ ھینا وھو عنداللہ عظیم (تو نے اس کو ایک ہلکی بات سمجھا
حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بڑی ہے) ٹیکہ ہو قشقہ، چندن کا ہو یا زعفران

کا توحید کی پیشانی پر شرک کا داغ ہے۔ حرام ہے اور قطعاً حرام۔ نیز
عوام کے ایمان کا خطرہ ہے...... جس طرح صلیب تثلیث کا شعار ہے
اُسی طرح ٹیکہ یا قشقہ شعار کفر وشرک ہے۔ مسلمانوں تم نے مسلک
توحید کی اعلانیہ بے حرمتی کی اور طرفہ یہ کہ پھر تمہیں اِس پر ناز بھی ہے
گویا ایک بہت بڑی سعادت ہے...... لیڈران قوم کیا ازروئے شریعت
مطہرہ صلیب اور قشقہ میں آپ فرق جواز اور عدم جواز کا ثابت کرسکتے
ہیں۔ اسی طرح اہل ہنود کے تہوار اور مذہبی میلہ میں جانا اُس کی رونق
بڑھانا آپ جائز ثابت کرینگے، ذرا شریعت کی کتابوں سے پوچھیے کہ وہ
عید اہل ہنود کی رونق بڑھانے والے کو کیا کہتی ہیں۔ الحمدللہ لیڈران قوم
میں بعض علمائے دین بھی شامل ہیں انہی سے پوچھیے کہ اُمور مذکورہ بالا
اللہ اور اللہ کے رسول کے فتوے سے کیا ثابت ہوتے ہیں۔ ان اُمور
سے آیا مذہب کی حمایت ہوئی یا دین کی بیخ کنی ہوگئی۔'' (۳۴)

مومنانہ پکار و استدعا

اِس موقع پر سیّد سلیمان اشرف لیڈران قوم اور مسلمانوں کو اُخروی فلاح ونجات کا
راستہ بتاتے ہوئے اپنی کتاب ''الرشاد'' کے صفحہ ۳۲، پر لکھتے ہیں:

میں ''تمہیں نہایت عاجزانہ ومخلصانہ یہی صلاح دیتا ہوں کہ کسی غیر
مذہب میں جذب ہونے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ لقد کان لکم
فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ، تمہارے لیے بہترین نمونہ رسول کی
ذات میں موجود ہے۔ سوائے اُس تاجدار دو عالم کے کسی کے مطیع اور
متبع ہونا قوم مسلم کے سزاوار نہیں۔ عیسائیوں کی غلامی سے جو مدتوں بعد
گردنوں کو خلاصی ملی ہے تو اب اُس میں پھندا کفر وشرک کا نہ ڈالو......
بارش سے بھاگنا اور پرنالے کے نیچے کھڑا ہونا کون سی دانائی ہے۔
تعصب ونفسانیت کو راہ نہ دو...... مسلمانوں تم تو دین ومذہب کو اپنی

آرزو اور تمنا کا سپر نہ بناؤ بلکہ اپنی تمنا اپنی آرزو اور اپنی خواہش کو دین
کے موافق اور شریعت کے مطابق بناؤ یہی سعادت ہے اور اسی میں
فلاح، واللہ یھدی من یّشاء الیٰ صراط مستقیم۔"

صد افسوس کہ سیّد سلیمان اشرف کی اِس عاجزانہ اور مومنانہ پکار پر لبیک کہنے کے بجائے اِس پیغامِ حق کی سنی اَن سنی کردی گئی اور لیڈرانِ جمعیت علمائے ہند بالخصوص ابوالکلام آزاد ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگا کر خطباتِ جمعہ میں گاندھی کو "مقدس ذات" اور "ستودہ صفات" کے القابات سے نوازنے اور کافر اعظم (گاندھی) کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات کو قرآن وحدیث کے حوالوں سے ثابت کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔

اِس مقام پر مولوی شبیر احمد عثمانی کا وہ بیان بھی پیش نظر رہے جو دارالعلوم دیوبند کی ہندو اور کانگریس نوازی کی خود اپنے ہی گھر سے گواہی دیتا ہے۔ جس میں مولوی شبیر احمد عثمانی تسلیم کرتے ہیں:

"درسِ حدیث میں خدا اور رسول کی اطاعت کا درس نہیں دیا جاتا۔ اب تفسیر جلالین، بیضاوی اور درس حدیث میں کانگریسیت کا سبق پڑھایا جانے لگا ہے۔ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو (۱۸۸۹ء۔۱۹۶۴ء) کے کارناموں کی نہ صرف تعریف کی جاتی ہے بلکہ اُن کی تائید قرآن و حدیث سے پیش کی جانے لگی ہے۔ درس حدیث کا شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا جس میں کانگریس کا تذکرہ اور اُس میں شمولیت کی تلقین نہ کی جاتی ہو۔ اُن کی تقریروں اور دن رات کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج دارالعلوم نہ صرف ہنود کا مداح ہے بلکہ اُن کے رنگ میں بہت کچھ رنگا جاچکا ہے۔" (۳۵)

خیال رہے کہ مولوی شبیر احمد عثمانی (جو "۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۳ء تک دارالعلوم دیوبند کے صدر مہتمم رہے۔ ۱۹۴۳ء میں مولوی حسین احمد مدنی اور اُن کے رفقاء سے اختلافات کے سبب صدر مہتمم کے عہدے سے علیحدہ ہوئے۔ تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترک موالات کے

زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کے پرجوش حامی اور جمعیت علمائے ہند کے سرگرم رکن رہے۔ اور مئی ۱۹۴۵ء میں سہارنپور اجلاس کے بعد باقاعدہ جمعیت علمائے ہند سے مستعفی ہوئے) دیوبندی مکتبہ فکر کے اُن معدودے چند افراد بشمول مفتی شفیع دیوبندی (۱۸۹۷ء۔۱۹۷۶ء) اور مولوی ظفر احمد عثمانی (۱۹۸۲ء۔۱۹۷۴ء) وغیرہ میں سے ایک ہیں جنھوں نے ۱۹۴۶ء کے بعد تحریک پاکستان کی حمایت کی اور جمعیت علمائے ہند سے اختلاف کرتے ہوئے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۱۹۲۶ء۔۲۰۱۳) کے مطابق اپریل ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کونسل میں اِس قرارداد کہ "پاکستان میں حکومت قرآن وسنت کی بنیاد پر قائم ہوگی" کی منظوری کے بعد یہ گوشہ نشین علماء مسلم لیگ کی حمایت پر آمادہ ہوئے اور اُنہوں نے (اُس وقت) تحریک پاکستان میں حصہ لیا۔" (۳۶) جب کہ قیام پاکستان ناگزیر تھا۔ یہ ہماری قومی وملّی تاریخ کا المیہ ہی ہے کہ آج مولوی شبیر احمد عثمانی، ظفر احمد عثمانی اور مفتی شفیع دیوبندی وغیرہ کو عقیدت اور تقدس کی عبا اوڑھا کر تحریک پاکستان کے عظیم رہنماؤں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے

نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

قائداعظم کے رفیق خاص اور تحریک پاکستان کے ممتاز سیاسی رہنما مولانا عبدالحامد بدایونی (۱۹۰۰ء۔۱۹۷۰ء) کانگریسی علماء کی ہندو نوازی اور اندھی محبت وعقیدت کو کیسے بیان کرتے ہیں۔ آیئے اُسے بھی دیکھتے ہیں۔ سیّد نور محمد قادری لکھتے ہیں:

"یہ علماء گاندھی اور ہندوازم سے اِس قدر متاثر ہوئے کہ دیوبند کا شیخ الحدیث جو پیڈ استعمال کرتا تھا اُس پر بسم اللہ کے بجائے "جے ہند" چھپا ہوتا تھا۔" (۳۷)

ابوالکلام آزاد کی دینی وفکری کجی

عبدالوحید خان، ابوالکلام آزاد کی دینی وفکری کجروی اور سیاسی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مسلم مدبرین جن میں جمعیت العلماء کے معزز ارکان بھی تھے اور بحر

سیاست کے بہترین شناور مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے ایک ایسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھے جس کی تلافی آج تک نہ ہوسکی اور نہ مستقبل قریب میں اُمید ہے......(انہوں نے) رواداری کے غلط اور غیر اسلامی جذبے میں مست ہوکر وہ باتیں کیں جن کی اجازت نہ خودداری دے سکتی تھی نہ اسلام...... (انہوں نے) گائے کی قربانی کی ممانعت کے فتوے اُونٹوں کی پشت پر سے تقسیم کروائے۔ اِن چیزوں کا خمیازہ اب تک بھگتنا پڑ رہا ہے۔ ایسا کرنے سے مسلمانوں کی ذہنیت ایک طرف مرعوب ہوگئی اور ہندوؤں کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ مسلمانوں کی خاص تہذیب ہے ہی کیا، سوائے چند رسومات کے۔'' (۳۸)

غیر اسلامی جذب وحلول پر سلیمان اشرف کا اظہارِ افسوس

لیڈران سیاسی اور کانگریسی علما کا یہ رنگ ڈھنگ کسی طور بھی ایک صاحب ایمان اور غیرت مند مسلمان کیلئے قابل قبول نہ تھا۔ سیّد سلیمان اشرف رہبرانِ قوم کی غیر اسلامی تحریف وتاویلات پر تڑپ اُٹھے اور ہندوؤں میں مسلمانوں کے شرمناک جذب وحلول پر اُن کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کا ایک عہد عیسائیت کے ساتھ تعشق وشیفتگی کا تھا مسلمان ہمہ تن اُس میں حلول وجذب ہوجانے کیلئے بیتاب تھے لیڈران قوم نے اُس وقت نہایت بلند آہنگی سے صور پھونکا کہ اگر باعزت وحرمت دنیا میں رہنا چاہتے ہو تو یورپ میں جذب ہوجاؤ مسلم ہستی بذات خود قائم ہو ہی نہیں سکتی اسلامی انداز جلد سے جلد چھوڑ دو اور یورپ کے اسلوب اختیار کرو۔ پھر کیا تھا مسلمانوں کی شکل وصورت، لباس و پوشاک، طرز ماند و بود، غرض ہر ایک شعبۂ حیات میں یورپ ہی کی تجلی تھی۔ حتٰی کہ نام تک یورپین تلفظ واملا میں شامل کرلیا گیا۔ ارکان اسلام سے بے گانہ وشی لوازم تہذیب وتعلیم قرار پائی۔ اب چند سال سے ایک نیا دور شروع

ہوا۔ مسلمانوں نے دوسری کروٹ بدلی تو تلاش شروع ہوئی کہ اِس مرتبہ کس قوم میں مل کر فنائے کلی کا مرتبہ حاصل کیا جائے تاکہ رہی سہی علامتِ اسلامی بھی مٹ جائے ...... پاس ہی ملک میں ایک ہمسایہ قوم مل گئی لیڈران نے پھر اُسی تلقین کا اعادہ کیا کہ تم ہیچ، تمہارے مذہبی دستور العمل ہیچ، تمہارے اسلاف کے کارنامے ہیچ، خبردار مسلم ہستی کو بذات خود قیام کی کوشش سخت حماقت وبے غیرتی ہے۔ یہ زرّیں موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے، احسان مانو کہ اپنی رہی سہی قومیت مٹانے کیلئے ہمیں دور نہ جانا پڑا خود اپنے ہمسایہ میں ایک ایسی قوم مل گئی جس میں جذب ہوکر ہم نیست ونابود ہوسکتے ہیں مسلمانوں نے بھی لیڈروں کی اِس تلقین پر لبیک کہا۔ اِس دور سے پیشتر عیسائیت میں جذب ہونے کیلئے مسائل شرعیہ میں طرح طرح کی تحریفیں کی گئیں، آیات قرآنی اور احادیث نبوی کے مطالب میں عجیب وغریب معنی آفرینیوں سے کام لیا گیا۔ اِس دور جدید میں ہندوؤں کیلئے وہی باتیں کی جارہی ہیں۔ مذہب کا بہت بڑا حصہ یورپ پر سے نچھاور کیا جاچکا تھا جو باقی تھا وہ نہایت فیاضی سے ''ایک شریف قوم'' نے پہلے ہی قدم اتحاد پر قربان کردیا......افسوس ہے مسلمانوں کی بدعقلی اور خام کاری پر، دنیا طلبی اُن پر ایسی چھائی کہ دین کی تباہی اپنے ہاتھوں سے کرنے لگے اور اِس کا احساس وشعور تک اُنہیں نہیں ہوتا کہ ہم کیا کررہے ہیں۔'' (۳۹)

دین وایمان کے عِوض ملنے والے اقتدار کی حیثیت

اسلام کی نظر میں وہ اقتدار وحکومت جس کا حصول دین وایمان کا سودا کرکے ممکن ہو، مردود وملعون ہے۔ سیّد سلیمان اشرف ایسی سلطنت کے حصول کی تگ ودو کرنے والے لیڈرانِ قوم کو اِس کی حیثیتِ اصلی سے آگاہی دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کا حقیقی نصب العین دین ومذہب اللہ تعالیٰ نے قرار دیا

ہے۔دنیا اُن کے پاس دین کی رونق اور مذہب کی خدمت کیلئے ہے، جب دین و مذہب ہی نہ رہا تو ملعون ہے وہ سلطنت جو ایمان کے عِوض میں ملے اور صد لعنت ہے اُس حکومت پر جو اسلام بیچ کر خریدی جائے۔"(۴۰)

اصلاح احوال کا پیغام

اِس موقع پر سیّد سلیمان اشرف لیڈران قوم اور ملت اسلامیہ کی غیرت ایمانی کو جگاتے ہیں اور انہیں اصلاح احوال کا پیغام دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"آپ حمایت دین کا نام لیکر دین کو کیوں مٹاتے ہیں توحید کے علمبردار ہوکر شرک کی اعانت کیوں کرتے ہیں.....تم مسلمان ہو،تمہارا خدا پر اُس کی صفات پر ایمان ہے تم اُس کے رسول کے شیدائی اور اُس کے بھیجے ہوئے دین کے فدائی ہو، اِس وقت جو مصیبت کا پہاڑ تم پر آپڑا ہے اُس نے تمہیں ششدر و حیران کردیا ہے اور اس پریشانی میں تم سے غلط کاریاں ہوگئی ہیں۔لاحول ولا قوۃ الا باللہ لا ملجا ولا مَنجا منہ الا الیہ پڑھ کر سنبھل جاؤ، یہ ساری آفتیں دین سے بے پروائی اور مذہب سے تغافل شعاری کی بدولت نازل ہوئی ہیں۔اِس لیے ہمیں توبہ و استغفار پڑھ کر خدمت دین کی طرف عملاً متوجہ ہوجانا چاہیے ......نا اُمید نہ ہو، خدا کے سوا کسی اور کا سہارا نہ پکڑو......اثر بخشی اور بزرائی خدمت اُس کے اختیار میں ہے جس کے تم غلام ہو اور جس کا بھیجا ہوا یہ دین ہے۔"(۴۱)

مگر اصلاح احوال تو اُس وقت ہوتی جب کھلے دل و دماغ سے اِس پیغام حق کو سنا اور سمجھا جاتا اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے رجوع کا راستہ اختیار کیا جاتا۔یہاں تو معاملہ یہ تھا کہ ہادیانِ قوم نے گاندھی کی قیادت کو اپنا جزو ایمان بنالیا تھا اور اُس کے سَحر و سحر سے مسموم و مسحور ہوکر ایک ایسا دین بنانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے جس میں کفر و اسلام کا امتیاز ہی

ختم ہوجاتا تھا۔چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اُن کے کردار و عمل کی تصویر کشی کرتے ہوئے خوب فرمایا تھا۔

شیخ در عشق بتاں اسلام باخت
رشتہ تسبیح از زنّار ساخت
بزمِ مسلم از چراغ غیر سوخت
مسجد او از شرارِ دَیر سوخت

یعنی"اِن مذہبی پیشواؤں نے غیروں کی محبت کے قمار خانے میں اسلام کی بازی ہار دی(اب اِن کی وجۂ جامعیت کفر کے تصورات و شعائر ہیں) انہوں نے اپنی تسبیح کے دانوں کو زنّار کے دھاگے میں پرولیا ہے۔مسلمانوں نے اپنی محفلوں کو غیروں کے چراغ سے روشن کیا تو اُن کی محفلوں میں آگ لگ گئی۔بتکدوں سے وہ چنگاریاں اٹھیں جن سے اُن کی مساجد جل کر راکھ ہوگئیں۔"

ایک تلخ مگر تاریخی حقیقت

تاریخ اِس اَمر کی شاہد ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری (۱۸۹۲ء۔۱۹۶۱ء) اور اِس قبیل کے دوسرے لوگ مثلاً ابوالکلام آزاد اور مولوی حسین احمد مدنی وغیرہ جو اپنے دور میں فن خطابت کے ماہر تھے، کو کانگریس نے سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام کے نام پر بے وقوف بنانے کیلئے استعمال کیا۔یہ شعلہ بیان مقرر اپنا سارا علمی زور اِس بات پر صرف فرماتے رہے کہ مسلمان بھی ہندو قومیت کا جزو ہیں۔یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے ہندو قومیت سے بڑھ کر ایک ایسے نئے مذہب کی تشکیل کی کوششیں کیں جو ہندو مسلم امتیاز ہی ختم کردے۔

اِس سے بھی زیادہ ایک شرمناک بات یہ ہوئی کہ اسلام کو برباد کرنے کی یہ سب ناپاک کوششیں خود دعویٰ اسلام کرنے والوں کے ہاتھوں سرزد ہوئیں، مسلمانوں کے قومی مفاد کو جس بے دردی سے نقصان پہنچایا گیا تاریخ میں اس کی دوسری مثال مشکل سے ہی ملے گی۔

یہ وہ قوم پرست علماء اور اُن کے متبعین تھے جو تحریک خلافت، ہجرت، موالات اور ترک گاؤکشی کے زمانے میں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ دادِ اتحاد کا حق ادا کرتے رہے

اور بعد میں سیاسی پلیٹ فارم سے مشرکین ہند کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہوئے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی وقوت متحرکہ کو پارہ پارہ کرنے کی مذموم سعی میں آخر دم تک مصروف عمل رہے۔ یہ لوگ نظریہ مسلم قومیت سے ہی منحرف نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے قیام پاکستان کو بھی گناہ سے تعبیر کیا اور مسلمانوں کی قیادت کو کافر اعظم تک کہا۔

یہی وجہ تھی جو دیوبندی مکتبہ فکر سے عملی وابستگی رکھنے والے پروفیسر محمد اسلم بھی مولوی حسین احمد مدنی اور دیگر اکابرین دیوبند کی سیاسی بصیرت پر کفِ افسوس ملتے ہیں اور اُن کے روحانی معاملات پر سوال اٹھاتے ہوئے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں:

''مجھے سخت تعجب ہوتا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں کو کشف قلوب اور کشفِ قبور ہوتا تھا، لیکن انہیں کشفِ ہنود کبھی نہیں ہوا۔ وہ تاریخ کی روشنی میں ہندوؤں کی گھٹیا ذہنیت ،اسلام دشمنی اور مسلم بیزاری کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے۔'' (۴۲)

ممتاز محقق و دانشور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے دیوبند کے اِس انداز فکر کو ایک جملے میں سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ آپ لکھتے ہیں:

''دیوبند طرز فکر کی خاص کمزوری ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اِس میں حقیقت پسندی کی شدید کمی ہے۔'' (۴۳)

اِس مقام پر دیوبندی طرز فکر کو سمجھنے کیلئے ترک محقق میم کمال اوکے کی رائے بھی پیش نظر رہے جو تحریکِ خلافت کے تناظر میں لکھتے ہیں:

''وہ (دیوبندی) ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنے میں کوئی بھی عار محسوس نہیں کر رہے تھے۔ لیکن وہ ماضی کو زندہ کرنے کے خواب میں اِس قدر کھو گئے کہ زمانہ جدید کے حالات سے اُن کا رشتہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ حالات کا جدید طریقے سے مقابلہ کرنے سے قاصر تھے۔'' (۴۴)

جبکہ مشہور صحافی وقار انبالوی علمائے دیوبند کی آواز کو ہندوؤں کا نعرۂ مستانہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جمعیت علمائے ہند اگرچہ بڑے بڑے بالغ نظر بزرگوں پر مشتمل تھی لیکن سیاسیات میں وہ آخر دم تک حتیٰ کہ انتقال اقتدار اور تقسیم اقتدار جیسے اہم اور نازک مسائل میں بھی اُس کی آواز ہندو کے نعرۂ مستانہ کی صدائے بازگشت کے سوا کچھ اور نہ تھی۔'' (۴۵)

اسی وجہ سے تحریک پاکستان کے ممتاز رہنما مولانا عبدالحامد بدایونی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی (جوہر) اور مولانا عبدالماجد بدایونی (۱۸۸۷ء-۱۹۳۱ء) کے تحرک پر قائم ہونے والی جمعیت علمائے ہند (جس کے قیام کا مقصد سیاسی جماعتوں اور مسائل کو شریعت مطہرہ کی روشنی میں جانچنا اور مذہبی احکامات کی روشنی میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا تھا) کو اپنے مقاصد سے ہٹنے اور ہندوؤں کی ہم آغوشی اختیار کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

''افسوس کہ یہ جماعت مشرکین ہند کی دوستی کی بدولت مسلمانانِ ہند سے کٹ کر کانگریس کی آغوش میں جا پڑی۔'' (۴۶)

درحقیقت یہ وطن پرست مذہبی جماعتیں اسلام کا نام لینے کے باوجود قیام پاکستان کے نظریے کو قبول کرنے سے قاصر تھیں۔ ان میں خاکسار، احرار، جماعت اسلامی، دیوبندی طبقہ فکر کا اکثریتی حصہ اور علمائے اہلحدیث بھی شامل تھے۔

شاطر وعیار گاندھی کا اصل مقصد

گاندھی دراصل ایک انتہائی زیرک انسان تھا۔ وہ عوام اور خواص کے جذبات سے کھیلنے کا ڈھنگ خوب جانتا تھا۔ اُس کی چالیں شاطرانہ مگر انداز دوستانہ ہوتا تھا۔ وقت کی رفتار کو پرکھنا اور زمانے کی رَوش کے ساتھ گفتار اور کردار کا ہیر پھیر گاندھی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سیاسی اداکاری میں اُسے کمال حاصل تھا۔

وہ حالات کا جائزہ لے کر ایسا نشانہ باندھ کر تیر مارتا کہ اپنے پرائے سب رطب اللسان ہو جاتے۔ گاندھی کے یہی وہ جوہر تھے جس نے وقت کے کئی بڑے علماء، سیاسی زعماء اور اکابرین جمعیت علمائے ہند کو اُس کا ذہنی وقلبی اسیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ اس ذہنی وقلبی اسیری کو

طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہوئے سیّد سلیمان اشرف لکھتے ہیں:

''شاید گاندھی کے باب میں تم یہ جواب دو کہ جب تک مسلمانوں میں کوئی صاحبِ سجادہ کوئی خانقاہ نشین کوئی واعظ وفقیہ کوئی محدث ومفسر حد یہ ہے کی کوئی جنٹل مین لیڈر مثل گاندھی کے نہ ہو تو ہمیں اِس کے سوا کوئی چارہ کیا ہے کہ ہم اُسی کی تقلید کریں اُسی سے اپنا رشتہ ہدایت جوڑیں...... ہاں میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ گاندھی تمہارا پیشوا ہے اور تم اُس کے پیرو...... ہاں میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ تم اُسی میں جذب ہوگئے۔'' (۴۷)

گاندھی نے مسلمانوں کو کیسا عقل وخرد سے بیگانہ کیا تھا۔ آیئے پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

''اِس عقدہ لاینحل کو مسٹر گاندھی نے اپنے ناخن تدبیر سے ایسا سلجھایا کہ مسلمانوں کی عقلیں الجھ گئیں، اسی الجھن میں مسلمانوں نے اتحاد کا ہاتھ بڑھانے سے پیشتر مدغم ہوجانے کی کوشش کی۔ قشقہ کھینچا، مندروں میں گئے، چڑھاوے چڑھائے، بتوں پر پھولوں کا تاج رکھا، گؤ ماتا کی جے پکاری، قربانی گاؤ سے توبہ کی، منبر ومکبرہ پر ہنود کو تبلیغ وہدایت کیلئے جگہ دی، اب مضامین لکھے جاتے ہیں، کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ وعظ کہے جاتے ہیں، جن کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ کفار ومشرکین میں جذب ہوجانا عین اسلام ہے۔'' (۴۸)

بدقسمتی سے انہیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ گاندھی کے ظاہراً محبت کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے بیانات ومحرکات دراصل زہر میں ڈوبے ہوئے وہ خنجر ہیں جس کا واحد مقصد برِعظیم کی ملتِ اسلامیہ کو تباہ وبرباد کرکے رام راج قائم کرنا تھا۔

گاندھی کا طلسم خود فراموشی اُن کے قلوب واذہان کو اِس قدر ماؤف کرچکا تھا کہ کسی نے یہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی کہ اِس دشمن اسلام ہندو کو اسلام اور مسلمانوں سے

کیوں ہمدردی ہوگئی ہے۔ بس اُنہوں نے گاندھی کی محبت کے اسیر ہوکر اُس کے قدموں میں سر ٹیک دیا اور پوری قوت سے مسلمانوں کے اسلامی تشخص اور قومی وملی وحدت کو نقصان پہنچانے کی تگ ودو میں مصروف ہوگئے۔ چنانچہ:

''اِن مسلمان علماء اور لیڈروں کو ذہنی طور پر اپنی گرفت میں دیکھ کر گاندھی اور دیگر ہندو زعما نے سوچا کہ (اب) اِن مسلمانوں سے اُن کا امتیازی مذہبی شعار ''گائے کی قربانی'' یا ہندو کے الفاظ میں ''گاؤ کشی'' ترک کروانا کوئی مشکل نہیں رہا، تو انہوں نے زور دے کر کہنا شروع کردیا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں وجہ تفرقہ صرف اور صرف گائے کی قربانی ہے اور اگر مسلمان اِس فعل قبیح کو بند کردیں تو مسلمان اور ہندو ہمیشہ کیلئے ایک ہوسکتے ہیں۔'' (۴۹)

چنانچہ ہندوؤں کی خوشنودی کیلئے کانگریسی ذہن کے لوگ بالخصوص ابوالکلام آزاد اور مفتی کفایت اللہ دہلوی (۱۸۷۵ء۔۱۹۵۲ء) وغیرہ جو شروع ہی سے اِس بارے میں ہندوؤں کے ہم نوا تھے، نے دام ہم رنگ زمین بچھا کر اِس تحریک میں شامل دوسرے رہنماؤں کو بھی اپنا ہم خیال بنالیا۔ اور اب اِن نام نہاد مسلمان رہنماؤں کا سب سے بڑا فریضہ اور وظیفہ مسلمان قوم سے گائے کی قربانی کو ختم کرنا ہی قرار پایا۔

سیّد سلیمان اشرف کے بقول:

''مسلم لیڈروں نے مسلمانوں کی آنکھوں میں خاک جھونکنے کی کوشش کی ہے اور قربانی جیسے اہم رکن مذہبی کو اہل ہنود کی محبت میں نہایت بے دردی سے قربان کردیا ہے۔ عوام سے کہا جاتا ہے کہ ہندو لیڈر جب مسئلہ خلافت میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں تو پھر بحیثیت ''ایک شریف قوم'' ہونے کے ہمیں بھی کچھ عملی ثبوت دینا ضرور ہے اور وہ نہیں ہے مگر گائے کی قربانی کا چھوڑنا...... یہ محض ابلہ فریبی کی باتیں ہیں جو یہ کہا جاتا ہے کہ مسئلہ خلافت میں ہنود کی ہمدردی ہمیں ترک قربانی گاؤ پر

مجبور کرتی ہے۔''(۵۰)

گاندھی اور ہمارے علماء

فرنگی محل (لکھنو) مسلمانان ہند کی مذہبی اور تہذیبی اقدار کا پیشوا اور رشد وہدایت کا مرکز رہا ہے۔اسی فرنگی محل نے درس نظامی کے بانی ملا نظام الدین (۱۶۷۷ء۔۱۷۴۸ء)، بحرالعلوم مولانا عبدالعلی (۱۷۳۱ء۔۱۸۲۰ء) اور مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی (۱۸۴۸ء۔۱۸۸۹ء) جیسے متبحر عالم پیدا کئے۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی جن کا شمار اپنے وقت کے جید علماء میں ہوتا ہے، کا تعلق بھی اسی خانوادہ فرنگی محل سے تھا۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں جب خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس درگاہ حضرت رسول نُما، دہلی میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔تو سیّد سلیمان اشرف نے اِس اجلاس میں علماء کی تقاریر بالخصوص مولانا عبدالباری فرنگی محلی جنھوں نے مولانا مصطفےٰ رضا خاں (۱۸۹۳ء۔۱۹۸۱ء) کے بقول یہاں تک فرمادیا کہ ''میں آئندہ گائے کی قربانی نہ دوں گا، عام مسلمین میری اتباع کریں'' کے اِس طرزِ عمل کی سخت گرفت کی۔اور گاندھی نوازی میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ترکِ قربانی کے اِس غیر شرعی اعلان کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے اپنی کتاب ''الرشاد'' میں ''گاندھی اور ہمارے علماء'' کے عنوان کے تحت لکھا:

> ''اِس اجلاس میں اِن علماء کی تقریروں کو دیکھو جن کی اُس وقت لیڈری مسلم ہوچکی تھی اُن کا بیان ہے کہ مہاتما گاندھی کی پہلی ہی ملاقات کا اُن پر یہ اثر ہوا کہ قربانی گائے کی اِس خاندان سے موقوف ہوگئی جس سے علوم دینیہ کی نہریں کسی وقت نکل کر اکثر حصص ہند کو سرسبز وشاداب کرتی تھیں۔جس خاندان کے اکابر نے یہ فتویٰ دیا تھا کہ جن شہروں میں گائے قربانی دی جاتی ہے اگر وہاں کے مسلمان باشندے بہ پاس ہنود یا خوف ہنود ترکِ قربانی گاؤ کریں گے تو گناہ گار ہونگے اُن مسلمانوں پر گائے کی قربانی واجب ہے۔پھر مسلم لیگ کا خطبہ صدارت پڑھو تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ ترکِ قربانی گاؤ کا ارادہ اور عمل کب سے

> تھا۔ہاں اِس قدر ضرور فرق پاؤ گے کہ پہلے لازم تھا اب متعدی ہوگیا پہلے ترکِ قربانی کیلئے گونا گوں شکلوں میں مسلمانوں کو ترغیب نہیں دی جاتی تھی اب نہ صرف ترغیب وتحریص ہے بلکہ سعی وکوشش ہے کہ کسی طرح مسلمان گائے کی قربانی ترک کردیں۔''(۵۱)

قربانی یا گاؤ کشی تعبیر کی غلطی

دسمبر ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ کا اجلاس حکیم اجمل خاں صدرِ مسلم لیگ کی زیر صدارت امرتسر میں منعقد ہوا۔جس میں گاندھی، نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، مسز اینی بسنت اورسری نواس شاستری سمیت متعدد کانگریسی رہنماؤں نے بھی شرکت۔چونکہ مسٹر گاندھی اِس سے قبل مسلمانانِ ہند کو یہ ہدایت کرچکے تھے کہ وہ گوشت ترک کردیں اور ترکاریوں پر گزارہ کریں۔ چنانچہ اِس اجلاس میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے قرارداد پیش کرتے ہوئے تجویز دی کہ عیدالاضحیٰ پر گائے کی قربانی کے بجائے دوسرے جانوروں کی قربانی کی جائے۔جبکہ حکیم اجمل خاں نے اپنے خطبہ صدارت میں قربانی جیسے اہم دینی شعار کو گاؤ کشی سے تعبیر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ''گاؤ کشی کا ذکر ہم لوگ عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں کرتے رہے ہیں لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اِس مسئلہ کا زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جائے تا کہ ہم کسی معقول نتیجہ تک پہنچ سکیں۔''(۵۲)

ساتھ ہی حکیم صاحب نے مسلمانوں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ زیادہ جوش اور سرگرمی کے ساتھ ہندوؤں کی طرف اپنا دوستی کا ہاتھ بڑھائیں اوراُن کے مقدس شہروں کاشی، اجودھیا، متھرا اور بندرابن میں گائے کی قربانی کے بجائے دوسروں جانوروں کی قربانی کو اختیار کریں۔اِس خطبے میں حکیم صاحب نے قربانی کی مذہبی حیثیت پر بھی بحث کی اور جوشِ خطابت میں ایک حدیث پاک میں تحریف تک کرگئے مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ:

''اسلام میں گائے کے بجائے بھیڑ کی قربانی زیادہ افضل ہے اور یہ کہ

اسلامی احکام میں گائے کی قربانی کہیں بھی صراحتاً لازم نہیں ہے۔'' (۵۳)

درحقیقت حکیم صاحب کے پیشِ نظر جو ہدف تھا اُس کی حکمت یہی تقاضا کرتی تھی کہ اسلامیانِ ہند کو گائے کی قربانی ترک کرنے پر قائل و آمادہ کیا جائے۔

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کی گرفت

چنانچہ اِس موقع پر سیّد سلیمان اشرف نے تحریفِ حدیث اور قربانی جیسے اہم دینی شعار کو گاؤ کشی سے تشبیہ دینے کا سخت نوٹس لیا اور حکیم اجمل خاں کی گرفت کرتے ہوئے نہ صرف قربانی اور گاؤ کشی کے معنی و مفہوم کو واضح کیا بلکہ روایتِ حدیث میں لغزش اور تعبیرِ الفاظ سے مرتب ہونے والے نقصانات کی نشاندہی بھی کی اور اُن کی دینی و فکری اصلاح کی کوشش کرتے ہوئے لکھا:

> ''صدرِ مجلس نے مسئلہ قربانی کی بحث شروع کرتے ہوئے جو عنوان قائم کیا ہے موقعہ و وقت کے لحاظ سے وہی عنوان کافی تکلیف دہ ہے۔ ہندوؤں سے مصالحت ہورہی ہے اتحاد و اتفاق کے آئین وضع کیے جارہے ہیں ایسے وقت میں قربانی کو گاؤ کشی سے تعبیر کرنا ہنود کی نفرت بڑھانا اور مسلمانوں کے عقیدے میں قربانی کو تخفیف کرکے دکھانا ہے انصاف کیجئے کجا قربانی اور کجا گاؤ کشی، ہر شخص جانتا ہے کہ تعبیرِ الفاظ سے اثر کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے۔ قربانی سے ذہن ایک دینی رکن کی طرف منتقل ہوتا ہے جو لفظ گاؤ کشی سے ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ اگر گاؤ کشی کی جگہ قربانی کہا جاتا تو صحیح ترجمانی الفاظِ حدیث و فقہ کی ہوتی، قربانی کیلئے شریعت نے قتل اور قربانی دینے والے کیلئے قاتل کا لفظ نہیں کہا ہے شرعی لفظ ''اضحیہ'' ہے جس کا صحیح ترجمہ قربانی ہے نہ گاؤ کشی۔ لفظ قربانی کہنے میں یہ فائدہ بھی تھا کہ بجائے خود اہلِ ہنود بھی انصاف کرتے کہ مسلمانوں کا یہ عمل جبکہ مذہبی و دینی ہے تو ایسی صورت میں جبکہ اتفاق واتحاد ہورہا ہے، مذہب میں دخل دینا مناسب نہیں۔ اپنے سفاک و بے

> رحم ہاتھوں کو مسلمانوں پر سے اب کوتاہ کرنا چاہئے۔ صدرِ مجلس نے مسئلہ قربانی کے متعلق دوسری بے انصافی یہ کی کہ اُس کے متعلق یہ فتویٰ دیا کہ قربانی سنت ہے۔ قیدِ موکدہ بھی نہیں بڑھائی حالانکہ مذہبِ حنفی میں قربانی واجب ہے مفتیٰ بہ مذہب یہی ہے...... کیا اِس سے قربانی کی اہمیت کم کرکے دکھانا مقصود نہیں ہے۔ حیرت افزا ستم تو یہ ہے کہ ایک حدیث حضرت اُمِ سلمیٰ سے روایت کی جاتی ہے اور اُس سے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ عرب میں بکری کی قربانی کا رواج تھا۔'' (۵۴)

غیر اسلامی شعائر کے خلاف نعرۂ حق

سیّد سلیمان اشرف برِعظیم پاک و ہند میں رہبرانِ قوم کے اِس خطرناک رجحان کو قوم و ملت کی بقا اور استحکام کیلئے زہرِ قاتل سمجھتے تھے۔ آپ جانتے تھے کہ اِس وقت کسی شعائرِ اسلامی کا ترک کرنا دراصل اسلامی تعلیمات سے دوری اور اپنے جداگانہ ملی تشخص کی نفی ہے چنانچہ آپ نے اُس زمانے میں اِس خطرناک رجحان کے خلاف نعرۂ حق بلند کرتے ہوئے دو معرکۃ الآراء کتابیں ''الرّشاد'' اور ''النور'' تصنیف فرمائیں۔

''الرّشاد'' ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کے ہیجانی دور میں جب کہ علماء کے ایک گروہ نے خوشنودیِ ہنود کی خاطر شعائرِ اسلام کو پس پشت ڈال دیا تھا، کی یادگار تاریخی و علمی کاوش ہے۔ جو ۱۹۲۰ء میں مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج سے شائع ہوئی۔ اور ہزاروں کی تعداد میں اِس کتاب کے نسخے آپ نے اپنی جیبِ خاص سے مسلمانانِ ہند میں استفادے و رہنمائی کیلئے مفت تقسیم فرمائے۔

سیّد سلیمان اشرف نے بنیادی طور پر اِس کتاب میں مسلمانوں کے امتیازی مذہبی شعار ''گائے کی قربانی'' کو موضوعِ گفتگو بنایا اور مسئلہ قربانی گاؤ اور انسدادِ گاؤ کشی کے جملہ عنوانات پر سیر حاصل بحث کی۔ ساتھ ہی آپ نے ان ناعاقبت اندیش علماء اور سیاسی لیڈروں کی سعیٔ انسدادِ قربانی گاؤ کا عموماً اور حکیم اجمل خاں کی ''زیادت فی الحدیث'' (۵۵) کا خصوصاً نوٹس بھی لیا اور ہندوؤں کے دامِ تزویر کے اسیر نام نہاد علما کی جانب سے شعائرِ اسلامی

سے روگردانی کی مہم کے تاروپود بکھیر دیئے۔

برعظیم کی تاریخ میں یہ پہلا موقع نہیں تھا جو ہندوؤں کی جانب سے گائے کی قربانی بند کرانے کی کوشش کی گئی تھی بلکہ وہ تو سلطنت مغلیہ کے ختم ہوتے ہی اِس تگ و دو میں مصروف تھے لیکن اُن کے اِن مذموم ارادوں کو علمائے حق مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی اور محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔

حالانکہ ۱۹۱۱ء میں جب ہندوؤں نے گاؤ کشی بند کرانے کیلئے گورنمنٹ کو ایک عرضداشت پیش کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ گاؤ کشی سے ہماری دل آزاری ہوتی ہے، لہٰذا اِس پر قانوناً پابندی لگائی جائے۔تو اُس وقت کانگریسی ذہن کے مسلمان لیڈروں نے اِس عرضداشت پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی تھی۔

محدثِ بریلوی اور استفتائے مسلم لیگ بریلی

اُس وقت مسلم لیگ کی جانب سے سیّد عبدالودود (جوائنٹ سیکرٹری، آل انڈیا مسلم لیگ بریلی شاخ) ہندوؤں اور کانگریس نواز مسلمانوں کے مشترکہ عزائم کو ناکام بناتے ہیں اور اِس مسئلے کو محدث بریلوی کی خدمت میں مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کرتے ہوئے ایک بار پھر رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں:

''آج کل ہنود کی طرف سے نہایت سخت کوشش اِس اَمر کی ہورہی ہے کہ ہندوستان سے گاؤ کشی کی رسم موقوف کرادی جائے اور اِس غرض سے انہوں نے ایک بہت بڑی عرضداشت گورنمنٹ کو پیش کرنے کیلئے تیار کی ہے جس پر کروڑوں باشندگانِ ہندوستان کے دستخط کرائے جارہے ہیں۔بعض ناعاقبت اندیش مسلمان بھی اِس عرضداشت پر ہندوؤں کے کہنے سے دستخط کررہے ہیں۔ایسے مسلمانوں کی بابت شرع شریف کا حکم کیا ہے؟ اور اِس مذہبی رسم کے جو شعائر اسلام میں سے ہے بند کرانے میں مدد دینے والا گناہ گار اور عنداللہ مواخذ دار ہیں یا نہیں۔؟'' (۵۶)

چونکہ محدث بریلوی دو مرتبہ پہلے ہی اِس مسئلے پر اپنی مفصل رائے کا اظہار کرچکے تھے۔اِس لیے آپ نے مختصراً جواب دیتے ہوئے لکھا:

''فی الواقع گاؤ کشی مسلمانوں کا مذہبی کام ہے۔جس کا حکم قرآن میں متعدد جگہ موجود ہے۔اِس میں ہندوؤں کی امداد اور اپنی مذہبی مضرات میں کوشش اور قانونی آزادی کی بندش نہ کرے گا مگر وہ جو مسلمانوں کا بد خواہ ہے۔اور ہنود کی بے جاہٹ دھرمی بجار کھنے کیلئے یک قلم اِس رسم کو اٹھا دینا ہرگز جائز نہیں۔(۵۷)

اہل ہنود کی تدابیر وحیل اور جفا کاریوں کی داستان

چنانچہ اِس تناظر میں سیّد سلیمان اشرف اُس وقت کے حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے اپنی کتاب ''النور'' میں لکھتے ہیں:

''سن ستاون کا ہنگامہ اور ستارہ صلاح و فلاح مسلمانان ہند کا غروب مفہوم مرادف ہے مسلمانوں کے اِس تنزل سے اُن کے ہمسایہ قوم نے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور بہت جلد مسلمانوں کے املاک اور دیگر جاہ وعزت کے سامان اہل ہنود کے دست تصرف میں آگئے۔ ہندوؤں کو جب اِس طرف سے ایک گونہ اطمینان پیدا ہوگیا تب انہوں نے مسلمانوں کے مذہب پر حملہ آوری شروع کی، مظالم و جفا کاری کا ایک کوہ آتش فشاں تھا جس سے انواع واقسام کے شعلے پھٹ کر نکلتے اور جابجا مسلمانوں کی عزت وحمیت ان کے حقوق کے ساتھ خاک سیاہ کرنا چاہتے تھے۔یوں تو مسلمانوں کا ہر رکن مذہبی اہل ہنود کو چراغ پا کردینے کا کافی بہانہ تھا لیکن بقرعید پر گائے کی قربانی سے جو تلاطم اور ہیجان اُن میں پیدا ہوتا اُس کا اندازہ کرنا بھی دشوار ہے۔لیکن غیرت مند مسلمان اپنے اِس دینی استحقاق کے قائم رکھنے میں ہمیشہ استقلال و ہمت سے اُن کی ستم گاریوں کی مدافعت کرتے رہے۔محض سفا کی و بے

رحمی کو چند سال کے تجربہ نے جب کہ ناکافی ثابت کیا تو اہل ہنود تدابیر و
حیل کی آمیزش اپنی جفا کاریوں میں ضروری سمجھ کر تدلیس و تلبیس سے
بھی کام لینے لگے۔ چنانچہ ۱۲۹۸ ہجری میں اہل ہنود نے ایک عبارت
استفتا مرتب کر کے بنام زید و عمر مختلف شہروں سے متعدد علمائے کرام کی
خدمت میں روانہ کی۔ استفتا میں اِس امر پر زور دیا گیا تھا کہ موقع بقر
عید پر گائے کی قربانی جب کہ موجب فتنہ وفساد ہے اور امن عامہ میں
اِس کی وجہ سے خلل آتا ہے اگر مسلمان گائے کی قربانی موقوف کردیں تو
کیا مضائقہ ہے۔ حضراتِ علماء نے نہایت مدلل طریقہ پر اِس کا یہی
جواب تحریر فرمایا کہ شریعت نے جو اختیار عطا فرمایا ہے اُس سے فائدہ
اٹھانے کا ہمیں حق حاصل ہے، خوف فتنہ ہو تو حکومت کی قوت کو متوجہ
کرنا چاہیے۔ بہ پاس خاطر ہنود یا خوف ہنود اپنے دینی حق سے باز رہنا
ہرگز روا نہیں۔ دو تین برس بعد پھر اسی قسم کا استفتا جاری ہوا اور پھر
دربار شریعت سے یہی فتویٰ صادر ہوا۔ مولانا المفتی احمد رضا خاں
صاحب بریلوی کا رسالہ انفس الفکر قربان البقر ۱۲۹۸ ہجری کا تصنیف
ہے اُسے ملاحظہ فرمائیے اور مجموعہ فتاویٰ مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم کا
مطالعہ کیجئے ساری حقیقت واضح ہوجائے گی......علامہ چڑیا کوٹی مولانا
محمد فاروق صاحب عباسی نے ایک رسالہ چھپوا کر شائع فرمایا جس میں
دلائل عقلیہ اور نقلیہ سے اچھی طرح ثابت فرمادیا کہ اہل ہنود کا ادعائے
باطل محض بے بنیاد ہے۔'' (۵۸)

علمائے حق اور جہدِ مسلسل کی نصف صدی

اِس مقام پر سیّد سلیمان اشرف شعائر اسلامی اور ارکان مذہبی کے خلاف ہندوؤں کی
پچاس سالہ سازشوں کے خلاف علمائے حق کی تاریخ ساز جدوجہد اور مومنانہ بصیرت و
استقامت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہندو مسلمانوں کے شعار دین کی توہین اور ارکان مذہبی کے نیست و
نابود کرنے میں اپنی پوری جسمانی مالی اور دماغی قوت گوناگوں طور پر
صرف کرنے میں پچاس برس سے مسلسل ساعی و کوشاں ہیں لیکن
علمائے کرام اور عامہ مسلمین آج تک اُن کے دامنوں میں پناہ لینے سے
اظہار بیزاری کرتے رہے۔'' (۵۹)

''الرّشاد میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں گائے کی قربانی کا آج تک باقی رہنا (مسلمانوں کی)
بیش بہا قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ ان گراں بہا قربانیوں کے حقوق اگر ادا
نہ کیجئے تو کم از کم اُسے ملیا میٹ بھی نہ کیجئے۔'' (۶۰)

آپ ان تمام کوششوں اور قربانیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ترکِ قربانی کے حامیوں
سے سوال کرتے ہیں کہ کیا:

''جس شان اسلامی اور رکن دینی کو مسلمانوں نے اپنا مال اپنی جان اپنی
آبرو دے کر اِس طرح قائم رکھا ہو وہ اِس بے دردی اور بے وقعتی سے
پامال کئے جانے کے قابل ہے۔'' (۶۱)

شعائرِ اسلامی کی بے توقیری اور اہل اسلام کی خودکشی

دنیا کے تمام انسانوں کا یہ حق حاصل کہ وہ اپنے اپنے مذہب اور اُس کی تعلیمات پر
پوری آزادی سے عمل پیرا رہیں اور اُن پر کسی دوسرے مذہب اور اُس کے طور طریقوں کو جبراً
مسلط نہ کیا جائے، یہ اصول اہل اسلام کے ہاں کبھی متنازعہ نہیں رہا۔ اِس کا انکار کوئی ایسا شخص
ہی کر سکتا ہے جو اسلامی تعلیمات سے یکسر نابلد ہے۔ لیکن اِس رواداری کی آڑ میں اسلام کے
کسی مسلمہ اصول و شعائر کا گلا گھونٹا جائے یا اپنوں اور بے گانوں کی طرف سے اس پر عمل پیرا
ہونے سے منع کیا جائے یا روکا جائے، یہ عمل دین اسلام میں کھلی دخل اندازی کے مترادف
ہے۔ جس کی کسی طور بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

چنانچہ اِس تناظر میں سیّد سلیمان اشرف ''شعارِ اسلامی کی بے توقیری اور مسلمانوں

کی خود کشی'' کے عنوان کے تحت تحریر کرتے ہوئے جو سوالات کھڑے کرتے ہیں وہ ہندو فکر وعزائم اور اُن مسلمان لیڈوروں کے جذبہ ہمدردی کی اصل حقیقت کو پوری طرح عیاں کررہے ہیں جو اِس معاملے میں ہندوؤں کے ہم نوا اور ہم خیال ہیں۔آپ لکھتے ہیں:

''کس قدر حسرت و حیرت کا مقام ہے کہ ایک ذمہ دار معزز مسلمان اپنے منہ سے یہ کہے کہ ہم اِس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہمارے ملکی بھائیوں کے دل گائے کی قربانی سے زیادہ دُکھتے ہیں۔ مسلمان مذہبی رکن ادا کریں اِس سہولت اور یسر سے مستفیض ہوں جو اُنہیں خدا نے اُس کے برگزیدہ رسول نے اپنی عنایت سے دیا اپنے روپیہ سے خریداری کریں۔ اپنی ملکیت میں تصرف کریں، اپنی زمین اپنے مکان میں اُس عبادت کو بجالائیں، باوجود اِن باتوں کے ملکی بھائیوں کا دل بہت زیادہ دکھ جائے یہ مسلمانوں کی خوبی تقدیر۔کیا ملکی بھائیوں کے مال سے خریداری کی گئی تھی؟ کیا اُن کی ملکیت میں دست اندازی کی گئی ؟ کیا اُن سے چھین کر لایا گیا؟ کیا اُن کی زمین یا اُن کے مکان میں اِس عبادت کو ادا کیا گیا؟ کیا گائے کی قربانی کی منادی کی گئی؟ آخر ان کا دل کیوں دکھ گیا؟مسلمانوں پر ہر طرح کی آفت عین عید کے دن لائی جائے۔نماز عید سے وہ روکے جائیں ۔قتل وہ ہوں۔ املاک اُن کی غارت ہوں۔گاؤں اُن کے لوٹے جائیں۔لیکن یہ سب دل نوازی اور دل دہی برادر نوازی اور حق ہم وطنی۔مگر اہل ہنود کے خیال اور وہم کو بھی اگر ایک ذرا جنبش ہوجائے تو یہ ایسی دل آزاری کہ جس کا خود ایک معزز ذمہ دار مسلمان کو اعتراف اور ایک منتخب و برگزیدہ جماعت مسلمین کو اقرار و تسلیم ۔ایسا فیصلہ انتہا سے زیادہ مسلمانوں کی بدقسمتی کی دلیل ہے......ہم یہ پوچھتے ہیں کہ نفس ذبح گائے سے اُن کے دل کو تکلیف پہنچتی یا مسلمانوں کے گائے ذبح

کرنے سے، اگر جواب میں دوسری شق ہے یعنی مسلمانوں کے ذبح کرنے سے انہیں تکلیف ہوتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ پھر اِس میں گائے کی خصوصیت کیا؟ مسلمانوں کا وجود ہی اُن کیلئے دل آزار ہے، جیسا کہ اُن کے برتاؤ سے ہر روز عیاں ہی ہوتا ہے۔مسلمانوں سے انہیں ایسی نفرت ہے کہ اُن کے سایہ سے بھی وہ پرہیز کرتے ہیں تو پھر کھلم کھلا یہی کہیے گائے کی قربانی کو مسلم کشی کا حیلہ کیوں بنائیے اور جواب اگر شق اوّل ہے یعنی نفس ذبح گائے تو یہ دعویٰ محض بے دلیل ہے۔تمام فوجی چھاونیوں میں گائیں ذبح ہوتی ہے۔مگر کسی نے آج تک کان بھی نہیں ہلایا۔تھوڑی دیر کیلئے اسے بھی جانے دیجئے جب دل دکھنے کی علت نفس ذبح گائے ہے تو خیال کا پاؤں اور وہم کے قدم کس نے باندھ دیئے ہیں جو ہندوستان سے آگے نہ جائیے۔''(۶۲)

ذبح حیوان پر دل دُکھنے کی حقیقت

پھر آپ کی ہندوؤں کے اِس اعتراض کہ قربانی گائے سے اُن کے دل دکھتے ہیں اور اِس معاملے میں ہندوؤں کا ساتھ دینے والے مسلمانوں کے طرزِ عمل کو دلائل سے رد کرتے ہیں اور اِسے ایک ذہنی وسوسے اور وہم سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک لفظ دل دکھنا جو ہر طرح کے فساد وظلم اور درندگی کا سپر بنالیا گیا ہو ضرورت ہے کہ اُس کی حقیقت بھی منکشف کردی جائے۔دکھ کی چند قسمیں ہیں ایک تو حسی ہے یعنی بااعتبار واقعہ ایک نا ملائم شے جب کسی حصہ بدن سے ملے گی یا سرایت کرے گی تو اُس سے تکلیف کا احساس ہوگا۔اور یہ ظاہر ہے کہ کسی حیوان کا ذبح کرنا کسی انسان کے دل پر چھری چلانا نہیں ہے۔دوسری قسم اِس کی عقلی ہے یعنی کسی ایسے کام کا کرنا جو عقل کے نزدیک مکروہ ہو اور اُس فعل سے عقل کراہیت کرتی ہے۔ذبح حیوان اِس قسم میں بھی داخل نہیں ......اِسے ناگوار عقلی کہنا

سراسر عقل اور واقعہ کے خلاف ہے...... جب عقل کے نزدیک حیوان کا یہ رتبہ ہے کہ وہ انسان کی ملکیت ہے تو ذبح حیوان پر دل دکھنا عقلاً دکھ نہیں ہوسکتا اب جب کہ حسی اور عقلی دونوں کی نفی ہوگئی تو اِس دل دکھنے کو بجز افسانہ اور بہانہ کے اور کیا کہا جائے۔ہاں اگر یونہی متعصبانہ زبردستی کی جائے تو اس دل دکھنے کو وہمی البتہ کہا جاسکتا ہے۔'' (۶۳)

مراق اور مالیخولیا کا علاج کرائیے

آگے چل کر آپ ایسے اشخاص کو اِس وہم و وسوسے سے بچنے اور دور رہنے کی احتیاطی تدابیر بتاتے ہیں۔اور عمل پیرا ہونے کے بعد بھی افاقہ نہ پانے کی صورت اِن وہمی افراد کو اپنے مراق اور مالیخولیا کے علاج کرانے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسے اشخاص جنہیں وہم نے گھیر لیا ہے اور وہ مطلقاً ذبح حیوان یا کسی خاص حیوان کا ذبح اپنا دل دکھنا سمجھتے ہوں انہیں چاہئیے کہ مذبح سے پرہیز کریں اور ایسے مواقع پر نہ جائیں جہاں یہ نظارا انہیں دیکھنا ہو۔ اِس دنیا میں بہت سے ایسے واقعات ہوا کرتے ہیں جس سے کسی کسی کو تکلیف واذیت محسوس ہوتی ہے تو اِس اذیت سے محفوظ رہنے کا طریقہ اُس سے کنارہ کشی ہے۔مثلاً جو لوگ شراب کو نجس اور حرام جانتے ہیں اُنہیں اُس کے تعفن اور بدبو سے سخت اذیت پہنچتی ہے۔بعض مواقع سفر میں جب دورِ شراب بادہ خواروں میں شروع ہوتا ہے تو اُس سے پرہیز کرنے والا باوجود فرسٹ وسیکنڈ کے ٹکٹ رکھنے کے بھی انٹر یا تھرڈ میں جا بیٹھتا ہے اور اپنے دماغ کو اُس بوئے بد کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے۔پس وہ اشخاص جنہیں کسی خاص جانور کا ذبح ناگوار خاطر ہو وہ ایسے مواقع میں ذبح کے وقت اُس مقام پر نہ جائیں۔جب تکلیف دہ نظارہ آنکھوں سے اوجھل اور نظر سے پوشیدہ ہوگیا تو پھر پڑوس اور ایک منزل اپنا شہر یا ملک دور دست سب ایک حکم میں داخل ہوگئے (پھر

بھی) اگر کوئی یہ کہے کہ صرف دیکھنے سے ہی میرا دل نہیں دُکھتا بلکہ اِس خبر کے سننے اور اِس اَمر کے خیال کرنے سے کہ فلاں جانور ذبح ہورہا ہے یا ذبح ہوگا میرا دل دُکھتا ہے تو ایسے شخص سے ہر عاقل اور صحیح دماغ رکھنے والا یہی کہے گا کہ تو اپنا علاج کر۔اِس مراق اور مالیخولیا کا علاج کرانا بہتر ہے اور سہل ہے اس سے کہ تمام خلائق اِس مراق کا شکار بنائے جائیں اور انسانوں کے ساتھ وحشیانہ درندگی عمل میں لائے جائے جو واقعی اذیت اور حقیقی تکلیف ہے۔(۶۴)

یہ کہاں کا انصاف ہے!

پھر آپ اِس اَمر کی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں کہ یہ دل آزاری ہے یا کہ اذیت ستانی کہ محض اپنی وہمی تسکین کیلئے کسی قوم کو اُس کی پسندیدہ غذا سے محروم کردیا جائے اور اُس عمل سے روک دیا جائے جو اُس کا شعائر مذہبی ہو۔ایسی وہمی اذیت کی پیروی پر ضد اور اصرار جو کسی اور کیلئے حقیقی اذیت اور تکلیف کا باعث ہو کہاں کا انصاف ہے۔چنانچہ اِس تناظر میں آپ لکھتے ہیں:

لہٰذا'' وہ شخص یا وہ قوم جسے اوہام نے گھیر لیا ہے اور کسی خاص جانور کے ذبح سے دل دکھنے کا مدعی ہو تو اُسے اُن اقوام واشخاص کا بھی خیال رکھنا چاہیے جن کی غذا اور خوراک وہ خاص جانور ہے۔انسان کو اُس کے رزق وغذا سے محروم رکھنا اُن کی راحت کو پامال کرنا بڑی دل آزاری اور سخت اذیت رسانی ہے۔غور کیجیے اور انصاف سے کام لیجئے اگر وہ جانور ذبح ہو تو ایک قوم کو وہمی اذیت ہوتی ہے اور اگر ذبح نہ ہو تو دوسری قوم کو واقعی اور حقیقی اذیت ہوتی ہے تو حقیقت کو چھوڑنا اور وہم کی پیروی کرنا کہاں کا انصاف ہے۔''(۶۵)

قربانی گاؤ پر سیّد سلیمان اشرف کا دوٹوک موقف

اِس موقع پر سیّد سلیمان اشرف نے گائے کی قربانی کے حوالے سے جو ٹھوس، واضح

اور دو ٹوک موقف اختیار کیا۔وہ دراصل محدث بریلوی کے اُسی موقف کی ترجمانی وتشریح اوراعادہ ہے جو پہلے آپ کی نظر سے گزر چکا ہے۔سیّد سلیمان اشرف نے محدث بریلوی کے ہی دینی وشرعی استدلال کو آسان پیرائے میں وضاحت کے ساتھ بیان کرتے لکھا:

''ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی کچھ اہل ہنود سے طالبِ امن ہوکر آباد نہیں ہوئی بلکہ ایک مدت تک ہندوؤں پر حکومت وحکمرانی کرنے کے بعد اُن کے مساوی حالت محکومیت میں شریک ہے تو اُسے اِس کا مساوی حق حاصل ہے کہ اپنے حقوق کی نگہداشت رکھے اور یہ کوئی دل آزاری نہیں۔مسلمانوں کو گائے کی قربانی اور ذبح کرنے کا جو اختیار اکثر بلادِ ہند میں حاصل ہے اُسے اِس طرح اپنے ہاتھوں کھونا اور اہل ہنود کے قتل وغارت گری سے خوف زدہ ہوجانا ،اسلام کو ذلیل کرنا اور دین کی توہین عظیم ہے۔ہندوؤں کے خوف سے ایسی دنائت اور ذلت اختیار کرنا اوراپنی دینی مغلوبی کا ثبوت قائم کرنا ہرگز شریعت کے نزدیک جائز نہیں۔خدا کیلئے مسلمانوں کو ایسی بزدلی اور بے حیائی کا سبق نہ دیجئے،کفار ومشرکین کی ہیبت اِس طرح قلوبِ مسلمین میں راسخ نہ کیجئے۔کسی مذہبی اَمر کے انجام دینے سے جب کہ کفار وملحدین مانع ہوں اور اپنے زور وقوت سے مسلمانوں کو باز رکھنا چاہیں تو اُس وقت اَمر مباح بھی واجب ہوجاتا ہے۔قربانی فی نفسہٖ مسلم،آزاد، مستطیع پر واجب،لیکن گائے یا اونٹ یا بھیڑ بکری اُن میں سے بالتخصیص کوئی جانور واجب نہیں۔لیکن جب کہ گائے کی قربانی پر ہندوؤں نے مسلمانوں کو روکا اور بزور باز رکھنے کی پیہم انہوں نے کوششیں کیں تو اب گائے کی قربانی مسلمانوں پر واجب ہوگی۔اور بہ پاس خاطر کفار (یا) ہیبت کفار سے گائے کی قربانی ترک کرنا حمایت دین سے روگردانی اور حقوق مسلم سے بے پروائی ظاہر کرنا ہے، جوشریعت کے نزدیک گناہ

ہے اور سخت گناہ ہے۔'' (۶۶)

آپ دو ٹوک اور واضح الفاظ میں لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کو ہرگز اِس کا حق نہیں کہ وہ یہ فیصلہ کرلیں اور عہد کرلیں کہ ہم قربانی گائے کی نہ کریں گے شریعت کی رُو سے ایسا عہد کرنے والا گناہ گار ہوگا۔خدا کے حلال کو حرام کرنے کا اختیار کسی کو نہیں۔''ہے(۶۷)

ایمان افروز انتباہ

اِس موقع پر سیّد سلیمان اشرف برِعظیم کے مسلمانوں کو گائے کی قربانی ترک کرنے سے مستقبل میں مرتب ہونے والے اثرات سے بھی آگاہ کرتے ہیں اور متنبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانو آنکھیں کھولو اور لیڈروں کی باتیں ہرگز نہ سنو ورنہ پچھتاؤ گے اور پھر اُس وقت یہ پچھتانا کچھ فائدہ نہ دے گا۔قربانی گائے کی جس شہر یا قصبہ یا دیہات سے اُٹھ گئی پھر تمہاری طاقت سے یہ باہر ہوجائے گا کہ تم دوبارہ گائے کی قربانی وہاں دے سکو۔دیکھو ہوشیار ہوجاؤ۔'' (۶۸)

سیّد سلیمان اشرف نے ''الرشاد'' میں قربانی گاؤ کے تحفظ اور اُسے جاری رکھنے کی پرزور حمایت کرتے ہوئے اِس بات پر بہت زور دیا کہ برِعظیم کے مسلمانوں کو ہندو اور کانگریس نواز مولویوں کی جانب سے جو مغالطہ دیا جارہا ہے وہ اُس سے آگاہ وباخبر ہوں اور گائے کی قربانی جو کہ شعائرِ اسلام ہے اُسے جاری رکھیں۔ساتھ ہی آپ نے ترکِ قربانی کے حامیوں کی قرآن وسنت کی روشنی میں سخت گرفت وسرزنش بھی کی۔اور اُن پر واضح کردیا کہ یہ تنقید وسرزنش کسی ذاتی بغض وعناد کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے احکامات کی پیروی میں ہے۔اپنے اسی خلوص وللّٰہیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ حسبۃً للہ ہے اِس سے نہ کسی فرقہ کی دل آزاری مقصود ہے،نہ کسی کی لیڈری پر حملہ،نہ کسی کا خوش کرنا مدعا

ہے۔ہاں اُس کی خوشی ضرور مطلوب ہے جس کا غلام ہوں اور اُس کی رضا کی ضرورتمنا ہےجس کے پاس مرکر جانا ہے۔''(۶۹)

درحقیقت سیّدسلیمان اشرف نے ''الرشاد'' میں قربانیٔ گاؤ کے نام پر ہندو مظالم کوہی کھول کر بیان نہیں کیا بلکہ ستر (۷۰) سے زائد ذیلی عنوان قائم کرکے گائے سمیت تمام حلال جانوروں کے ذبح وقربانی سے متعلق عقلی ونقلی دلائل سے ثابت کیا کہ ذبح گاؤ پر ہندوؤں کا موقف باطل اور نہ صرف لغو ہے بلکہ اُن کی اپنی مذہبی کتابوں سے بھی اِس کی تردید ہوتی ہے۔آپ نے اپنی تصانیف ''الرشاد'' اور ''النور'' کے ذریعہ اُس دور میں علمائے حق کا صحیح اسلامی وشرعی موقف علمی واستدلالی قوت کے ساتھ پیش کیا اور علمائے سیاسی کے باطل دینی و سیاسی عزائم کے تاروپود بکھیر دیئے۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ ہندوستان کے بہت سے دینی وسیاسی رہنما ہندوؤں کی رضا وخوشنودی کیلئے ترکِ گاؤ کشی کی حمایت کررہے تھے۔سیّدسلیمان اشرف کسی رورعایت کے بغیر کلمہ حق بلند کررہے تھے۔آپ نے تمام تر تہمت اور الزام تراشیوں سے بے نیاز ہوکر قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند کیا اور شعائر اسلام کے تحفظ اور مسلم مفادات کے محافظ کا کردار ادا کیا۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لاالہ الا اللہ

سیّدسلیمان اشرف کی کتابِ زندگی ''آئینِ جواں مرداں حق گوئی اور بیباکی'' سے عبارت ہے۔دینی وفکری اصابت و استقامت اور حق گوئی آپ کا طرہ امتیاز تھا۔رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے ''اِتقُوا فَرَاسۃَ المُومِنِ فَاِنّہ یَنظُرُ بِنُورِ اللہِ'' کہ ''مومن کی فراست و دانائی سے ڈروکہ وہ نورالٰہی سے دیکھتا ہے۔''(۷۰)

سیّدسلیمان اشرف کے قول وفعل اور ارشاد وعمل کا جائزہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمانِ حق کا ایک عملی ثبوت ہے۔اور ہماری قومی وملّی زندگی کے ہر نازک موڑ پر سیّدسلیمان اشرف کے ارشادات، دانشِ نورانی کا وہ اظہار ہیں جس میں مومن کی فراست ودانائی جھلکتی

ہے۔حق گوئی وبے باکی نظر آتی ہے اور دور تک خوشامد، چاپلوسی اور مصلحت کوشی کہیں کوئی شائبہ بھی محسوس نہیں ہوتا۔سیّدسلیمان اشرف نے ہمیشہ ایک مردِ مومن کا کردار ادا کیا اور اسلام اور ملتِ اسلامیہ کے تحفظ وبقاواحیاء کیلئے ہمہ تن مصروفِ عمل رہے۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی

❀❀❀

حواشی وحوالہ جات

(۱) حسام احمد، سیّد، مضمون ''گائے پر سیاست کیوں اور آخر کب تک'' (دیکھئے، ۳۰، اکتوبر ۲۰۱۵ء ایکسپریس نیوز (https:/www.express.pk/story/403070/)

(۲) ایضاً

(۳) مسعود احمد، پروفیسر، حیات مولانا احمد رضا خان بریلوی، اسلامی کتب خانہ اقبال روڈ سیالکوٹ ۱۹۸۱ء، ص:۱۷۱

(۴) حسام احمد، سیّد، کا مضمون (دیکھئے ایکسپریس نیوز، ایضا)

(۵) ایضاً

(۶) ڈی این جھا، مضمون ''ہندو بھی گائے کھاتے تھے'' (دیکھئے، بی بی سی اردو نیوز (http://www.bbc.com/urdu/regional/2015/04/150405_beef_eating_dn_jha_mb

(۷) ایضاً ص:۱۷۱

(۸) احمد رضا بریلوی، مولانا، انفس الفکر فی قربان البقر، مشمولہ رسائل رضویہ جلد دوم، مرتبہ عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء، ص:۲۱۵، فتاوی رضویہ جلد ۱۴، رضا فاؤنڈیشن ص:۵۵۰_۵۴۵

(۹) ایضاً ص:۲۱۹_۲۱۸، فتاوی رضویہ جلد ۱۴، رضا فاونڈیشن، ص:۵۵۳

(۵) ایضاً ص:۲۲۳_۲۲۲، فتاوی رضویہ جلد ۱۴، رضا فاونڈیشن، ص:۵۵۸_۵۵۷

(۱۰) مسعود احمد، پروفیسر، حیات مولانا احمد رضا خان بریلوی، اسلامی کتب خانہ اقبال روڈ سیالکوٹ ۱۹۸۱ء، ص:۱۷۲۔ مجموعہ فتاویٰ کتاب الاضحیہ، مطبع یوسفی لکھنوص:۲/ ۲۸۳_۲۸۲۔

(۱۱) احمد رضا بریلوی، مولانا، انفس الفکر فی قربان البقر، بحوالہ، حیات مولانا احمد رضا خان بریلوی ڈاکٹر مسعود احمد، ص:۱۷۲۔ مجموعہ فتاویٰ کتاب الاضحیہ، مطبع یوسفی لکھنو، ۲/ ۲۸۳_۲۸۲

(۱۲) مصطفےٰ رضا خاں، مولانا، الملفوظ، حصہ اوّل، مطبوعہ کراچی، ص۱۶، بحوالہ حیات مولانا احمد رضا خان بریلوی، ڈاکٹر مسعود احمد، ص:۱۷۲

(۱۳) مسعود احمد، پروفیسر، تحریک آزادی ہند اور السواد اعظم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء ص:۳۳

(۱۴) ایضاً ص:۲۱

(۱۵) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۶

(۱۶) ایضاً ص:۱۴

(۱۷) ایضاً ص:۱۰_۹

(۱۸) ایضاً ص:۱۴

(۱۹) دسمبر ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مسلم لیگ نے ڈاکٹر مختار انصاری کی سعی اور تحریک سے یہ ریزولیشن پاس کیا کہ ''مسلمانوں کو چاہیے کہ ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ کریں اور گائے کی قربانی از خود ترک کر دیں۔'' (ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط مہاتما گاندھی کے نام، محمد عبدالقدیر بلگرامی، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۵ء، ص ۱۷) مشیر احمد قدوائی نے اپنے مضمون میں لکھا ''مسلمانوں کو از خود اجودھیا میں گائے کی قربانی بند کر دینی چاہیے۔ کیونکہ اجودھیا ہندوؤں کا مقدس تیرتھ ہے اور وہاں گایوں کے ذبح سے انُ کو سخت دل آزاری ہوئی ہے'' مسٹر مظہر الحق نے کہا ''میں اِس اَمر سے پورے طور پر متفق ہوں کہ مسلمان کانپور اور اجودھیا میں گائے کی قربانی سے محترز رہیں۔'' (ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط مہاتما گاندھی کے نام، محمد عبدالقدیر بلگرامی، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۵ء، ص ۱۷) خواجہ حسن نظامی نے لکھا ''ہندو ہمارے پڑوسی ہیں اور گاؤ کشی سے اُن کی دل آزاری ہوتی ہے لہٰذا ہم گائے کی قربانی کریں۔'' (ترک گاؤ کشی، خواجہ حسن نظامی، مطبوعہ دلی، ۱۹۲۰ء ص ۲۶) مولانا شاہ سلیمان پھلواری نے ''گاؤ کشی بند کر'' کے عنوان سے لکھا کہ ''میں اعلان کرتا ہوں جیسا کہ میں نے پچھلے سال (۱۹۲۰ء میں) کیا تھا کہ ہندو بھائیوں کی طرف سے کسی مطالبہ یا مداخلت سے پہلے ہی مسلمانوں کو بجائے گائے کے بکریاں اور بھیڑیں قربانی کرنی چاہیں۔'' (پیسہ اخبار لاہور، ۱۰، اگست ۱۹۲۱ء بحوالہ حاشیہ، النور، ادارہ پاکستان شناسی لاہور ۲۰۰۸ء، ص ۲۹) ''مولانا حسرت موہانی نے کٹار پور جا کر یہ کوشش کی کہ مسلمان ہندوؤں کی خاطر گائے کی قربانی ہمیشہ کیلئے ترک کر دیں...... اِس موقع پر ہندوستان کے ممتاز عالم دین اور مفتی مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ گائے کی قربانی یک قلم موقوف کر دیں۔'' (فاضل بریلوی کا سیاسی کردار، ڈاکٹر جلال الدین احمد نوری ص:۴۸) جبکہ حکیم اجمل خاں نے امرتسر میں بحیثیت صدر مسلم لیگ اپنے خطبہ میں کہا ''میں سب سے پہلے یہ مشورہ دوں گا کہ ہندوؤں کے مقدس شہروں جیسے کاشی، اجودھیا، متھرا اور

بندرابن ہیں اِس کا آغاز کیا جائے اور اِن شہروں میں جس قدر جلد ممکن ہو دوسرے جانوروں کی قربانی کو اختیار کیا جائے اور اِس کے ساتھ ساتھ دوسرے شہروں میں بھی اِس کی کوشش کی جائے۔'' (حیات اجمل، قاضی محمد عبدالغفار، ص:۲۱۶۔۲۱۴)

(۲۰) مسعود احمد، پروفیسر، تحریک آزادی ہند اور السواد اعظم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء ص:۱۲۱۔۱۲۰

(۲۱) (Gandhi's Passion,Page 21) مشمولہ گاندھی مسلمان اور پاکستان، ڈاکٹر سعید احمد ملک، ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص:۹۲

(۲۲) Mahatma Gandhi,Essays & Reflection,Page 474 & 477، مشمولہ گاندھی مسلمان اور پاکستان، ڈاکٹر سعید احمد ملک، ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن لاہور فروری ۲۰۰۸ء، ص:۹۳

(۲۳) ینگ انڈیا ٹائمز، ۱۲،اکتوبر ۱۹۲۱ء، مشمولہ ہندومت اسلام اور پاکستان، ڈاکٹر عمر حیات عاصم سیال، ندوۃ القلم اردو بازار کراچی، جنوری ۲۰۰۸ء، ص:۴۳

(۲۴) سعید احمد ملک، ڈاکٹر، گاندھی مسلمان اور پاکستان، ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص:۵۵

(۲۵) ایضاً ص:۵۴

(۲۶) اخبار ہریجن، ۲۲،دسمبر ۱۹۳۹ء، مشمولہ ہندومت اسلام اور پاکستان، ڈاکٹر عمر حیات عاصم سیال ندوۃ القلم اردو بازار کراچی، جنوری ۲۰۰۸ء، ص:۴۹

(۲۷) سعید احمد ملک، ڈاکٹر، گاندھی مسلمان اور پاکستان، ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن لاہور، فروری ۲۰۰۸ء، ص:۵۶

(۲۸) ایضاً ص:۱۳۳

(۲۹) ایضاً ص:۵۶

(۳۰) ایضاً ص:۵۶

(۳۱) خطاب مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر ۱۹۴۲ء، مشمولہ ہندومت اسلام اور پاکستان، ڈاکٹر عمر حیات عاصم سیال، ندوۃ القلم اردو بازار کراچی، جنوری ۲۰۰۸ء، ص:۴۸

(۳۲) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، الرشاد، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، ص:۱۶۔۱۵

(۳۳) ایضاً ص:۱۷۔۱۶

(۳۴) ایضاً ص:۱۸۔۱۷

(۳۵) علی ارشد، ڈاکٹر، علامہ شبیر احمد عثمانی کا تحریک پاکستان میں کردار، پاکستان سٹڈی سینٹر، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۵ء، ص:۷۷۔۶۱۔۵۰۔۳۸۔۱۱

(۳۶) اخبار ،وحدت، دہلی، شمارہ ۲۳، دسمبر ۱۹۳۷ء، ص:۴۔اخبار دبدبہ سکندری، رام پور، شمارہ ۴، نومبر ۱۹۴۵ء، مشمولہ سرزمین بہار کی دو عظیم شخصیتیں، یسٰین اختر مصباحی، ص:۱۲

(۳۷) نور محمد قادری، مولانا عبدالحامد بدایونی کی ملی و سیاسی خدمات، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۰۲ء، ص:۴۳

(۳۸) عبدالوحید خاں، مسلمانوں کا ایثار جنگ آزادی، یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنو، ۱۹۳۸ء، ص:۱۴۳۔۱۴۲

(۳۹) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، الرشاد، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، طبع جدید دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء، ص:۲۰

(۴۰) ایضاً ص:۲۰

(۴۱) ایضاً ص:۲۲۔۲۱

(۴۲) محمد اسلم، پروفیسر، تحریک پاکستان، ریاض برادرز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص:۵۷

(۴۳) اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر، علماء میدان سیاست میں، ص:۲۸۰

(۴۴) میم کمال او کے، تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)، قائداعظم اکادمی کراچی، اگست ۱۹۹۱ء ص:۲۵

(۴۵) کالم گزرا ہوا زمانہ، روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۷ جولائی ۱۹۸۷ء ص:۱۲

(۴۶) اخبار دبدبہ سکندری رامپور، ۵، ستمبر ۱۹۴۵ء ص ۶، مشمولہ ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست، محمد جلال الدین قادری، مکتبہ رضویہ لاہور، ۱۹۸۰ء ص:۴۹

(۴۷) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۴۹

(۴۸) ایضاً ص:۳۰

(۴۹) پیش لفظ، سیّد نور محمد قادری، الرشاد طبع جدید دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء، ص ہ

(۵۰) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، الرشاد، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، طبع جدید دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء، ص:۲۳۔۲۲

(۵۱) ایضاً ص:۲۴۔۲۳

(۵۲) عبدالغفار، قاضی، حیات اجمل، ص:۲۱۶۔۲۱۴، مشمولہ النور، ادارہ پاکستان شناسی، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۳۰

(۵۳) ایضاً حوالہ مذکورہ

(۵۴) سید سلیمان اشرف، پروفیسر الرّشاد، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، طبع جدید دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء، ص:۲۵۔۲۴

(۵۵) آل انڈیا مسلم لیگ کے اِس اجلاس میں حکیم محمد اجمل خاں نے اپنے خطبہ صدارت میں حضرت اُم المومنین اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کردہ ایک حدیث میں اپنی طرف سے لفظ ''بالشاۃ'' (بمعنی بکری) کا اضافہ کردیا۔ حالانکہ اصل حدیث میں یہ لفظ موجود نہیں تھا۔ انہوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ عرب میں علی العموم بکری کی قربانی کا رواج تھا۔ اِس خطبے میں حکیم صاحب نے قربانی کی مذہبی حیثیت پر بھی بحث کی اور رواداری میں ایک حدیث پاک میں تحریف تک کرگئے، مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ ''اسلام میں گائے کی بجائے بھیڑ کی قربانی افضل ہے اور یہ کہ اسلامی احکام میں گائے کی قربانی کہیں بھی صراحتاً لازم نہیں ہے۔'' (حیات اجمل، قاضی محمد عبدالغفار، ص:۲۱۵) لہٰذا پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف حکیم اجمل خاں کی اِس جسارت پر سکتے میں آگئے اور انہیں یہ یقین کرنا مشکل ہوگیا کہ یہ الفاظ حکیم صاحب جیسے ذی علم شخص کے قلم سے نکلے ہیں۔ چنانچہ آپ نے بذریعہ مراسلہ رابطہ کیا۔ حکیم صاحب کے دولت کدہ دہلی حاضر ہوکر دومرتبہ ملاقات کی کوشش کی۔ حضرات اہل علم جن کا حکیم صاحب کے ہاں آنا جانا تھا اُن کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ حدیث شریف میں جو غلطی ہوگئی ہے، اُس کی تصحیح کی طرف حکیم صاحب کی توجہ دلایئے۔ لیکن آپ کی یہ کوششیں بے اثر رہیں اور تین ماہ گزر گئے۔ سیّد صاحب کی اِن کوششوں کا جب کوئی اثر نہیں ہوا اور حکیم صاحب نے سکوت اختیار کیے رکھا تو آپ نے مسلمانوں کو اَمرِ حق سے آگاہ کرنے کیلئے ''النور'' سے پہلے رسالہ ''الرّشاد'' لکھا، جس میں واضح کیا کہ ہمارے سیاسی لیڈران قوم ہندو مسلم اتحاد کے خیال کو چمکانے اور برادران وطن کی دلنوازی کیلئے کن کن طریقوں سے آج سنت ابراہیمی کو مٹانے پر کمربستہ ہوگئے ہیں۔

(۵۶) جلال الدین نوری، ڈاکٹر، فاضل بریلوی کا سیاسی کردار، مکتبہ نوریہ نارتھ کراچی، مئی ۲۰۰۷ء ص:۴۵۔۴۴

(۵۷) ایضاً ص:۴۵

(۵۸) سید سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید

ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۳۔۱

(۵۹) ایضاً ص:۳

(۶۰) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الرّشاد، مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، طبع جدید دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء، ص:۶۴

(۶۱) ایضاً ص:۶۶۔۶۵

(۶۲) ایضاً ص:۶۷۔۶۶

(۶۳) ایضاً ص:۴۰

(۶۴) ایضاً ص:۴۲۔۴۱

(۶۵) ایضاً ص:۴۲

(۶۶) ایضاً ص:۷۲۔۷۱

(۶۷) ایضاً ص:۶۲

(۶۸) ایضاً ص:۷۲

(۶۹) ایضاً ص:۳۲

(۷۰) ترمذی شریف، جلد۲، ص:۱۴۵

باب ششم

ہندو مسلم اتحاد

ہندو مسلم اتحاد

تاریخی اعتبار سے ہندوؤں کے ملّی عروج کا نقطہ آغاز سلطنتِ مغلیہ کے زوال سے شروع ہوتا ہے۔۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوؤں نے اپنی ملّی تعمیر و تشکیل کی کوششیں تیز کر دیں۔اور اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندو، ہندو حکومت، ہندو تہذیب اور ہندو ثقافت کے خواب دیکھنے لگے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد ''تحریک آزادیٔ ہند اور السواد اعظم'' میں لکھتے ہیں کہ ہندوؤں نے ہمیشہ اپنی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور طرزِ معاشرت و ثقافت کو عزیز اور مقدم رکھا۔وہ اِس بات کے خواہشمند رہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں اِن متذکرہ عناصر کا رنگ غالب اور نمایاں رہے۔چنانچہ اُنہوں نے برِّعظیم کے باشندوں کو ہندو مذہب و تعلیمات تہذیب و تمدن اور زبان و رسم الخط اپنانے پر شدت سے زور دیا۔

ہندوؤں کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ ہندوستان کے رہنے والے اگر ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو صرف ہندو بن کر رہیں۔چنانچہ اُنہوں نے ایک ملک، ایک قوم، ایک زبان ایک تہذیب، ایک مذہب اور ایک آئین کا راگ الاپا۔اور ہندوستان کی تمام آبادی کو ہندو مذہب کی لڑی میں پیرو کر ایک ایسی قوم تشکیل دینے کیلئے سرگرم رہے جس کی بنیاد جغرافیائی حدود پر رکھی گئی ہو۔

ایک قومی وحدت کا خواب

چونکہ ہندو یہ خیال کرتے تھے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کی سرزمین ہے اور صرف وہ ہی اِس کے اصل باشندے ہیں۔اِس لیے ایک قومی وحدت پر مشتمل'' متحدہ

ہندوستان'' کا خواب ابتداء سے گانگریس کے مقاصدِ جلیلہ کا اہم اور بنیادی نقطہ رہا۔ ۲۴، اپریل ۱۹۳۵ء کو بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کانگریسی رہنماء مسٹر گاندھی کا یہ کہنا:

''ہم سرینگر سے کنہیا کماری تک اور کراچی سے لے کر ڈبروگڑھ تک جو پردیش ہے، اُسے ایک مانتے ہیں اور اُس کے لوگوں کو ایک پرجا (قوم) سمجھتے ہیں۔''(۱)

ابتدا سے انتہا تک کانگریس کی اُس بنیادی مساعی، فکروفلسفے اور ہندو ذہنیت کا عکاس ہے جس کا مقصد'' ایک قومی نظریہ'' پر مشتمل '' متحدہ ہندوستان'' کا قیام تھا۔ گاندھی سمیت تمام کانگریسی لیڈر بارہا اِس عزم کا اظہار کرتے رہے۔ اُنہوں نے کبھی بھی اپنے ارادوں اور عزائم کو مخفی نہیں رکھا۔ ہندوؤں کی جانب سے ایک قومی وحدت یا متحدہ قومیت اختیار کرنے پر اصرار دراصل جدید ہندو قومیت کی ایک دلربا شکل تھی۔ جس کی بنیاد مندرجہ ذیل چھ ستونوں پر رکھی گئی جسے بیان کرتے ہوئے پروفیسر مسعود احمد نے لکھا:

'' ایک ملک (بھارت ورش)، ایک قوم (ہندوستانی یا ہندو قوم)، ایک زبان (ہندی یا خط ناگری)، ایک تہذیب (ہندو تہذیب) ایک مذہب (ہندو یا دینِ الٰہی جیسا کوئی مذہب) اور ایک آئین (فلسفۂ گاندھی) پر رکھی گئی تھی۔''(۲)

یہ سوراج کے حصول کا وہ منصوبہ تھا جس کا مقصد برِعظیم کے مسلمانوں کو کسی بھی صورت ہندو بنا کر ہندوؤں کے کسی بھی فرقے میں ضم کرنا اور بھارت ورش کو تمام غیر ہندوؤں سے شدھ (پاک) کرکے ایک ہندو ریاست کا قیام تھا۔ یعنی سوراجیہ کا حصول، جس میں مسلمان کی بحیثیت مسلمان کوئی گنجائش نہ تھی۔ ہندوؤں کو یہ خواب پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کے بقول'' اربندو گھوش'' بنگالی نے دکھایا تھا۔(۳) جسے ہندو عملی جامہ پہنانے کیلئے سازگار فضا اور مناسب موقع کے منتظر تھے۔

۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان چلنے والی تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات کی تحریکوں

نے اُنہیں اپنے مقاصد سے قریب تر کردیا۔ یہ زمانہ ہندو مسلم سیاست کا انتہائی پُرفتن دور تھا۔ جب مسئلہ خلافت اور اَماکن مقدسہ کی حفاظت جیسے قومی وملّی مسائل نے مسلمانان ہند کے جذبات کو برانگختہ کیا ہوا تھا۔ مسلمان سخت کرب و اذیت میں مبتلا تھے۔ گاندھی نے اِن مسائل کے ابھرتے ہی موقع غنیمت جانا اور مسلمانان ہند کو کانگریسی سیاست کے ساتھ وابستہ کرنے کیلئے ہندو مسلم اتحاد اور ہمدردیٔ وطنی کا ہاتھ نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی جانب بڑھانا شروع کیا۔ انگریز مصنف فرینک مورلیس Frank Moraes اپنی کتاب '' جواہر لال نہرو'' میں گاندھی کے اِس ذہنی پس منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''مسٹر گاندھی نے مسئلہ خلافت کو اپنالیا اور ایسا کرنے سے اُنہوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے قریب تر ہونے پر مجبور کردیا......اِس عرصے کے دوران مسٹر گاندھی اپنے نظریات عدم تشدد اور عدم تعاون کی تبلیغ میں مصروف رہے۔ اُن کے انہی نظریات کا دوسرا نام ستیہ گرہ تھا۔ مسٹر گاندھی نے یہ بھی محسوس کرلیا تھا کہ مسئلہ (خلافت) ہندو مسلم اتحاد کیلئے ایک موثر ہتھیار ہے۔''(۴)

گاندھی کی مطابقت و پیروی چہ ابوالعجبی است

درحقیقت گاندھی کو مسئلہ خلافت اور اَماکن مقدسہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اِس منافقانہ طرزِ عمل سے اپنے قومی وملّی مقاصد کی تکمیل چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے تحریک خلافت اور موالات کے دوران ہندو مسلم اتحاد کو بطور ہتھیار استعمال کرتے ہوئے مسلمانوں کے جذبات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے اِس تاثر کو قائم کرنے میں کامیاب رہا کہ وہ مسلمانوں کا سچا ہمدرد و غمخوار، اُن کے حقوق و مفادات کا محافظ اور پوری ہندو قوم کے ساتھ اُن کے شانہ بشانہ کھڑا ہے۔

گاندھی مسلمانانِ ہند کو اِس غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب رہا۔ عام سادہ لوح مسلمانوں کا تو ذکر ہی کیا، بڑے بڑے نامور زعمائے ملت تک اُس کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ موہن لال بھٹناگر، ایڈیٹر، درپن، لاہور (کانگریس نمبر دسمبر ۱۹۲۲ء، جلد ۱، شمارہ

۷،صفحہ ۲۲۶) میں لکھتا ہے:

''مسلمانوں نے مہاتما گاندھی پر وہ اعتبار اور یقین دکھلایا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔''

اُس وقت کسی نے یہ بھی نہ سوچا کہ بھلا گاندھی جیسے متعصب ہندو کو خلافت اسلامیہ اور اَماکن مقدسہ سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے۔ سب کے سب ہندو مسلم اتحاد کے اثرات و مضمرات سے بے نیاز گاندھی کے ہم رکاب و ہم آواز تھے۔اور مسلمانانِ ہند کو ہندو مسلم یگانگت کے رنگ میں رنگنے پر کامیابی و کامرانی کے خوش کن خواب دکھا رہے تھے۔ چنانچہ اِس تناظر میں ''النور'' صفحہ ۹، پر سیّد سلیمان اشرف لکھتے ہیں:

''وقت آگیا اور ضرورت اِس کی عیاں ہوچکی کہ مسلمان اپنے اُس قوم ہمسایہ کی جس پر کسی عہد میں اُنہوں نے صدیوں تک حکومت کی تھی بکمال عقیدت غلامی اختیار کریں تا کہ ثمراتِ غلامی سے بدرجہ اتم واکمل بہرہ مند ہوسکیں ،اِسی نصب العین کو پیش نظر رکھتے ہوئے لیڈروں نے قوم کی رفتار دوسرے جانب موڑنے کی کوشش کی۔''

اُس وقت مسلمانانِ ہند کی قومی وملّی حالت کو بیان کرتے ہوئے چودھری سردار محمد خان لکھتے ہیں:

''مسلمان کے سامنے اب کوئی سیاسی نصب العین نہ تھا۔اُس کے سامنے کوئی منزل نہ تھی،وہ منتشر لوگوں کا ایک آوارہ گروہ تھا جو اپنی قومی وحدت کھو چکا تھا۔وہ صرف ہندوؤں کے رحم و کرم پر تھا۔ درحقیقت گاندھی جی نے ہندوؤں کیلئے وہ کام کیا جو اُن کے ہزاروں رہنما بھی نہ کرسکے،نہ صرف یہ بلکہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی مرکزیت کو فنا کروایا،مسلمان کی قومی وحدت اور ملّی تشخص پارہ پارہ ہوا،یہ وہ زمانہ ہے جہاں سے ہمارے لاتعداد بھائی کعبہ سے منہ موڑ کر سمائے واردھا کے الہامات پر یقین کرکے اسلام اور کفر کے غیر فطری امتزاج

سے رسوائے عالم متحدہ قومیت کا خمیر تیار کرتے نظر آتے ہیں۔مسلمانانِ ہند کے سب سے بڑے دانا دشمن مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی نے اُن جسد قومی میں ایسا زہر بھرا جس کا اثر ابھی تک مکمل طور پر زائل نہیں ہوسکا۔''(۵)

ہندوستانی مسلمانوں میں اپنی قومیت کے تعلق سے شکوک وشبہات،مسلمانوں میں اِس نظریہ کا فروغ پانا کہ نیشنلزم ہی صرف اُن کے تحفظ وبقا کا ضامن ہے یا یہ کہ کانگریس کے تصور وطنیت کو اپنا کر اپنے آپ کو فخریہ نیشنلسٹ مسلمان کہلانا یہ سب اُسی وقت کی یادگاریں ہیں۔معاشرتی زندگی کا یہ تضاد مسلمانوں کو عجیب وغریب صورت حال سے دوچار کر چکا تھا اور گاندھی کی عیاری کی وجہ سے مسلمانانِ ہند واضح طور پر دوحصوں میں بٹ چکے تھے۔بقول سیّد سلیمان اشرف:

''گاندھی نے کس حسن تدبر سے مسلمانوں کو اپنا اور اپنے مذہب کا غلام بنالیا(کہ)ایک برس بھی نہ گزرنے پایا ،جو حمایتِ خلافت سے نہ صرف ہندو دست کش ہوگئے بلکہ اُس کی عیارانہ چال سے خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں نے مسئلہ خلافت کو دھکے دے کر پس پشت ڈال دیا۔ خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کی جگہ گاندھی کو دے دی گئی ،اب یہ مدعیانِ اسلام اسی کی کوشش کررہے ہیں کہ جہاں تک ہوسکے گاندھی کی محبت وعظمت سے کوئی قلبِ مومن خالی نہ رہنے پائے۔''(۶)

ماہنامہ حکایت،لاہور کے مدیر اور ممتاز صحافی عنایت اللہ کے مطابق:

''قومیت کے فریب کارانہ نظریے کا خالق مہاتما گاندھی اور اُس کی صف کے دیگر ہندو لیڈر تھے۔اِن ہندو لیڈروں اور مفکروں نے مسلمانوں کا رشتہ اسلام سے توڑنے کیلئے ہندوستانی قومیت کا فلسفہ عام کیا۔اِسی کے تحت اُنہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کہا۔افسوسناک اَمر یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی اِس

نظریہ قومیت کے قائل ہو گئے، یہی وہ مسلمان زعماء، دانشور اور علماء تھے جنھوں نے مطالبہ پاکستان اور دو قومی نظریے کی مخالفت کی تھی۔ اُنہوں نے آج تک پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔"(۷)

آزاد ہندو مسلم اتحاد کے داعیٔ و علمبردار

یہ فلسفۂ گاندھی کا ساحرانہ کمال تھا کہ ابوالکلام آزاد ہندو مسلم اتحاد کو آزادی پر ترجیح اور فوقیت دے رہے تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی و علمبردار بنے کہہ رہے تھے کہ:

"اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اُتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہوکر اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے۔ تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ کیونکہ اگر سوراج کے ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔"(۸)

چنانچہ ۲۵، اگست ۱۹۲۱ کو ابوالکلام آزاد نے مجلس خلافت آگرہ اجلاس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کو وقت کی ضرورت اور اپنا عقیدہ قرار دیا اور کہا:

"اصل مسئلہ خامہ فرسائی کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کی نجات کیلئے ہندوستان میں مسلمانوں کے بہترین فرائض انجام دینے کیلئے ہندو مسلم اتحاد ضروری ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے جس کا اعلان ۱۹۱۲ء میں الہلال کے پہلے نمبر میں کر چکا ہوں۔"(۹)

آزاد نے ہندو مسلم اتحاد کو راہ عمل قرار دیتے ہوئے یہ بھی کہا:

"میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انہیں خطاب کیا تھا آج بھی میں اُسی جگہ کھڑا ہوں۔ میں اس تمام عرصے میں اُن سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی اُن سے کہتا ہوں کہ

ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کیلئے وہی ایک راہ عمل ہو سکتی جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں اُنہیں دعوت دی۔"(۱۰)

ایک اور موقع پر تو آزاد نے مسئلہ خلافت اور اماکن مقدسہ جسے اہم و بنیادی مقاصد جو تحریک خلافت کی بنیاد و اساس اور مسلمانان ہند کی تمام تر جدوجہد کا مرکز و منبع تھے، کی اہمیت سے انکار کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ ہماری:

"کوشش اور لڑائی صرف اماکن مقدسہ اور خلافت کیلئے نہیں ہے بلکہ ہندوستان کو خود مختاری حکومت دلانے کیلئے ہے۔ اگر خلافت کا خاطر خواہ فیصلہ ہو بھی جائے تاہم ہماری جدوجہد جاری رہے گی۔ اُس وقت تک کہ ہم گنگا جمنا کی مقدس زمین کو آزاد نہ کرالیں۔"(۱۱)

ہو سکتا ہے ابوالکلام آزاد کے ذہن میں "حکومت خود اختیاری اور گنگا جمنا کی مقدس زمین کو آزاد کرانے" کا مقصد کچھ اور ہو، لیکن ہندوؤں کے نزدیک اِس کا صرف اور صرف ایک ہی مطلب تھا اور وہ تھا، سوراج یعنی ہندو ریاست کا حصول۔ دوسری طرف ابوالکلام آزاد کے خیال میں صرف کانگریس ہی مطلوبہ سوراج تک پہنچنے کا ایک واحد ذریعہ تھی۔ اور آزاد مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کو سب سے بڑی اور مسلمانوں کو مشکلات سے بچانے والی ایک غیر فرقہ پرست جماعت تصور کرتے تھے۔

دراصل ابوالکلام آزاد یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانان ہند کی خیر و عافیت اسی میں ہے کہ وہ ہندوستانی قومیت اور سیکولرازم کو قبول کرلیں۔ اُن کی نظر میں کانگریس ایک غیر فرقہ پرست اور مشترکہ سیاسی و اقتصادی آزادی کی نقیب جماعت تھی۔ اِس لیے اُنہوں نے نہ صرف خود کانگریس میں شمولیت اختیار کی بلکہ گاندھی کے مطلوبہ سوراج کی راہ ہموار کرنے کیلئے مسلمانان ہند کو بھی کانگریس میں شمولیت کی دعوت دی، اور ۲۷، دسمبر ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ کے ایک جلسہ عام میں مسلمانان ہند سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

"مسلمانوں کیلئے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ غیر فرقہ وارانہ سیاسی جماعتوں (یعنی کانگریس) میں شامل ہوں جو سب کی مشترک سیاسی و

اقتصادی آزادی کی نقیب ہوں۔'' (۱۲)

دراصل متحدہ قومیت کے تصور کے فروغ کی شدید خواہش نے ابوالکلام آزاد کے مسلم برادری کے تصور پر برتری حاصل کرلی تھی۔ اب وہ ایک ایسے سیاستدان تھے جن کی فکر اور سرگرمیوں کا مرکز گاندھی کی ذات تھی۔ ممتاز مورخ سیّد نور محمد قادری اپنے مضمون ''حلقہ نظام المشائخ اور اقبال'' (مطبوعہ، اقبالیات، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، جولائی تا ستمبر ۱۹۸۳ء، جلد ۲۴، شمارہ ۲، ص:۱۹) میں لکھتے ہیں:

''مولانا آزاد کے ایک عقیدت مند اور قریبی دوست مولانا کی سیاست کا ذکر بڑے دردمندانہ انداز میں اِس طرح کرتے ہیں ''فی زمانہ کانگریس کے صدر میرے قدیم رفیق دوست مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ جن کی نسبت قوم کو یقین تھا کہ وہ آئندہ زمانے میں امام غزالی اور رازی کے پیکر میں نظر آئیں گے لیکن ہماری امید کے خلاف اب وہ مہاتما کے چیلے نظر آتے ہیں۔ حالی نے خوب کہا

کیے پے سپرد جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر''

اب آزاد گاندھی کے ایک ایسے چیلے تھے جن کے نزدیک صرف گاندھی کی اطاعت فرمانبرداری اور رہنمائی ہی کامیابی و کامرانی کی منزل سے ہمکنار کرسکتی تھی۔ چنانچہ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے (اقبال اور جدید دنیائے اسلام، ص: ۲۷۲) آزاد کے اِن خیالات کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

''آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے، اتحاد، ڈسپلن اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تیار کیا اور صرف اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کرسکتے ہیں۔''

دراصل ابوالکلام آزاد نے اپنے عالمانہ دماغ کی تمام تر صلاحیتیں ہندو مسلم اتحاد

کے تصور اور گاندھی کی اتباع و پیروی کی مذہبی بنیادوں پر تلاش میں صرف کردی تھیں۔ اُن کی تلاش کا ایک نادر اور اچھوتا نمونہ ملاحظہ کیجئے۔ کہتے ہیں:

''ایک مسلمان سیاسی جدوجہد میں کس طرح ایک ہندو کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چل سکتا ہے۔؟ قرآن ایک مسلم کو اِس بات کی اجازت دیتا ہے کہ وہ کسی عیسائی عورت سے شادی کرلے ایسی صورت میں ایک مسلم مرد یقیناً اپنی عیسائی بیوی سے محبت کے تعلق سے وابستہ ہوگا۔ اِس طرح کوئی اور رشتہ اُسے اِس رشتے سے محبوب نہ ہوگا پھر اگر قرآن مسلمانوں کو غیر مسلموں سے کسی بھی قسم کے تعلق کی اجازت نہیں دیتا تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ قرآن مسلم مردوں کو یہ اجازت دیدے کہ وہ غیر مسلم عورتوں کو اپنے گھروں کی ملکہ اور تمام اُمور کی نگران مقرر کردیں؟ اسی دلیل میں ہندو مسلم اتحاد کا راز پوشیدہ ہے۔'' (۱۳)

ایک عالم فاضل اور دانشور کی طرف سے اِس معذرت خواہانہ رویے کا اظہار یقیناً حیرت انگیز تھا۔ شریعت کی طرف سے مسلم مردوں کو دی گئی یہ اجازت کہ وہ اپنے عقیدے سے باہر کی خواتین سے شادی کرسکیں ایک محدود اجازت ہے۔ اِس اجازت کا دائرہ اہل کتاب یعنی عیسائی اور یہودی خواتین تک محدود ہے۔ قرآن پاک مشرکہ خواتین سے کسی صورت میں شادی کی اجازت نہیں دیتا۔ ہندو بلاشبہ مشرکین کے زمرے میں داخل ہیں۔ جبکہ اسلام نے کتابیہ خواتین سے شادی کی اجازت بھی بعض شرائط کے ساتھ ہی دی ہے۔

مثلاً ایسے گھرانے جس میں مرد کی فیصلہ کن حیثیت برقرار رہے گی۔ کتابیہ ماں اپنے بچوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق پرورش میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گی اور نہ ہی گھر میں حرام گوشت کا استعمال یا شراب نوشی ممکن ہوسکے گی۔ قرآن باربار صرف مومنین کو اپنا دوست بنانے کی ہدایت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ جو شخص مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بنائے گا وہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ دنیا کے کوئی بھی دو مذہب ایک دوسرے سے اِس قدر متضاد و متصادم نہیں جتنا کہ ہندو مشرکانہ عقائد اور توحید پرستانہ اسلامی عقیدہ مختلف باہم مختلف ہیں۔

مگر ہندو مسلم اتحاد کو مقصد قرار دیتے ہوئے ابوالکلام آزاد اس بات کو فراموش کر گئے کہ زندگی کے بنیادی حقائق کے بارے میں اِس قدر اختلاف رکھنے والے گروہوں کے مابین تاریخ میں کبھی اتحاد ممکن نہ ہو سکا اور نہ آئندہ اِس کا کوئی امکان ہے۔ درحقیقت آزاد اپنی ذہانت اور جودتِ طبع کے باوجود متحدہ قومیت کے اُن خوفناک نتائج کا ادراک نہ کر سکے جن کا سامنا تقسیم کے بعد آج تک بھارت میں بسنے والے مسلمان کر رہے ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ابوالکلام آزاد ہندو لیڈروں کے قریب رہ کر بھی اُن کے عزائم سے بے خبر رہے اور وہ کانگریسی ذہنیت اور ہندوؤں کی حکمت عملی کو سمجھ ہی نہ سکے۔ جس کی وجہ سے وہ زندگی بھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعاون اور دوستی کی سعیٔ لاحاصل میں مصروف رہے تاکہ برصغیر کو برطانوی استعمار سے نجات دلا سکیں مگر...... اُن کی اِس کوشش میں بر عظیم کی مسلم برادری کے صرف آقا بدلے، یعنی انگریز آقاوؤں کی جگہ ہندو استعمار نے لے لی۔

آزاد کا قوم پرستانہ روپ

چنانچہ ۳۰ ، مارچ ۱۹۶۲ ء کو ابوالاعلیٰ مودودی نے نومسلم مریم جمیلہ کے نام ایک مکتوب میں ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے متضاد پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہوئے لکھا:

''۱۹۲۰ء۔۱۹۲۱ء کے زمانے تک مولانا ابوالکلام آزاد احیائے اسلام اور تحریکِ خلافت کے پُرجوش حامیتیوں میں شامل تھے مگر اِس کے بعد مولانا اپنے اِس موقف کے متضاد قول فعل کی تکرار کرتے ہیں۔ اِس یک لخت تبدیلی پر بعض افراد کو یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی ابوالکلام ہیں۔ ایسے لوگ آنکھیں ملتے ہوئے اُنہیں دیکھتے کہ یہ وہی ابوالکلام ہیں یا کوئی بالکل نئی شخصیت! اب ابوالکلام سوفی صد ایک ہندوستانی قوم پرست کا روپ اختیار کر لیتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم کی شکل دینا چاہتا ہے۔ اب ابوالکلام بعض ہندو فلسفیوں کے پیش کردہ ''وحدت ادیان'' اور ڈارون کے نظریہ ارتقا کو پوری طرح اپنی فکر کا حصہ بنالیتے ہیں۔ ابوالکلام کے اِن افکارِ تازہ کا نقش اُن کی تفسیر قرآن میں

صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے۔'' (۱۴)

شیخ الہند داعیٔ ہندو مسلم اتحاد

دوسری طرف دارالعلوم دیوبند اور اُس کے وابستگان نے ان تحاریک کے دوران ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کا جو عملی نمونے پیش کیے وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہیں۔ گاندھی کو مہاتما کا خطاب دینے والے دیوبند کے شیخ الہند مولانا محمود حسن نے گاندھی کو تحریکِ خلافت کا فنڈ فراہم کیا تاکہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ ہموار کرنے کیلئے ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کر سکے۔

۱۹۲۰ء میں مالٹا کی اسیری سے واپسی کے بعد دیوبند کے شیخ الہند نے ملک میں سرگرم سیاسی پروگرام عدم تشدد، خلافت اور کانگریس کی پالیسی کو نہ صرف اپنایا بلکہ ہندو مسلم اتحاد، ترکِ موالات، عدم تعاون اور مغربی مصنوعات کی جگہ دیسی اشیاء کا استعمال جیسے افعال پر پورے اذعان ویقین کے ساتھ قائم بھی رہے۔ مولوی محمود حسن دیوبندی بھی ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔ چنانچہ عبدالرشید ارشد نے لکھا:

''۳، ذیقعدہ ۱۳۳۸ھ کو مولانا محمود حسن نے ترکِ موالات کی حمایت میں فتویٰ جاری کیا جس میں حضرت نے ترکِ موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی۔ اِس کے بعد یہی فتویٰ جمیعت علمائے ہند کے متفقہ فیصلہ کی صورت میں تقریباً ۵۰۰، علما کے دستخطوں سے شائع کیا گیا۔'' (۱۵)

مولوی محمود حسن دیوبندی نے انگریز سے موالات کو حرام تو قرار دیا لیکن اِس کے نتیجے میں ہونے والے ہندو مسلم اتحاد کو مشروط طور پر جائز رکھا۔ اُنہوں نے جمیعت العلمائے ہند منعقدہ دہلی کے دوسرے اجلاس کے خطبہ صدارت میں صراحت کرتے ہوئے کہا:

''اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہے جس سے ترکِ موالات فرض ہے۔ تحفظِ ملت اور تحفظِ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحق شکریہ

ہیں۔استخلاص وطن کیلئے برادران وطن سے اشتراک عمل جائز ہے مگر اِس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔"(۱۶)

شاید ایسے ہی موقع کیلئے محدث بریلوی نے یہ چبھتا ہوا سوال اٹھایا تھا کہ:

"یہ کون سا دین ہے نصاریٰ کی ادھوری سے اجتناب اور مشرکین کی پوری میں غرقاب...... چلتے پرنالے کے نیچے ٹھہرے مینہ سے بھاگ کر۔"(۱۷)

محدث بریلوی ہندو مسلم اتحاد کو قومی و سیاسی تناظر میں دیکھتے ہوئے شرعی اعتبار سے اِس کے جواز کی گنجائش محسوس نہیں کرتے تھے۔اُن کی نظر میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزی حکومت کے خلاف اقدام کرنا محض ہوشیاری و حکمت عملی پر مبنی مفادات کے حصول کیلئے دینی و شرعی اصولوں کو قربان کردینے کے مترادف تھا۔جبکہ مولوی محمود حسن دیوبندی ہندو مسلم اتحاد کو ایک پاک،مفید اور فائدہ مند مقصد تصور کرتے تھے۔اُن کے نزدیک اِس مقصد کیلئے ہندوؤں کی حمایت دراصل تائید ایزدی کی مانند تھی۔وہ ایسی حکومت کے خواہاں تھے جو ہندو اور مسلمانوں کے اشتراک سے وجود میں آئے۔چنانچہ اپنے اِن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"کچھ شبہ نہیں حق تعالیٰ شانہ‘ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول کیلئے موئید بنادیا ہے اور میں اِن دونوں قوموں (ہندو و مسلمان) کے اتفاق و اتحاد کو بہت مفید اور منتج سمجھتا ہوں۔"(۱۸)

شاعر مشرق علامہ اقبالؒ اِس انداز سیاست پر یوں ارشاد فرماتے ہیں ؎

دین ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

حسین احمد مدنی و دیگر علماء کا مذہبی وسیاسی عقیدہ

جبکہ مولوی حسین احمد مدنی کے حوالے سے ڈاکٹر رشید الوحیدی قاسمی،ماہنامہ

دار العلوم،دیو بند میں یہ تسلیم کرتے ہیں کہ:

"حضرت مدنی ہندو مسلمانوں کے درمیان فکری، سیاسی اور عملی اشتراک کو ہندوستان کی آزادی کے حصول کے لیے ضروری خیال کرتے تھے۔اُن کا سیاسی عقیدہ تھا کہ اگر ہندوستانی اقوام کے درمیان اتحاد نہیں ہوتا تو ایشیا بالخصوص ہندوستان آزادی کی برکت سے محروم رہے گا اور سامراج کا پنجہ یہاں جما رہے گا۔چنانچہ (جناب) ملک بھر میں دورہ کرکے تقریروں میں متحدہ قومیت پر پورا زور دیتے تھے۔(اور) حدیث و قرآن اور سیاسی تجربے کی بنیاد پر اِس کے حق میں دلائل کا انبار لگا دیتے تھے۔"(۱۹)

اسی طرح مفتی کفایت اللہ دہلوی نے ترکِ موالات کو مذہبی فریضہ قرار دیا،جبکہ مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مولوی احمد سعید دہلوی (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۹ء) نے اِس کی تائید کی اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۲۰) نے اِس سے پورا پورا اتفاق کیا۔(۲۱) بقول قاضی محمد عبدالغفار مسیح الملک حکیم اجمل خاں بھی:

"ہندو مسلم اتحاد کے داعی تھے۔(اور) ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر حکیم صاحب نے علما کو متوجہ کیا۔ہندو مسلم اتحاد اُن کی سیاسی زندگی کی ساری تفسیر تھی،یہی حاشیہ تھا اور یہی متن تھا۔حکیم اجمل خاں کے ذہن میں خلافت اور سوراج کا تخیل جدا جدا نہ تھا وہ اِن دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے۔اور زندگی کے آخری ایام میں بھی وہ اپنے تین مخصوص فرائض کو بدستور انجام دیتے رہے،یعنی طبیہ کالج، جامعہ ملیہ اور ہندو مسلم اتحاد۔ اِن تینوں کے متعلق اُن کی دلچسپیاں علالت میں بھی وہی تھیں جو تندرستی میں تھیں۔"(۲۲)

ایک جامع،مدلل اور حقیقت پسندانہ تجزیہ

اِس مقام پر"اقبال اور جدید دنیائے اسلام"مطبوعہ مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور،

۱۹۸۶ء، کا ایک طویل اقتباس پیش نظر ہے ، جس میں ڈاکٹر معین الدین عقیل حامیانِ متحدہ قومیت کے اِن کرداروں پر ایک جامع ، مدلل اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوئے صفحہ ۲٦۷ تا ۲۷۳، لکھتے ہیں:

''اِس مقصد کیلئے کانگریس میں ایک ''اقلیتی مجلس'' تشکیل دی گئی جس کے اہم ارکان خود کانگریس کے مسلم راہنما تھے۔ اِس مہم میں ''مجلس احرار'' اور ''جمعیت العلمائے ہند'' کو کانگریس کا شریک کار رہنے دیا۔ جمعیت العلمائے ہند نے اِس مہم میں بہت سرگرمی دکھائی اور اُس نے کانگریس کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اِس مہم کے تحت کانگریس نے مسلم لیگ کو زک پہنچانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے اور لیگ کی مخالف مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی حوصلہ افزائی کی۔ کانگریس نے اپنی سرپرستی میں ایک ''شعبۂ اسلام'' قائم کیا جس کے لکھنو اور الہ آباد میں دو دفاتر بنائے گئے۔ [مولوی محمد میاں فاروقی، الہ آباد میں اِس شعبۂ کے سربراہ تھے، جو نشر و اشاعت اور تشہیر کے متعدد منصوبوں پر کام کر رہا تھا، اُنہیں ابوالکلام آزاد کا تعاون و مشورہ حاصل رہتا تھا] یہاں سے اپنے ہم خیال مسلم علماء سے ایسا ادب وافر مقدار میں تحریر کرایا گیا جو مسلمانوں میں قومیت اور سیاست کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا کرنے کا سبب بنا۔ کانگریس نے اپنے بے پناہ وسائل استعمال کیے اور سرمایا خرچ کیا۔ [یہ اخبارات میں شائع ہوا کہ ایک پارلیمانی انتخاب میں لیگ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے اور حصہ لینے کیلئے مولانا مدنی اور احمد سعید وغیرہ نے کانگریس سے دو کروڑ روپے طلب کیے تھے۔ اسی طرح کچھ علماء کو کانگریس کی جانب سے تنخواہ اور خرچ دیئے جانے کا ذکر بھی ملتا ہے] چنانچہ اِس کے خیالات اور نظریات مقدس اور محترم ہستیوں کی زبانوں سے بھی اسی طرح ادا ہوئے جس طرح گاندھی اور

نہرو ادا کرتے تھے۔ اِس صورتحال میں سادہ لوح مسلمانوں کا ایک طبقہ فریب کی زد میں آگیا۔ ہندوستانی مسلمانوں میں اپنی قومیت کے تعلق سے شکوک وشبہات اسی وقت کی یادگاریں ہیں۔ کانگریس کو اپنے مقاصد میں اِس حد تک کامیابی ضرور ہوئی کہ علماء کا ایک طبقہ بھی اُس کے نظریات و مقاصد سے متفق ہوکر اُس کی تحریک میں شامل ہوگیا اور لاشعوری (نہیں بلکہ شعوری) طور پر ہندو قومیت کیلئے زمین ہموار کرنے لگا۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد اِس سلسلہ کے علماء میں ممتاز رہے جنھوں نے متحدہ قومیت اور وطنی قومیت کے حق میں مبسوط دلائل دیے اور قرآن حکیم سے اسناد و شواہد تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مولانا مدنی نے قومیت کی بحث میں وطن کو بنیادی اہمیت دی۔ اُن کے خیال میں قوم وطن سے بنتی ہے اور مسلمان اپنی سیاست کی بنیاد متحدہ قومیت کے نظریہ پر استوار کریں۔ [حسین احمد مدنی کا یہ بھی کہنا تھا کہ'' ہندوستان کے باشندے خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بحیثیت ہندوستانی اور متحد الوطن ہونے کے ایک قوم ہوجائیں۔ یہ ہندو ہمارے پڑوسی ہیں...... اِن کے ساتھ ہمارا خون ملا ہوا ہے۔ رشتہ اور قرابت داری ہے، یا آباء کے ساتھ یا جدات کے ساتھ۔'' دیکھئے حسین احمد مدنی کے ''ملفوظات شیخ الاسلام'' ص: ۱۰۴، اور ''متحدہ قومیت اور اسلام'' ص:۵۱] ڈاکٹر معین الدین عقیل آگے لکھتے ہیں کہ اسی طرح ''مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی قومی تاریخ میں اپنا اظہار ابتداءً جب کہ وہ ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل نہیں ہوئے تھے اتحادِ اسلامی کے پرجوش حامی کی حیثیت سے کیا تھا۔ لیکن تحریکِ خلافت کے دوران ہندو مسلم اتحاد کے عارضی منظر اور ہندوؤں اور بالخصوص گاندھی کی مصلحت آمیز شرکت اور قیادت کے زیر اثر اُن

میں بہت نمایاں تغیر واقع ہوا...... تحریکِ خلافت کے آس پاس انہوں نے اپنے خیالات تبدیل کر لیے۔ اسلامی قومیت کے تصور کو ترک کر کے ہندوستانی قومیت کے تصور کو اختیار کرلیا۔ [حفیظ ملک کے مطابق ''۱۹۲۰ء کے بعد مسلم قوم اور مولانا آزاد دونوں نے ایک دوسرے کو پہچاننا چھوڑ دیا۔''] اُس وقت سے وہ کانگریس کے فرمانبردار اور بااعتماد رکن بن گئے اور کبھی اُس کی حکمت عملیوں سے اختلاف نہیں کیا......
اب وہ ایک ایسے سیاستدان تھے جن کی فکر اور سرگرمیاں گاندھی کے اطراف گھومتی تھیں۔'' [بقول کے، کے عزیز ''وہ کانگریس میں اِس حد تک گھل مل گئے کہ ۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں یہ گمان ہوتا تھا کہ وہ آیا ہندوؤں کے علاوہ کسی اور کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔''] ڈاکٹر معین الدین عقیل مزید لکھتے ہیں ''دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل بعض دیگر علماء اور جمعیت العلمائے ہند سے تعلق رکھنے والے بیشتر علماء بھی وطنی قومیت کے موئید و حامی بنے، جمعیت العلمائے ہند کا کردار اِس ضمن میں بہت انوکھا تھا...... اِس قبیل کی دیگر جماعتوں میں جنھوں نے کانگریس کے ساتھ اِس قومی اور سیاسی تحریکوں میں شرکت کی ''مجلس احرار اسلام''، ''خدائی خدمت گار''، ''شیعہ پولیٹکل کانفرنس''، ''آزاد مسلم کانفرنس'' کے نام اہمیت رکھتے ہیں۔''

الغرض ابوالکلام آزاد، مولوی محمود حسن دیوبندی، حسین احمد مدنی، مولوی کفایت اللہ دہلوی، مولوی احمد سعید دہلوی، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جیسے بڑے اور نامور مذہبی و سیاسی رہنماء قوم کی قیادت و امامت کے فرائض انجام دینے کے بجائے ہندو مسلم اتحاد کے پرجوش حامی بنے ہوئے تھے اور گاندھی کی زیر قیادت خلافت و اَماکن مقدسہ کی حفاظت جیسے مقاصد سے بے نیاز سوراج یعنی ہندو راج کے حصول و غلبہ کیلئے سرگرداں تھے۔ افسوس کہ یہ لوگ پیغمبر اسلام ﷺ کے نمونہ زندگی کے

بجائے ''اھنسا، شانتی اور متحدہ قومیت'' کے فلسفہ کی باریکیاں گاندھی کے آئینۂ افکار میں دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اور

دامِ تزویر مکن چوں دگراں قرآن را

کی مصداق قرآن وحدیث کو دامِ تزویز بنا کر مسلمانانِ ہند کو گمراہ کر رہے تھے۔ یہ وہ فریب کاری تھی جو برعظیم کے مسلم معاشرے کے اجتماعی مفاد کو ذاتی اور انفرادی مفاد کے ماتحت لانے کیلئے کی گئی۔ وہ بھی خدا کے نام پر، مذہب کے تقدس پر اور قرآنی نصوص کی امداد سے۔ یہ وہ لغزش تھی جس کی وجۂ جواز آیاتِ قرآنی کی غلط تاویلات پر مبنی تھیں۔

حقیقت پسندانہ ہندو نقطہ نظر اور کوتاہ فہمی مسلم اندازِ فکر

حالانکہ خود ہندوؤں کے نزدیک ہندو مسلم اتحاد ایک اَمر محال اور ناقابل عمل منصوبہ تھا۔ لالہ لاجپت رائے (۱۸۶۵ء۔۱۹۲۸ء) جیسے ہندو ادیب و مورخ اور سیاستدان نے اِس ابدی حقیقت کو تسلیم کر کے اُن علمائے حق کے موقف کی تائید کی جو قومی، سیاسی، معاشرتی اور مذہبی وجوہات کی بناء پر اِس اتحاد کو فی نفسہٖ ناجائز و غلط قرار دیتے تھے۔

آیئے ذرا جمعیت علمائے ہند کے رہنماؤں کے اوپر بیان کردہ اندازِ فکر کو سامنے رکھتے ہوئے لالہ لاجپت رائے کے درج ذیل تجزیہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں جو ہندوؤں کے حقیقت پسندانہ اندازِ فکر اور مسلمان رہنماؤں کی کوتاہ فہمی کا مظہر ہے۔ لالہ لاجپت رائے کہتے ہیں کہ:

> ''ایک اور چیز جو ایک عرصے سے میرے لیے وجۂ اضطراب ہو رہی ہے وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اِس پر دعوت غور وخوض دوں، گزشتہ چھ ماہ میں، میں نے اپنے وقت کا بیشتر حصہ اسلامی تاریخ اور اسلامی قوانین کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور اِس سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ چیز یعنی ہندو مسلم اتحاد ایک اَمر محال اور ناقابل عمل شے ہے۔ وہ مسلمان رہنما جو عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہیں اگر اُن کے خلوص نیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی

میرے خیال میں اُن کا مذہب...... ہندو مسلم اتحاد کے راستہ میں ایک زبردست رکاوٹ ثابت ہوگا۔'' (۲۳)

غیض وغضب اور جوش وجنوں کا طوفان

برعظیم کی سیاسی تاریخ میں یہ تحریک کیا تھی ایک جوش وجنوں کا طوفان تھی جس نے اپنے پرائے کا امتیاز ختم کر دیا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے جوش وخروش نے سوچنے سمجھنے کی تمام راہیں مسدود کر دیں تھیں۔ غیض وغضب نے ہوش وخرد سے بیگانہ کر کے فہم وادراک چھین لیا تھا۔ ایسے میں اگر کسی نے سمجھانے اور صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کی تو اُس کی ایک نہ سنی گئی بلکہ اسلام دشمنی اور انگریزی ایجنٹ ہونے کے الزامات لگائے گئے۔ چنانچہ اُس دور کے حالات و کیفیات کو بیان کرتے ہوئے نامور مورخ اور صحافی رئیس احمد جعفری ندوی (۱۹۰۸۔۱۹۶۸ء) رقمطراز ہیں:

''تحریک خلافت ایک ہولناک طوفان کی طرح ہندوستان کے سیاسی مطلع پر نمودار ہوئی، مسلمانوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ وہ سر سے کفن باندھ کر میدان جہاد میں اتر چکے تھے، جیل جانا ایک کھیل بن گیا تھا، سینے پر گولیاں کھانا روزمرہ کا واقعہ تھا...... اِس طوفان کا رُخ جس نے موڑنا چاہا، اُس کی پگڑی سلامت نہ رہ سکی، یہ مسئلہ مسلمانوں کی موت وزیست کا مسئلہ بن گیا تھا، اُنہوں نے طے کر لیا تھا کہ جو اُن کے ساتھ ہے، اُن کا دوست ہے اور جو اُن کے ساتھ نہیں ہے وہ دشمن کے سوا کچھ نہیں ہے، جسے اُنہوں نے اپنا مخالف سمجھا اُس کا سیاسی وجود ختم کر دیا گیا، محمد علی جناح کو اُنہوں نے گوشہ نشینی پر مجبور کر دیا...... اکابر علماء صلحاء اخیار ابرار میں سے جس نے بھی اِس تحریک کی مخالفت کی اُسے مسلمانوں کے قومی پلیٹ فارم سے ہٹ جانا پڑا...... مسلمان آزادیٔ ہند کے نشے میں، ہندو مسلم اتحاد کے جوش میں اتنے بے خود ہوئے تھے کہ اُنہوں نے واقعات سے آنکھیں بند کر لی تھیں، حقائق سے منہ موڑ لیا تھا

کہ کہیں ہندو مسلم اتحاد کا آبگینہ پاش پاش نہ ہو جائے۔'' (۲۴)

جب اندھی محبت اور عقیدت کا جادو سر چڑھ جائے تو کچھ دکھائی اور سجھائی نہیں دیتا۔ یہی حال قوم اور لیڈران قوم کا تھا۔ گاندھی کی تعریف وتوصیف میں دینی حدود وقیود سے تجاویز، شعائر اسلامی سے انحراف، اعمال کفریہ پر زور اور ہندو مسلم بھائی بھائی جیسے غیر فطری گمراہ کن نعروں پر اصرار کا رویہ ہر سو عام تھا۔

رہنمائے جمعیت العلمائے ہند اور لیڈران خلافت کے نزدیک گاندھی کی قیادت جزو ایمان بنی ہوئی تھی۔ اُس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات قرآن و حدیث سے ثابت کی جا رہی تھی۔ گاندھی گیری اور اندھی عقیدت نے اثرات ومضمرات سے اِس قدر بے بہرہ اور بے نیاز کر دیا تھا کہ ایک بت پرست کافر ومشرک کی ذات پر ایمان وایقان کو نثار اور اپنے جداگانہ دینی وملّی تشخص کو ہندو قوم ومذہب میں مدغم وقربان کیا جا رہا تھا۔

اِس افسوسناک صورتحال کو سیّد سلیمان اشرف ''علمائے سُو کی ہندو پرستی'' کے زیر عنوان ''النور'' (صفحہ ۱۵۰ تا ۱۵۳) میں بیان کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

'' تمہارے دماغ علوم سے خالی، تمہارے سینے جذبات سے کورے، تمہارے قلوب دولت ایمان سے مفلس، تمہاری زبانیں گنگ اور تمہارے اقلام خشک، تم تو ایک قالب بے جان ہو جو تمہارے لیڈر کہتے ہیں تم اُسی کی محاکات کر دیتے ہو اور اُن لیڈروں کا منبع فیض سرکار گاندھی اور اُن کی ہنود پارٹی ہے۔ سلسلہ یوں ہے کہ ایک تحریک گاندھی پیش کرتے ہیں تعلیم یافتہ مسلمان اُسے لبیک کہتے ہیں، علمائے سیاسی کا جبہ وعمامہ اُسے شرعی جامہ پہناتا ہے، ان علما کی یہ مجال نہیں کہ وہ بطور خود کوئی تحریک پیش کر سکیں یا کسی تحریک کے سامنے آمنا وصدقنا کے سوا کوئی آواز بلند کرنے کی جرأت بھی کریں۔ اِن علماء کا کیا ذکر خود اُس عالم کو لیجئے جسے لیڈروں نے شیخ الہند کا لقب دے کر ایک عجیب وغریب ہستی ثابت کیا ہے، اُس کے قلم میں بھی یہ قوت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو

اُن افعالِ خبیثہ کی شناعت و معصیت بتا سکے...... قشقہ لگایا گیا علمائے سیاسی خاموش رہے، کافر کی ٹکٹی اُٹھائی گئی علمائے سیاسی خاموش رہے، کافر کا ماتم سروپا برہنہ ہو کر کیا گیا علمائے خاموش رہے، رام لچھمن پر پھولوں کا تاج رکھا گیا علمائے سیاسی خاموش رہے، گاندھی کی جے پکاری گئی گئو ماتا کی جے بلند کی گئی علمائے سیاسی خاموش رہے، حد یہ کہ گاندھی کو کہا گیا کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی نبی ہوتا علمائے سیاسی اب بھی خاموش رہے، اِس خاموشی سے شیخ الہند بھی مستثنیٰ نہ ہو سکے، اگرچہ خادمانِ اسلام تقریراً و تحریراً اُنہیں اعمالِ کفریہ پر بیدار بھی کرتے رہے لیکن پھر بھی کسی عالم سیاسی میں اتنی جرأت نہ ہوئی جو وہ چالیس اعمال و اقوال کفریہ میں سے کسی ایک کے متعلق بھی اپنے قلم کو جنبش دیتا...... حقیقت یہ ہے کہ علماء اور اُن کے متبعین جب غالب ہوتے ہیں تو عوام اگر دین کے خلاف کوئی کلمہ نکالنا چاہیے تو غالب گروہ اُن کا گلا دبا دیتا ہے لیکن جب عوام غالب ہوتے ہیں اور علماء اور متبعین مغلوب تو عالم جب کوئی بات دین کی کہنا چاہتا ہے تو غالب گروہ یعنی عوام علماء کا گلا دبا دیتے ہیں یہ وہی زمانہ ہے جس کی خبر حدیث شریف میں دی گئی ہے۔"

جذباتی اور غیر فطری اتحاد کے اثرات ونقصانات

گاندھی شاطر اور موقع شناس تھا اُس نے اِن حالات و عوامل کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنے مقصد متحدہ قومیت کے تاثر کو فروغ دینے میں کامیاب رہا۔ اُس نے نہایت چالاکی سے تحریک خلافت کو ایسے راستے پر ڈال دیا جو مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر لے جانے والا راستہ تھا۔ بات تحریکِ خلافت سے ترکِ موالات اور ہجرت تک جا پہنچی۔ اسی دوران کچھ کانگریس نواز علماء نے برعظیم کو دارالحرب قرار دے کر یہاں سے ہجرت کرنے کا فتویٰ دے دیا، جس پر ہزاروں مسلمانوں نے اپنے گھر بار اور کاروبار چھوڑ کر افغانستان کی راہ لی اور

نا قابلِ تلافی جانی و مالی نقصان اٹھایا۔

دراصل ہندو مسلم اتحاد ایک وقتی، جذباتی اور غیر فطری اتحاد تھا۔ انگریز سے نفرت نے دونوں قوموں کو عارضی طور پر اکھٹا کر دیا تھا۔ لیکن شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے جلد ہی اِس اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا۔ اُدھر فسادات میں ہزاروں مسلمانوں کے جانی نقصان سے اغماض برتنے پر کانگریس کے اراکین کی اکثریت نے اُس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

مولانا محمد علی جوہر مولانا شوکت علی اور خود قائداعظم محمد علی جناح کانگریس کی حقیقت جان کر یکے بعد دیگرے مستعفی ہو گئے۔ مگر ابوالکلام آزاد نہ صرف یہ کہ کانگریس سے وابستہ رہے بلکہ اس کے بعد بھی تقریباً دو دہائیوں تک کانگریس کے صدر رہے۔ گو مسلمانانِ ہند کی اِن تحاریک میں شرکت مذہبی جوش و خروش پر مبنی تھی جبکہ ہندو اِس میں اپنا سیاسی فائدہ تلاش کر رہے تھے جو تحریکِ خلافت کی کامیابی کی صورت میں ملنا مشکل تھا۔

چنانچہ ۴ فروری ۱۹۲۲ء کو اتر پردیش ضلع گورکھپور کے ایک گاؤں چوری چورا میں مشتعل ہجوم نے برطانوی حکومت کی ایک پولیس چوکی کو آگ لگا دی جس میں ۲۲ سپاہی جل مرے۔ گاندھی نے اِس واقعہ کو بنیاد بنا کر اُس وقت اچانک تحریک ختم کرنے کا اعلان کر کے مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا جب تمام مسلم رہنما جیل میں تھے اور تحریک کی قیادت سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ گاندھی کے اِس طرزِ عمل سے تحریک ختم ہو کر رہ گئی اور مسلمانوں کا اپنے قائدین سے اعتماد بھی اٹھ گیا۔

گویا گاندھی کی سیاسی چال نے مسلم تشخص و شناخت کو ہی اُن سے نہیں چھینا بلکہ اُن کی قیادت بھی مسلم رہنماؤں سے چھین لی۔ اُس نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنے سیاسی قد کاٹھ میں اضافہ کیا اور ہندوستان کی سیاست پر چھا گیا۔ یوں گاندھی ہندوؤں کا مہاتما (عظیم لیڈر) بن گیا جبکہ مولانا محمد علی جوہر جیسے لوگ گوشہ گم نامی میں چلے گئے۔

تحریکِ خلافت سے جنم لینے والی دیگر تحاریک بالخصوص موالات، ہجرت اور ہندو مسلم اتحاد سے مسلمانانِ ہند کو جو سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور دینی و تعلیمی نقصان پہنچا وہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی میں ہونے والی تباہی و بربادی کے بعد سب سے بڑا

نقصان تھا۔ ہندو بہت آگے نکل گئے جبکہ مسلمان ہر میدان میں پیچھے رہ گئے۔

اِس اَمر میں کوئی شبہ نہیں کہ تحریکِ خلافت ایک ایسی عوامی تحریک تھی جس کی مثال برعظیم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بظاہر یہ تحریک اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہی لیکن اِس تحریک نے ہندوستان کی سیاست اور مسلم تاریخ پر گہرے اثرات ونقوش مرتب کیے۔

محدث بریلوی اور آپ کے رفقا کا نقطہ نظر

اِس مقام پر اُس تاریخی حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جس وقت قوم پرست علماء ہندوؤں کے آلہ کار بنے ہوئے تھے، محدث بریلوی اور اُن کے رفقاء دینی فراست اور مومنانہ بصیرت کا مظاہرہ کررہے تھے۔ محدث بریلوی نے پہلے ہی قائدین تحریک اور مسلمانانِ ہند پر واضح کردیا تھا کہ اِن تحاریک سے مسلمانوں کو سوائے نقصان کے اور کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا بعد کے حالات وواقعات نے ثابت کردیا کہ محدث بریلوی کا نقطہ نظر درست تھا۔

اُس وقت علماء اور مغربی تعلیم یافتوں پر مشتمل مسلم قیادت جس ڈھنگ سے ترکوں کی مدد کے سلسلے میں کام کررہی تھی، محدث بریلوی اُس کے سخت ناقد تھے۔ اُن کی نظر میں یہ لوگ لغو سرگرمیوں میں مسلمانوں کا بے تحاشا روپیہ خرچ کررہے تھے۔

آپ نے اِن کے عزائم کو اردو محاورے ''دھوکے کی ٹٹی'' (پُرفریب صورت، مکاری اور دغابازی کا طریقہ) سے تشبیہ دیتے ہوئے ''دوام العیش، صفحہ ۶۳، مطبوعہ بریلی'' میں یوں واضح کیا:

> ''ترکوں کی حمایت تو محض دھوکے کی ٹٹی ہے اصل مقصود بغلامی ہنود وسوراج کی چکھی ہے، بڑے بڑے لیڈروں نے جس کی تصریح کردی ہے بھاری بھرکم خلافت کا نام لو عوام بھریں چندہ خوب ملے اور گنگا و جمنا کی مقدس زمینیں آزاد کرانے کا کام چلے
>
> اے پس روِ مشرکان بزمزم نرسی
>
> کیں رہ کہ تو میروی بہ گنگ وجمن ست''

یہ خیال غلط ہے کہ محدث بریلوی ترکوں کی مدد وحمایت اور مسلمانانِ ہند کی انگریزوں

کی غلامی سے آزادی کے مخالف تھے یا یہ کہ اُن کے پیش نظر مسلمانانِ ہند کی ترقی وخوشحالی اور فلاح وبہبود مقصود نہ تھی۔ ۱۹۱۳ء میں اِس سوال کے جواب میں کہ موجودہ حالات میں ہندوستانی مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ آپ نے ایک فتویٰ ''تدبیر فلاح ونجات واصلاح'' دیا جس میں مسلمانوں کے اندر داخلی اور معاشی اصلاح کا چار نکاتی خاکہ پیش کیا۔ اِس فتویٰ میں اُنہوں نے ترکوں کی مدد کا طریقہ بھی بتایا اور ترکوں کے تعلق سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے فتویٰ کے شروع میں قرآن مجید کی سورہ رعد کی آیت نمبر ۱۱ نقل کی جس کا مفہوم ہے کہ ''خدا کسی قوم کی حالت کو اُس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اندر تبدیلی (تغیر) پیدا نہ کرے۔''

آپ نے واضح کیا کہ ترک اور ہندوستانی مسلمان ایک دوسرے کے تعاون کا انتظار کرنے کے بجائے خود اپنی مدد کریں اور یہ کہ ہندوستانی مسلمان ترکوں کی اور خود اپنی مدد اُسی صورت میں کرسکتے ہیں کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ محدث بریلوی نے لکھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو وہ ممکنہ وسائل میسر نہیں ہیں کہ وہ گھر بار اور خاندان چھوڑ کر ہزاروں میل کا سفر کرکے ترک بھائیوں کے ساتھ میدان جنگ میں اُن کی مدد کریں۔ ہاں البتہ وہ صرف مال سے اُن کی مدد کرسکتے ہیں۔

محدث بریلوی کی تجویز تھی کہ اگر مسلمانوں میں سے نوکری کرنے والا ہر شخص گیارہ ماہ کی تنخواہ میں پورے سال کا گزارہ کرتے ہوئے ایک ماہ کی تنخواہ ترکوں کی مدد کیلئے دے تو بہت زیادہ پریشانی اٹھائے بغیر لاکھوں روپے اِس مد میں جمع ہوسکتے ہیں۔ (۲۵) چنانچہ اُنہوں نے یہ اپیل بھی کی کہ نوکری کرنے والے مسلمان اپنی ایک ماہ کی تنخواہ ترکوں کی مدد میں دیں۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے ترکوں کی مدد کیلئے ایک انجمن ''انصار الاسلام'' بھی قائم کی۔ جس کے اہم مقاصد میں ریاست ترکی کی مدد اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت میں تعاون دینا شامل تھا۔ انصار الاسلام میں آپ کے قریبی ساتھی مولانا محمد میاں مارہروی، مولانا ظفر الدین بہاری، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا دیدار علی الوری وغیرہ شامل تھے۔

محدث بریلوی نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور اُن کی صف میں شامل دوسرے لوگوں کے ذریعہ عوامی سطح پر کی جانے والی کوششوں کے تعلق سے اپنی ناراضگی کا بھی اظہار

کیا۔اُن کی نگاہ میں اِن حضرات کے جلسے جلوس اور انجمنوں سے مسلمانوں کا کچھ بھی بھلا نہیں ہوا یہ سب محض مال کی بربادی تھی۔(۲۶) اُنہوں نے دوسرے علماء کی یورپی ممالک کی اشیا کی بائیکاٹ کی تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ چونکہ اِن کا استعمال ہندوستانی مسلمانوں میں بہت زیادہ پھیل چکا ہے اِس لیے یہ تجویز ناقابل عمل ہے۔محدث بریلوی نے اِس کی جگہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ مسلمانوں کو خود مکتفی ہونے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ وہ برطانیہ اور ہندوؤں پر اِس بارے میں منحصر نہ رہیں۔محدث بریلوی نے برطانیہ مخالف عوامی جذبات اور ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے اِس کے حل کا چار نکاتی طریقہ بھی تجویز کیا۔

جس کا پہلا نکتہ یہ تھا کہ وہ چند اُمور جن پر حکومت کو مداخلت کا حق حاصل ہے، مسلمان اُنہیں عدالتوں میں لے جانے سے احتراز کریں۔اور اپنے مقدمات خود اپنے طور پر طے کرنے کی کوشش کریں تاکہ بے جا مقدمہ بازی میں بھاری اخراجات سے بچے رہیں۔

دوم:۔ مسلمانوں کو مسلمانوں سے ہی اپنی ضرورت کا سامان خریدنا چاہیے۔اس سے مسلمانوں کا پیسہ مسلم کمیونٹی کے اندر ہی رہے گا۔جس سے مسلم تجارت کو فروغ و استحکام حاصل ہوگا اور مسلمانوں کو خود مکتفی ہونے میں مدد ملے گی۔

سوم:۔ بمبئی ،حیدرآباد جیسے بڑے شہروں کے مسلمانوں کو مسلم عوام کیلئے سودی کاروبار سے پاک بینک قائم کرنے چاہییں۔اِس سے مسلم بینکاروں اور مسلم عوام کو خواہ تاخیر سے سہی فائدہ حاصل ہوگا۔دوسرے مسلمانوں کی جو دولت ہندو بنیوں کے ہاتھوں میں جارہی وہ مسلمانوں کے پاس رہے گی۔

چہارم:۔ مسلمانوں کو پورے طور پر دین پر کاربند ہونا چاہیے۔اُنہوں نے دین سے بہت زیادہ پہلو تہی کی ہے اور اس طرح اُن کی زندگی کا یہ شعبہ نہایت کمزور ہوکر رہ گیا ہے۔اِس لیے اُنہیں چاہیے کہ وہ علم دین حاصل کریں اور اُس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں۔(۲۷)

محدث بریلوی نے ترکی خلیفہ کی تائید وحمایت اور انگریز حکومت کی مخالفت کو ایک دوسرے کے ساتھ منسلک کرنے سے بھی انکار کردیا۔۱۹۲۰ء کے ایک فتویٰ ''دوام العیش فی

الائمة من قریش'' میں شریعت کی روشنی میں اُنہوں نے مسئلہ خلافت پر روشنی ڈالی اور خلافتی قائدین پر شدید تنقیدیں کیں۔ایک دوسرے فتویٰ ''المحجة الموتمنة فی آیة الممتحنة'' میں انہوں نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے یہ کہنے پر شدید تنقید کی کہ وہ ہندوستان کی انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد کو ایک اسلامی فریضہ تصور کرتے ہیں۔(۲۸)

محدث بریلوی کی نظر میں انگریزوں سے ملک کی آزادی کا سیاسی مقصد خلافت کے شرعی ادارے سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا تھا۔محدث بریلوی کی نظر میں خلیفہ کیلئے ضروری تھا کہ وہ قریش اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خاندان سے ہو۔انہوں نے ابوالکلام آزاد کے اِس دعوے کی تردید کی کہ مساوات اصول دین میں سے ہے۔محدث بریلوی کا یہ نقطہ نظر اُصولی اور فہم دین کے عین مطابق تھا۔

محدث بریلوی ہندو مسلم اتحاد کے شدید مخالف تھے۔۱۹۲۰ء میں آپ نے ''المحجة الموتمنة فی آیة الممتحنة'' کے نام سے ایک فتویٰ شائع کیا اور اِس نظریہ کے حق میں دلیلیں دیں کہ مسلم قیادت نے ہندوؤں اور برطانوی حکومت کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں توازن کھودیا ہے۔وہ ایک طرف برطانوی حکومت سے پورے طور پر اپنا رشتہ منقطع کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف ہندوؤں کے ساتھ قریبی تعلق قائم کرنے کی خواہاں ہے۔شریعت کی اصطلاح میں کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے مباح (انگریزی حکومت کے ساتھ تعلق) کو حرام اور حرام (ہندوؤں کے ساتھ تعلق) کو فرض قطعی قرار دے دیا ہے۔(۲۹) اِس لیے وہ جمعیت علمائے ہند کی طرف سے پیش کیے گئے عملی خاکہ سے نہ صرف دور رہے بلکہ اُس کے ہندو حامی نظریہ کے بھی سخت ناقد رہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے حامیان موالات کے موقف کی فقہی اور دینی صحت پر شبہ ظاہر کیا اور ایک طویل جواب لکھا۔محدث بریلوی کے شبہات اور خدشات کیا تھے آئیے ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''علماء میدان سیاست میں'' دیکھتے ہیں جس کے صفحہ ۳۲۸ تا ۳۲۹، پر ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اولاً انہوں نے یہ استدلال کیا کہ موالات اور معاملات ایک ہی چیز

نہیں ،اوّل الذکر کے معنی ہیں دوستی اور محبت اور موخر الذکر کے معنی ہیں کاروبار ،لین دین، تعاون اور دیگر تعلقات باہمی ۔دوستی اور محبت تو تمام مخالفین اسلام کیلئے ممنوع ہے مگر کاروباری تعلقات کا معاملہ باکل مختلف ہے۔ثانیاً یہ کہ اگر انگریزوں سے موالات غلط ہے تو یہی بات ہندوؤں کے متعلق بھی صحیح ہونی چاہیے جن سے تحریکِ خلافت کے رہنماء اِس قدر دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں کہ ہندو رہنماؤں کے پیرو ہو گئے ہیں اور اُن کی ہدایت قبول کرلی ہے...... بریلی کا مکتبہ فکر اگرچہ کسی طرح بھی انگریزوں کا دلدادہ نہیں تھا مگر ہندو ارادوں کے متعلق انہیں بہت سے شبہات تھے اور وہ اِس حقیقت کو بہت ناپسند کرتے تھے کہ مسلم قیادت اپنے آپ کو مہاتما گاندھی اور انڈین نیشنل کانگریس کا مکمل مطیع بنالے۔وہ اِس حقیقت سے اور بھی زیادہ خوف زدہ تھے کہ مسلم علمائے دین مہاتما گاندھی کے اقوال اور انڈین نیشنل کانگریس کی قراردادوں کی تائید کرنے کیلئے قرآن کی آیات اور نبی کریم ﷺ کی احادیث تلاش کریں۔"

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی موالات کے حامیوں کے اِس عمل کو کم فہمی اور غلطی سے تعبیر کرتے ہوئے اِسی کتاب کے صفحہ ۳۲۷، پر لکھتے ہیں:

"جن علماء نے ترکِ موالات کے فتوئے پر دستخط کیے انہوں ایک بڑی غلطی کی اپنے فتوے کو اُس وقت کے موجودہ حالات پر مبنی کرنے کے بجائے اُنہوں نے مقاطعوں کے ایک مستقل فرض ہونے کا اعلان کردیا۔اُنہوں نے اِس بات کو بھلا دیا کہ صورت حال بدلتی رہتی ہے اور حالات کی ہر تبدیلی نئی مطابقتوں کو ضروری بنادیتی ہے۔یہی وجہ تھی جو جمعیت علمائے ہند نے اپنا فتوی واپس لینے میں دشواری محسوس کی اگرچہ اُن سے اِس اقدام کیلئے کھلم کھلا کہا گیا، بعد میں وہ اِسے معطل کردینے پر مجبور ہوگئے۔اگر اِس فتوی کے لفظی معنی لیے جاتے اور اُن پر ایمان داری سے عمل کیا جاتا تو مسلمان مستقل تارکانِ مقالات ہوجاتے۔"

چونکہ محدث بریلوی ہندوستان کو دارالاسلام تصور کرتے تھے اِس لیے اُن کے نزدیک یہاں سے ہجرت کرنا مسلمانوں کیلئے جائز نہیں تھا۔انہوں نے دارالاسلام کے دارالحرب ہونے کی جو تین شرائط امام ابوحنیفہؒ سے مروی ہیں اُن کے اُس پہلوؤں پر خود احناف کے درمیان پائے جانے والے اختلاف رائے کو بیان کیا کہ آیا اِن تینوں شرطوں (ا:۔اسلامی قوانین کی جگہ کفار کا قانون لے لے۔۲:۔دارالاسلام دارالحرب سے متصل ہو۔۳:۔مسلمان اور اہل ذمہ کو سابقہ تحفظ حاصل نہ ہو) کی موجودگی میں دارالاسلام دارالحرب میں تبدیل ہوجاتا ہے یا صرف پہلی ہی شرط اِس کے لیے کافی ہے۔

محدث بریلوی کے مطابق پہلی شرط اِسکے لیے فیصلہ کن درجہ رکھتی ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے کیونکہ اُن کے پرسنل لاء (یعنی جمعہ وعیدین ،اذان واقامت و باجماعت نماز وغیرہا شعائر شریعت بغیر مزاحمت علی الاعلان ادا کیے جارہے ہیں۔ اِسی کے ساتھ فرائض نکاح ، رضاع ،عدت ، رجعت ، مہر، خلع ،نفقات ، حضانت ، نسب ، ہبہ، وقف ، وصیت ،شفقہ وغیرہ جیسے معاملات مسلمین بھی علماء سے فتویٰ لینا اور اسی پر عمل پر حکم کرنا انگریز حکام کیلئے ضروری ہوتا تھا) پر عمل ہورہا ہے۔اس لیے ہندوستان دارالاسلام ہے۔

اُن کے نزدیک جو لوگ اِس کے خلاف رائے رکھتے ہیں وہ دراصل ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے سود کا جواز چاہتے ہیں۔ محدث بریلوی کے مطابق ایسے لوگ ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے کے باوجود نہ جہاد اور نہ ہی ہجرت کی نیت رکھتے ہیں۔اُس زمانے میں ہندوستان کے دارالسلام ہونے کا نظریہ بہت سے علماء اور دانشوروں کے درمیان غالب تھا۔ اور مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی کے علاوہ خود دیوبندی مولوی اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ء۔۱۹۴۳ء) اور مولوی رشید احمد گنگوہی (پ ۱۸۲۹ء) بھی اِسی نظریہ کے قائل تھے۔

محدث بریلوی کا یہ بھی کہنا تھا کہ اُن کا مخالف فریق مسلم اور غیر مسلم تعلقات کی دو الگ الگ قسموں میں فرق قائم کرنے سے قاصر ہے۔ایک قسم غیر مسلموں کے ساتھ مجرد معاملات کی ہے جس کی شریعت میں عام اجازت دی گئی ہے،سوائے مرتدین کے۔دوسری قسم

موالات کی ہے جو غیر مسلموں کے ساتھ جائز نہیں ہے۔وہ صرف مسلمانوں کے ساتھ ہی جائز و مشروع ہے۔(۳۰) محدث بریلوی کے خیال میں ترکِ موالات کے حامی جس ہندو مسلم تعلقات کی وکالت کر رہے ہیں وہ محبت، دلی تعلق اور باہمی اتحاد کی قبیل سے ہے اور یہ ساری چیزیں موالات کے ضمن میں آتی ہیں۔ جو اسلام میں قطعاً حرام و ممنوع ہیں۔ دوسری طرف انگریزی حکومت کے ساتھ دنیاوی اور سماجی تعلق کو ممنوع قرار دیا جا رہا ہے حالانکہ شرعی طور پر اِس کی اجازت ہے۔

خیال رہے کہ ابوالکلام آزاد مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور محدث بریلوی کے درمیان اِس تعلق سے نقطہ نظر کا ایک نہایت اہم فرق خلافت تحریک اور اُس سے جنم لینے والے بعض دیگر موضوعات کے تعلق سے یہ بھی تھا کہ محدث بریلوی کی نظر میں ایک شرعی ہدف کے حصول کیلئے کفار کا تعاون حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ محدث بریلوی کی ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی مخالفت کی وجہ اِن حضرات کا اس تحریک میں ہندوؤں کے تعاون کا خیر مقدم تھا۔ جبکہ آپ کے نزدیک ہندو حربی کافر تھے۔ اور آپ کافر و مشرک، یہود و نصاریٰ، آتش پرست، ستارہ پرست سب ہی کو مسلمانوں کا دشمن گردانتے تھے۔ چنانچہ ایک شعر میں فرماتے ہیں۔

کافر ہر فرد و فرقہ دشمن ہمارا
مرتد مشرک یہود گبر و ترسا (۳۱)

اُن کے نزدیک ہندوؤں سے استعانت و تعاون اِس لیے مضر تھا کہ ہندو مسلمانانِ ہند دین میں محارب تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو بالفعل محارب، قاتلین، ظالمین اور کافرین قرار دیا۔ حقیقتاً بھی ایسا ہی تھا۔ ہندو مسلمانِ ہند کے دینی و جانی دشمن تھے۔ محدث بریلوی کی نگاہِ بصیرت نے اِس اَمر کو پالیا تھا۔ چنانچہ آپ نے مسلمانوں کو ہندو نفسیات و عزائم سے آگاہی دیتے ہوئے متنبہ فرمایا:

''دشمن اپنے دشمن سے تین باتیں چاہتا ہے۔ اوّل۔ اُس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو جائے۔ دوم۔ یہ نہ ہو سکے تو اُس کی جلاوطنی کہ اپنے پاس

نہ رہے۔ سوم۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو آخری درجہ اُس کی بے پری کہ عاجز بن کر رہے۔ مخالفت کے یہ درجہ اُن پر طے کر دے اور اُن کی آنکھیں نہیں کھلتیں، خیر خواہ ہی سمجھے جاتے ہیں۔''(۳۲)

یہ وہ اسباب و عوامل تھے جس کی وجہ سے محدث بریلوی نے بابانگ دہل اِن تحاریک کی شدید مخالفت کی اور مسلمانانِ ہند کو الگ رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہونے کی اپیل بھی کی۔ اِس پُر درد اپیل میں آپ کہتے ہیں:

''تبدیل احکام الرحمٰن و اختراع احکام الشیطان سے ہاتھ اٹھاؤ، مشرکین سے اتحاد توڑو، مرتدین کا ساتھ چھوڑو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا دین پاک تمہیں اپنے سائے میں لے، دنیا ملے نہ ملے، دین تو اُن کے صدقے میں ملے۔''(۳۳)

درحقیقت محدث بریلوی اور اُن کے رفقاء کا نقطہ نظر تحریک کی ابتداء سے ہی بالکل واضح اور غیر مبہم تھا۔ محدث بریلوی کو نفسِ تحریکِ خلافت سے قطعاً کوئی اختلاف نہ تھا۔ اگر اختلاف تھا تو تحریک کے طریقۂ کار اور اِس میں مذہبی، ملّی، دینی اور اسلامی معاملات میں ہندوؤں سے اخوت و دوستی اور گاندھی جیسے اسلام دشمن شخص کی قیادت و سیادت سے تھا۔ چنانچہ تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، ہجرت اور ہندو مسلم اتحاد کے دوران محدث بریلوی اور دیگر دینی و سیاسی بصیرت کے حامل علماء و صلحاء نے خلافت کمیٹی اور جمعیت علمائے ہند کے طرزِ عمل کو خالصتاً شرعی اور اسلامی نقطہ نظر سے پرکھا، شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور اُس کی بھرپور مخالفت کی۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھا:

''مگر عوامی جذبہ اِس قدر انگریز دشمن تھا کہ دوسرے نقطہ نظر نے جمعیت علمائے ہند کے متفقہ فتوئے کے برابر شہرت حاصل نہیں کی...... (اور) بعض طاقتور اور فاضل علماء کی مخالفت کے باوجود حامیانِ عدم تعاون کے موقف کو غالب تائید و حمایت حاصل ہوگئی۔ شاید ہی کسی نے اِس استدلال کی جانچ پڑتال کی ہو جو عدم تعاون کے موافق فتوے کی پشت پر تھا۔''(۳۴)

چنانچہ اِس تناظر میں غیر جانبدارانہ اور غیر متعصّبانہ اندازِ فکر واضح کرتا ہے کہ اِن اکابر علماء وصلحاء کی یہ مخالفت مسلمانانِ ہند کیلئے دینی و شرعی لحاظ سے جائزو درست اورسیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی نقطہ نظر سے بہت مفید وفائدہ مند تھیں اگر اِس پر عمل کیا جاتا۔ جبکہ اِس کے برخلاف خلافت کمیٹی اور اکابرین جمعیت علمائے ہند کا طرزِ عمل ایک ایسے سراب کی مانند تھا جس کی کوئی منزل نہ تھی۔

یہی وہ دینی وشرعی اور معروضی اسباب تھے جس کی وجہ سے محدث بریلوی نے خودکو نہ صرف اِن تحاریک سے علیحدہ رکھا، بلکہ آپ اور آپ کے خلفا مولانا حامد رضا خان (۱۸۷۵ء۔۱۹۴۳ء)، مولانا شاہ احمد مختار صدیقی میرٹھی (۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)، مولانا نعیم الدین مرادآبادی (۱۸۸۳ء۔۱۹۴۸ء)، مولانا امجد علی اعظمی (۱۸۸۲ء۔۱۹۴۸ء)، مولانا ظفر الدین بہاری (۱۹۹۰ء۔۱۹۶۲ء)، مولانا برہان الحق جبل پوری (۱۸۹۲ء۔۱۹۸۴ء)، مولانا سیّد دیدار علی شاہ (۱۸۵۶ء۔۱۹۳۵ء) اور مولانا ابوالبرکات سیّد احمد (۱۸۸۶ء۔ ۱۹۸۷ء) وغیرہ نے مسلمانانِ ہند کی فلاح و بہبود، اصلاحِ احوال اور ہندو مسلم اتحاد کے نتیجے میں پہنچنے والے نقصانات سے بچانے کیلئے فعال کردار بھی ادا کیا۔ محدث بریلوی کے اِن رفقائے خاص میں ایک نمایاں، روشن اور فعال نام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے صدر شعبۂ دینیات پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کا بھی ہے۔

سیّد سلیمان اشرف: فہم وفراست اور نباضیٔ عصر کے اوجِ کمال پر

سیّد سلیمان اشرف نے اُس دور میں مسلمانوں کی بد نظمی، بے عملی، دین و مذہب سے دوری اور قومی وملّی انحطاط کے اسباب وعوامل کی نشاندہی و اصلاح کیلئے تحاریر وتقاریر اور لیکچرز کو اصلاحِ احوال کا ذریعہ بنایا۔ اور اسلام دشمن ہندوؤں کے مکروہ عزائم و سازشوں کو البلاغ (۱۹۱۱ء)، الرشاد (۱۹۲۰ء) اور النور (۱۹۲۱ء) جیسی معرکتہ الآراء تصانیف کے ذریعہ بے نقاب کر کے ایک دیدہ ور مدبر ورہنما کا فریضہ ادا کیا۔

یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے مسلمان بے شمار معاشی، سیاسی، تمدنی، ثقافتی، مذہبی اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا انگریز کے محکوم اور ہندوؤں کی ذہنی اسیری کا شکار تھے۔ سیّد سلیمان

اشرف نے اُس دور میں اپنی مومنانہ فہم وفراست، دینی بصیرت، سیاسی بصارت اور بے مثال جرات واستقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قائدین تحریک اور مسلمانانِ ہند کو سمجھانے اور قرآن وسنت کی روشنی میں تباہی و بربادی سے بچانے کی بھرپور سعی کی۔

سیّد سلیمان اشرف کا اصل مقصدِ حیات اسلام کی سربلندی اور احیاء تھا۔ جس کی خاطر انہوں نے تن، من، دھن سے جہدِ مسلسل کی۔ وہ اسلام کے ایک ایسے سپاہی تھے جس کی زندگی کا واحد نصب العین اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی رضا وخوشنودی کا حصول ہوتا ہے۔ یہی چیز اُن کی فہم وفکر کا اصل محور ہے۔ اُن کا تمام ترلٹریچر انسانی قلب و ذہن کی تربیت، تہذیبِ نفس، اخلاقی بیداری، نظم وضبط اور کردار اور شخصیت کی تشکیل وتعمیر کی دعوتِ فکر دیتا ہے اور اِس میں جہدِ مسلسل کے ذریعے قوم میں ایک فکری وذہنی انقلاب لانے کا عزم اور پیغام نمایاں ہے۔

سیّد سلیمان اشرف کا یہ نعرہ حق ہماری قومی وملّی تاریخ کا ایک ایسا گمشدہ باب ہے جس پر برسوں تعصب، لاعلمی اور کج روی کے دبیز پردے پڑے رہے۔ اور اپنوں اور بیگانوں نے دانستہ و نادانستہ اِس سے صرف نظر کیا۔ اے کاش کہ سید صاحب کے قلب وجگر میں عشقِ الٰہی اور محبتِ رسول ﷺ کی جو آگ لگی ہوئی تھی، اُس کی تپش کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا جاتا اور اُس کی روشنی میں اپنی زندگی کا لائحہ عمل ترتیب دیا جاتا۔

چنانچہ ذیل میں، ہم سیّد سلیمان اشرف کے افکار ونظریات اور اُن کوششوں وکاوشوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کررہے جو اِس ضمن میں آپ نے انجام دیں۔

ہندو مسلم اتحاد اور سیّد سلیمان اشرف کے افکار ونظریات

اتحاد واتفاق کی اقسام وتعریف

جس وقت ابوالکلام آزاد اور جمعیت علمائے ہند کے اکابرین مسلمانانِ ہند کو کانگریس میں شامل ہونے اور ہندو مسلم اتحاد کا درس دے رہے تھے اُس وقت سیّد سلیمان اشرف اپنی کتاب ''الرشاد'' میں اِس اتحاد واتفاق کی تعریف واقسام بیان کرتے ہوئے اتحاد کے حامیوں پر واضح کررہے تھے:

اتفاق واتحاد یا عناد واختلاف کی دوقسمیں ہیں، ایک عرضی اور دوسری

ذاتی۔یعنی ایک شے جب دوسری شے کی مخالف ہوگی تو اُس کی علت یا
کوئی اَمر خارجی ہوگا یا ذاتی۔اب جس جگہ دونوں کی حقیقت اور قوام
ذات میں اتفاق ہو اور پھر دونوں میں اختلاف پایا جائے تو منشائے
اختلاف کوئی ایسا اَمر ہوگا جو حقیقت سے خارج ہے اور اُس سے عارض
ہے،اسی کو اختلاف عرضی کہتے ہیں۔ایسے دو مختلف فیہ موجود میں اتفاق کی
صورت یہ ہے کہ وہ اَمر خارج جو اُس سے عارض ہے زائل ہوجائے یا
زائل کردیا جائے۔جوں ہی اَمر خارج کا اندفاع ہوگا ذاتی اتفاق ایک کو
دوسرے سے متحد بنالے گا۔لیکن اگر دو چیزوں میں اختلاف باعتبارِ ذات
اور قوامِ حقیقت پایا جاتا ہے تو جب تک دونوں کی ذات قائم ہے اِس
اختلاف کا مٹنا ناممکن ہے۔دو متغائر فی الذات کبھی اپنی حقیقت اور لوازم میں
متحد و متفق ہو نہیں سکتے۔تضاد و تغائر ذاتی کا یہی اقتضا (تقاضہ) ہے۔ہاں
اِن دونوں کا اتحاد اگر ہوگا بھی تو منشا اُس کا ذات نہ ہوگی بلکہ کوئی اَمر
خارج از ذات ہوگا۔جب تک وہ اَمر خارج اِن دونوں میں موجود ہے
دونوں متحد و متفق ہیں اور جہاں وہ خارج ، زائل ہوا یا زائل کیا گیا پھر
ذات اپنی مقتضیات ولوازم کی طرف رجوع کرجائے گی۔'' (۳۵)

کانگریس اور مسلمان الحذر الحذر

ایک وقت وہ بھی تھا جب مسلمانانِ ہند کانگریس سے دور بھاگتے تھے۔اور اُن کے
نزدیک کانگریس کے ساتھ اتحاد واتفاق ایک اَمر محال بلکہ دن رات کے اجتماع کی مثل
تھا۔لیکن پھر وہ وقت بھی آیا جب مسلمانوں نے کانگریس اور اُس کی ہندو قیادت کو قبول کرلیا
اور اُس کی رونق بڑھانی شروع کی تو مسلمانوں کو اُن کا سابقہ طرزِ عمل یاد دلاتے ہوئے سیّد
سلیمان اشرف نے لکھا:

''مسلمانوں کا ایک وہ دور گزرا جبکہ ہندو اور مسلمان کا اتفاق مثل رات
اور دن کے اجتماع کے سمجھا جاتا تھا۔مسلمانوں کی تمام تر کوششیں اسی

میں صرف ہوئیں ہیں کہ اہل ہنود میں تغائر ذاتی ہے۔کفر واسلام ،
ایمان وشرک میں تبائن کلی ہے،کسی پہلو اور کسی حیثیت سے اتحاد کا نام
بھی لینا ناقابل عفو گناہ ہے۔اسی بناء پر کانگریس کی شرکت سے مسلمان
الحذر الحذر پکارتے رہے۔'' (۳۶)

اتحاد واتفاق کی پُرفریب تصویر

اُس وقت مسلمان کانگریس میں شرکت اور اُس کے ساتھ اتحاد سے اِس قدر خائف
ومتنفر تھے کہ اِس تصور کو بھی گناہ سمجھتے تھے۔لیکن جب کانگریس نواز علماء اور مسٹر گاندھی نے
اُنہیں اتحاد واتفاق کی پُرفریب تصویر دکھائی تو وہ ہندو قوم میں جذب ہونا شروع ہوگئے۔سیّد
سلیمان اشرف اِس منظر نامے کو ''النور'' صفحہ ۳۰، پر یوں بیان کرتے ہیں:

''یہ عجیب کشاکش کا وقت ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کیلئے تھا اگر
دونوں قومیں ایک دوسرے سے اجنبی رہتی ہیں تو مدعا فوت ہوجاتا اور
اگر ایک بڑھ کر دوسری سے اتحاد کی استدعا پیش کرتی ہے تو استدعا کے
ساتھ ہی دوسرا فریق اُس متدعی کو اپنے میں جذب کرلینا چاہتا ہے۔
انفراد میں ناکامی ومایوسی ہے اور اتحاد واجتماع میں تجاذب وادغام۔اِس
عقدہ لانیحل کو مسٹر گاندھی نے اپنے ناخن تدبیر سے ایسا سلجھایا کہ
مسلمانوں کی عقلیں الجھ گئیں......اب مضامین لکھے جاتے ہیں،کتابیں
شائع ہوتی ہیں،وعظ کہے جاتے ہیں جن کا موضوع یہ ہوتا ہے کہ کفار و
مشرکین میں جذب ہونا عین دین اسلام ہے۔''

گاندھی نواز علماء کی اِس ترغیب اور فریب کاری کا مسلمانانِ ہند پر کیا اثر ہوا۔آیئے
سیّد سلیمان اشرف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔آپ ''الرشاد'' میں لکھتے ہیں کہ پھر:

''مصیبت عظمیٰ اُن پر یہ آئی کہ اُن کے لیڈروں نے مسئلہ انجذاب کی
خوبی انہیں بتائی اور وہ غیر قوم میں جذب ہونا شروع ہوگئے۔(۳۷)

مسلم قومیت کی جداگانہ پہچان سے دستبرداری

اِس جوشِ و جنوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مذہب جو مختلف تہذیب وتمدن، رنگ ونسل اورزبان وعلاقہ کے حامل افراد کو ''لاَ اِلٰہَ اِلّا اللہ مُحَمّد رّسُولُ الله '' کی لڑی میں پیرو کر ایک اُمت واحدہ بناتا ہے اور اُنہیں تمام باطل عصبیتوں سے نکال کر'' مسلم قومیت'' کی جداگانہ پہچان عطا کرتا ہے، کے ماننے والے ہندو مسلم اتحاد کے فریب میں آکر شعائرِ اسلامی سے روگردانی کے ہی مرتکب نہ ہوئے بلکہ اپنے قومی وملّی شناخت کے اِس امتیاز کو بھی فراموش کر بیٹھے اور''سب سے پہلے ہندوستانی'' ہونے کے نعرے لگا کر اپنی جداگانہ پہچان سے انکار کرنے لگے۔

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک یہ انداز فکر انتہائی افسوسناک تھا۔اسلام اور متحدہ قومیت کی بحث میں حسین احمد مدنی اور اُن کے ہم خیال علماء کے نظریات آپ کیلئے حیرت و استعجاب کا باعث تھے کہ اب مسلمانوں کے بعض پیشوا بھی اِس کے حامی نظر آتے ہیں۔آپ اِس بات پر دکھی تھے کہ وطنیت کا نظریہ علمائے اسلام میں رواج پارہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اِس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہورہے ہیں۔

آپ سمجھتے تھے کہ کوئی قوم اپنا اصول قومیت چھوڑ کر زندہ نہیں رہ سکتی ۔موت اُسی وقت وارد ہوتی ہے جب قومیں اپنے اصولِ زندگی سے منحرف ہوجائیں۔آپ کے نزدیک مسلمانوں کی قومیت کا اصل نہ اشتراک زبان ہے، نہ اشتراک وطن۔اسلام زمان ومکاں کی قیود سے مبّرا ہے۔وطن پرستی جو قومیت کے تصور سے پیدا ہوتی ہے سراسر اسلام کے خلاف ہے۔اپنے ملّی امتیاز پر وطن پرستی کو فوقیت دینے کا دراصل یہ وہی اندازِ فکر تھا جو ماضی قریب میں پاکستان کے سابق فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف نے اپنے دورِ حکومت میں اپنایا اور ''سب سے پہلے پاکستانی'' ہونے کا نعرہ لگا کر اُس قومی وملّی تصور کی نفی کی جو پاکستان کی بنیاد واساس تھا، ہے اور ہمیشہ رہے گا۔چنانچہ سیّد سلیمان اشرف نے مسلمانوں کے اِس جوشِ جنوں اور فدویانہ انداز کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا:

''ابھی خلافت کی بنیاد بھی نہیں پڑی تھی ہندوؤں کا زبانی ترانۂ ہمدردی آپ کے کانوں تک پہنچا بھی نہیں تھا۔لیکن جوش اتحاد ہر آن آپ کو

مرکز توحید سے بعید کررہا تھا اور جذب کی کشش ہر لمحہ قوی تر ہوتی جاتی تھی ......علی الاعلان بار بار نہایت پُر زور الفاظ میں یہ اقرار کیا گیا کہ سب سے پہلے ہم ہندوستانی ہیں اُس کے بعد جو کچھ بھی ہیں سو ہیں۔ مادر وطن کا خطاب ملکِ ہند کیلئے اور فرزندِ سپوت کا لقب اپنی ذات کیلئے مسلمانوں کا تکیہ کلام بن گیا۔'' (۳۸)

رہنمایانِ قوم کا فکری مغالطہ

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف جمعیت العلماء وخلافت کے لیڈروں کی اِس غلط فہمی اور فکری مغالطہ کی نشاندہی کرتے ہیں اور ہندو مسلم اتحاد کے اصول وطریقۂ کار کو واضح کرتے ہوئے ''الرّشاد'' میں لکھتے ہیں:

''اُس وقت پھر ایک مغالطہ انہیں ہوتا ہے اور یہ ناقابل فراموش اصل اُن سے نظر انداز ہوجاتی ہے کہ اتحاد اَمر خارج میں ہونا چاہیے۔ ذاتیات میں نہ اتحاد ہوسکتا ہے، نہ ہونا چاہیے اور نہ ایسا اتحاد مفید ہے۔'' (۳۹)

متحدہ قومیت کے حامیوں کو تنبیہ

آگے چل کر آپ اِس فکری مغالطہ کے خطرناک نتائج سے نہ صرف آگاہ کرتے ہیں بلکہ متحدہ قومیت کے حامیوں کو متنبہ بھی کرتے ہیں اور انہیں اپنے قومی تشخص کی بقاء پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز کا فرق اٹھا دینا اپنی ہستی پر اپنے ہاتھوں سے تیر چلانا ہے...... اتحاد کی کوشش قومیت کا نیست ونابود کرنا ہے۔ اشتراک وامتیاز کی سرحدوں کو نمایاں رکھنا اپنی قومی ہستی کو قائم وباقی رکھنا ہے۔نیز اِس امتیاز کا کافی اور کامل لحاظ ملحوظ رکھتے ہوئے جو بنیاد اتفاق کی ڈالی جائے گی وہ بہت زیادہ مستحکم ہوگی اُس بنیاد سے جس میں امتیاز واشتراک کی باہم آمیزش کردی گئی ہے۔'' (۴۰)

ایک مثال سے وضاحت

اِس مقام پر سیّد سلیمان اشرف اِس بات کو ایک مثال سے یوں سمجھاتے ہیں کہ ایک مکان کے وارث دو حقیقی بھائی اُس میں رہتے ہیں۔ ایک پیشہ کے اعتبار سے وکیل تو دوسرا طبیب ہے۔ دونوں روزانہ اپنے معمولات انجام دیتے ہیں۔ طبیب مریضوں کو دیکھتا ہے نسخہ وعلاج تجویز کرتا ہے جبکہ وکیل ثبوتوں اور قانونی دفعات کی تطبیق کی بنیاد پر اپنے موکل کے قانونی معاملات اور کیس کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اب دونوں میں یہ طے ہوتا ہے کہ چونکہ ہم وراثت میں برابر کے شریک ہیں اِس لیے اپنے اپنے پیشہ میں بھی شراکت وبرابری کر لیتے ہیں۔ چنانچہ دونوں باہمی رضامندی سے اپنے اپنے پیشوں کو بدل لیتے ہیں۔

یوں اِس معاہدے کے بعد مریضوں کا نسخہ وعلاج وکیل صاحب کرنے لگتے ہیں اور اہلِ مقدمہ کی خبر گیری ومقدمہ کی دیکھ بھال طبیب صاحب سنبھال لیتے ہیں۔ دونوں بھائیوں کے اِس اتفاق واتحاد سے جو حالت مریض کی ہوگی اور جو نتیجہ مقدمہ کا ہوگا، وہ محتاج بیان نہیں۔ عقل وخرد کا تقاضہ یہ ہے کہ مکان کی دیکھ بھال، تزئین وآرائش اور حفاظت میں دونوں بھائیوں کی شرکت ضروری ہے، تاکہ مکان برقرار رہے اور کوئی اُس پر دعوی یا قبضہ نہ کر سکے، لیکن اپنے خصوصی معاملات اور پیشہ میں ایک دوسرے کا معاون ومشیر نہ بنا جائے کہ اِس میں دونوں کی تباہی وبربادی ہے۔

سیّد سلیمان اشرف اور ہندو مسلم اتحاد

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک شعائرِ اسلامی پر عمل پیرا ہونا دین کی حمایت اور بقاء ہی نہ تھا، بلکہ آپ کے نزدیک شعائرِ اسلامی کا تحفظ مسلم قومیت کی جداگانہ حیثیت اور امتیازی تشخص کی علامت بھی تھا۔ چنانچہ آپ ہندو مسلم اتحاد کو ایک مریض کیلئے ڈاکٹر کے بجائے وکیل کا تجویز کردہ ایسا نسخہ قرار دیتے ہیں جو مریض کے مرض میں افاقہ کے بجائے مزید اضافہ کا سبب بنتا ہے۔

چنانچہ آپ مندرجہ بالا تمثیل کے ذریعے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہیں اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان موالات اور معاملات کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہی حال ملک ہندوستان اور قوم ہنود اور قوم مسلم کا ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جس میں ہنود اور مسلم دونوں برابر کے شریک ہیں۔ ایسے سارے معاملات جن کا ہند کی صلاح وفلاح سے تعلق ہے اُس میں دونوں کو متفق اللسان وہم زبان ہونا چاہیے۔ مدافعتِ آفات میں دونوں قوموں کے بازو بلا امتیاز قومیت ہمدردانہ ومساویانہ معاضدت سے ساعی ہوں۔ لیکن خصوصیات مذہبی میں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور بے تعلق رہنا ہی اولیٰ ہے۔ شادی غمی، صحت ومرض، تعزیت وعیادت اور ازیں قبل دیگر ضروریات زندگی میں ایک دوسرے کے مونس وغمگسار، ہمدرد وبہی خواہ رہیں۔ مگر مذہبی اُمور میں ہنود مسلم کے مشیر اور شریک نہ ہوں، نہ ہنود کے مذہب میں مسلمان دخل دیں۔ اگر اِس میں بھی اتحاد کی کوشش ہوئی تو وہی نتیجہ آئے گا جو وکیل کی نسخہ نویسی سے مریض کو اٹھانا پڑا۔" (۴۱)

پائیدار اور مستحکم اتحاد کا لائحہ عمل

اسلام دنیا کا وہ واحد دین ہے جو سب سے زیادہ کشادگی اور وسعتِ قلبی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جو غیر مسلم اور محکوم رعایا کے حقوق اور مذہبی آزادی کا پورا پورا خیال رکھتا ہے اور اُنہیں تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے جو اسلامی حکومت میں غیر مسلم رعایا پر اپنے مذہب اور مذہبی رسومات کی ادائیگی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

بشرطیکہ وہ اپنے مذہبی ارکان کی ادائیگی میں دوسروں کے مذہبی عقائد ونظریات اور جذبات واحساسات کا خیال رکھیں اور ایسی حرکات وسکنات سے گریز کریں جس سے کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں کی مذہبی تعلیمات کی توہین اور دل آزاری ہوتی ہے۔ دین اسلام کسی دوسرے مذہب کے ماننے والے پر زور وزبردستی کا بھی قائل نہیں ہے اور نہ ہی کسی اور کو اِس بات کی اجازت دیتا ہے وہ اپنے مذہبی عقائد ونظریات اہل اسلام پر مسلط کریں۔

چنانچہ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف اِس کلیہ کو بیان کرنے کے بعد حقیقی ومستحکم اتحاد کا

لائحہ عمل دیتے ہیں جس پر پُرامن بقائے باہمی کے اصول کے تحت عملدرآمد ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کیلئے بہت فائدہ مند تھا۔ آیئے ذیل میں اِس لائحہ عمل پر نظر ڈالتے ہیں جس میں سیّد سلیمان اشرف لکھتے ہیں:

"ایسی صورت میں جبکہ بحیثیت مساوی کسی زمین پر ہندو اور مسلمان آباد ہوں تو ازروئے مذہب اُنہیں کیا حق حاصل ہے کہ سلطنت غیر میں ہندوؤں کو مذہبی اُمور سے بزور زبردستی مانع آئیں۔ اہل ہنود ہولی منائیں، رام لیلا نکالیں، گنیش اٹھائیں، جو کچھ اُن کا مذہب اُن سے چاہتا ہے یا جسے وہ مذہبی رسم کہہ کر ادا کرتے ہیں نہایت اطمینان اور سکون سے انجام دیں۔ ہاں مذہب کو مسلمانوں کے چڑھانے اور چھیڑنے کا ذریعہ نہ بنائیں، نہ اِس طرح اُن مراسم کو ادا کریں جس سے مسلمانوں کی مذہبی توہین ہوتی ہو۔ اسی طرح مسلمان جب اپنا مذہبی رکن ادا کریں تو ایسی حالات وحرکات سے پرہیز کریں جو ہندوؤں کے اشتعالِ طبع کا موجب ہوں۔ مسلمان اور ہندو دونوں فریق سچائی اور راست بازی سے قانونِ مراعات کا لحاظ و پاس رکھیں، ایک فریق کی تعمیل احکام مذہبی سے دوسرے فریق کی اشتعال انگیزی اور توہین نہ ہونے پائے...... فریقین کے جہلا میں سے اگر کوئی حرکت نا سزا کا مرتکب ہو تو بجائے اِس کے کہ فتنہ وفساد سے اُسے جواب دیا جائے فریقین کے سربرآوردہ اشخاص واقعی و حقیقی حالات کی تحقیق کریں اور اُس جہالت کرنے والے کو کافی سزا دیں۔ کچھ دنوں اگر یہی طرزِ عمل اور طریق معاشرت جاری رہے گی تو باہمی منافرت بہت کچھ مٹ کر یک جہتی کا رنگ اختیار کرلے گی۔ مذہبی تعصبات سے اہل ہنود کا الگ ہو کر ملکی حقوق میں مساوی اختیارات مسلمانوں کو دینا طریق عمل میں انصاف ومساوات کی رعایت رکھنا اِس رنگ کو پختہ اور سلسلہ کو پائیدار

بنادے گا۔" (۴۲)

نثاریٔ دین وملت پھر بھی تہی دامنی

لیکن قوم اور رہبران قوم نے اِس طریقہ کار کو قابل عمل سمجھ کر اختیار کرنے کے بجائے اہل ہنود سے محبت واتحاد اور اطاعت وفرمانبرداری کا ایسا فدویانہ ثبوت دیا کہ خود اپنے ہاتھوں اپنے شعائر دین وملت تک کو قربان کردیا۔ چنانچہ اِس کی منظرکشی کرتے ہوئے "النور" صفحہ ۲۳، پر سیّد سلیمان اشرف لکھتے ہیں:

"مسلمان لیڈر کانگریس اور لیڈران کانگریس میں مدغم ہوجانے کیلئے ہر طرح کی سعی کرتے رہے یہاں تک کہ رولٹ بل کا وقت آیا اور ستیا گرہ کی ایجاد ہوئی اُس وقت عجیب عجیب طرح سے مسلمانوں نے دین کی توہین کی تاکہ اہل ہنود کو یہ یقین ہوجائے کہ تمہاری اطاعت کے سامنے مذہب کی اطاعت یوں قربان کی جاسکتی ہے۔"

مگر مسلمانوں کی جانب سے شعائر دینی وملّی کی اتنی بڑی قربانی کے باوجود سوائے تہی دامنی کے جب ہاتھ کچھ نہ آیا تو سیّد سلیمان اشرف نے اُس اَمر پر سخت افسوس اور دلی تاسف کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"مسلمانوں نے اتحاد کی صورت جو اختیار کی ہے وہ محض ناپائیدار اور طمع ہے، نیز اسی کے ساتھ مذہب کی رہی سہی عظمت مسلمانوں کی اولادوں نے اپنے ہاتھوں سے مٹادی...... جو کچھ پونجی تھی اُس کا ایک کثیر حصہ ستیا گرہ کے موقعہ پر پہلے ہی نثار ہوچکا تھا جو رہ گیا تھا وہ پہلی ہڑتال ۱۷، دسمبر ۱۹۱۹ء کے شریک ہونے پر پیشکش کردیا، اب ایک نام اسلام رہ گیا ہے، کاش کہ یہ محقر ہدیہ ہمارے ملکی بھائی قبول کرلیتے تو خوب ہوتا۔ یہ کیسی مصیبت ہے کہ مسلمان کسی قوم کی طرف حصول مقصد کیلئے قدم بڑھاتے ہیں لیکن مقصد میں کامیاب ہونے سے پیشتر دین وملت کو اُس قوم پر فدا کردیتے ہیں، پھر جو اپنا دامن دیکھتے ہیں تو مقصد و

مطلب سے ویسا ہی خالی پاتے ہیں جیسا کہ پہلے تھا۔"(۴۳)

لمحوں میں برسوں کا سفر

تاریخی عوامل اِس امر پر شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے اِس اتحاد کیلئے اپنے آپ کو من کل الوجوہ ہندو لیڈروں کے سپرد کردیا تھا۔رولٹ بل اور ستیا گرہ کے موقعہ پر مسلمان ہندوؤں کے دوش بدوش رہے اور ہر ممکن قربانی دے کر ثابت کیا کہ وہ کسی طور بھی ہندوؤں سے پیچھے نہیں ہیں۔مسلمانوں کا کانگریس کی طرف بڑھایا ہوا قدم خالصتاً نیک نیتی اور اخلاص وایثار پر مبنی اور اُن کا یہ جوش اتحاد و یکجہتی کا آئینہ تھا۔مگر اِس اتحاد اور کانگریس کے ساتھ متفق ہونے کا سو فیصد فائدہ مسلمانوں کے بجائے کانگریس نے اٹھایا اور وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئی۔سیّد سلیمان اشرف نے اِس تلخ حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

"ہندوستان کے ساتھ جو خصوصیاتِ ملّی اور وطنی کہ اہلِ ہنود کو حاصل ہیں اُنہیں پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اِس اتفاق واتحاد سے کانگریس نے عملاً اپنی مذہبی دیار اور مقدس آثار کو اُس ذرۂ کمال تک پہنچادیا جہاں اُسے برسوں میں پہنچنا ایک خوابِ خوشگوار تھا۔"(۴۴)

سیّد سلیمان اشرف مسلمان لیڈروں کی توجہ اِس جانب بھی مبذول کراتے ہیں کہ اُن کے لیڈروں نے کس طرح اپنے طرزِ عمل سے کانگریس جو کہ پہلے ایک جسم بے جان کی مانند تھی، اہلِ ہنود کو تحریک خلافت میں شامل کرکے کانگریس میں جان ڈال دی، اور مسلمانوں کے مذہبی ولولے نے کانگریس کی عدم تعاون کی تحریک کو اتنی قوت دی کہ کانگریس نے ایک سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو وہ چالیس سال میں بھی نہیں کرسکتی تھی۔

چنانچہ مذکورہ صورتحال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے "النور" صفحہ ۴۷۔۴۸، پر لکھتے ہیں:

"فرزندانِ اسلام!......ہندوؤں نے تمہارے لیڈروں کے ساتھ ہاں میں ہاں ملاکر کس سہولت ونرمی سے آہستہ آہستہ اُنہیں اپنے نقطۂ خیال پر اُتار لیا، لفظ سوراج جس سے لاکھوں کان آج تک نا آشنا تھے،

خلافت کے عوض کس جوش سے وہ ہر زبان پر جاری ہے، گاندھی جس کا نام پانچ برس قبل ہندوستان کے کسی مسلمان کے علم میں بھی نہ تھا، خلیفۃ المسلمین کی جگہ آج اُس کے تقدس وعظمت کے فسانے کس کمال عقیدت سے مستورات تک میں کہے جاتے ہیں۔" آج "عوام اور سطحی نظر رکھنے والوں کو یہ نظر آیا کہ دین کی خدمت ہمارے لیڈر بڑی جانبازی وسرفروشی سے کررہے ہیں لیکن تعمق نظر سے جب تحریکات پر کسی نے نظر ڈالی تو اُسے صاف معلوم ہوگیا کہ ہندوؤں کے چبائے ہوئے نوالے ہیں جسے ہمارے لیڈر منہ میں پھیر رہے ہیں۔وہی سودیشی جس کی ایجاد کو بیس پچیس برس ہوئے، وہی بندے ماترم بایں الفاظ کہ ہندو مسلمان کی جے، وہی بائیکاٹِ یورپ، وہی ہڑتال۔یہ سب تجویزیں بخطِ مستقیم صلاح وفلاح ملک سے متعلق ہیں اور اِن سب کی ایجاد کا سہرہ ہندوؤں کے سر ہے جو ہندوستان کو اپنا ملک کہتے اور سمجھتے ہیں......ہر وہ ایجاد اور ہر وہ تحریک جو کسی قوم کی ہو جب اُسے دوسری قوم اختیار کرے تو یہ اُس ایجاد کی انتہائی کامیابی ہے۔پس یہ ساری تحریکیں ہندوؤں نے اپنے ملک کیلئے (شروع) کی تھیں جنھیں مسلمانوں نے اختیار کرکے اُن کی کامیابی پر مہر لگادی۔"(۴۵)

ہند، ہندو اور مسلمان

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اہلِ ہنود کو ہندوستان کے باشندے ہونے کی ہی خصوصیت اور نسبت حاصل نہیں بلکہ اُنہیں سب سے بڑی انفرادیت یہ بھی حاصل ہے کہ اُن کے مذہب کا تعلق اِسی سرزمین سے ہے۔مذہبی حیثیت میں اُن کا کسی گوشہ عالم سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ اُن کے مذہبی مقامات، یادگاریں، مذہبی پیشواؤں سمیت سارا کا سارا سرمایہ اِسی خاکِ ہند میں موجود ہے۔لہٰذا مسلمانوں سے اتحاد واتفاق کے نتیجے میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی فائدے کا ہندوؤں کو پہنچنا ایک لازمی اَمر تھا۔سیّد سلیمان

اشرف اِس حقیقت کا فہم و ادراک رکھتے تھے۔ چنانچہ آپ نے مسلمانانِ ہند اور رہبرانِ قوم کو ہندو مسلم اتحاد کے اثرات اور نقصانات سے آگاہی دیتے ہوئے لکھا:

"فلاحِ ہند میں اگر بہ نظرِ انصاف دیکھا جائے تو ہندوؤں کا نہ صرف معاشرتی اور تمدنی فائدہ ہے بلکہ مذہبی حیثیت سے ایسی اہم خدمت دینی اور سعادت مذہبی کا ہندوؤں کو ملنا ہے جس کا عوض اور بدل کچھ اور متصور بھی نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کا جان و مال سے عملاً اہلِ ہنود کا شریک ہوجانا اور اُن کے پہلو بہ پہلو موت کا پیالہ پینا کیا تشکر و امتنان کا مستحق نہیں۔ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل اُن کے مقدس مقامات کیلئے جان تک دے چکے ہیں اب اگر چند سربرآوردہ ہندو صرف زبانی شرکت مسلمانوں کے مقدس مقامات کے متعلق کرتے ہیں تو یہ عِوض ازروئے انصاف بہت ہی کم ہے۔ مسلمان لیڈر کیوں مسلمانوں کو اِس قدر ذلیل اور اُن کے خون کو رائیگاں بتانے کیلئے سرگرم ہیں۔" (۴۶)

جانِ مسلم کی قدر و قیمت

اِس مقام پر سیّد سلیمان اشرف رہبرانِ قوم کو ایک مسلمان کی جان کی اہمیت اور اُس کی قدر و قیمت سے بھی آگاہی دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد اور ستیہ گری جیسی تحریکوں میں مسلم جانوں کے قیمتی زیاں پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک مسلم کی جان جو قیمت رکھتی ہے، اُس کا اندازہ صرف اِس سے کیا جاسکتا ہے کہ خود اُن کے پیدا کرنے والے نے جب اُن کی جانوں کو طلب کیا تو اُس کا معاوضہ جنت سے کم اُس مالک الملک احکم الحاکمین کی جناب سے بھی نہ قرار پایا...... ایسی قیمتی جانیں جب ستیہ گرہ کے موقعہ پر قربان کی جاچکی ہیں تو کیا اُن کا صحیح عیوض صرف زبانی ہمدردی ہے۔ صد افسوس مسلمانوں کی بدبختی اور کسمپرسی کہ اُن کی جانوں کی تو قدر نہ کی جائے اور چند ہندوؤں کی زبانی ہمدردی پر مسلمان شعارِ توحید

اور شعارِ اسلام قربان کردیں۔" (۴۷)

اغیار کے افکار و تخیل کی گدائی
کیا تجھ کو نہیں اپنی خودی تک بھی رسائی

حصولِ قوت، فلاح و بقا کا لائحہ عمل

چونکہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں تعداد میں زیادہ اور تعلیمی و مالی طور پر مضبوط و مستحکم تھے دوسرے یہ کہ رام راجیہ کے تصور کو حقیقت کا روپ دینا اُن کا اہم اور بنیادی مقصد تھا۔ لہٰذا ہندوؤں نے اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد کا جھانسہ دے کر استعمال کیا۔ سیّد سلیمان اشرف مسلمانانِ ہند کو طاقت و قوت کے حصول اور اپنے آپ کو مضبوط بنانے کا احساس دلاتے ہوئے ہندوؤں کی عیاری اور فریب کاری کو یوں عیاں کرتے ہیں :

"کسی قوت بخش آلہ کا ہاتھ میں آجانا اِس کا مقتضی نہیں کہ اپنے دست و بازو کمزور و معطل کردیئے جائیں۔ بلکہ بہ نسبت سابق زیادہ قوت اپنے ہاتھ میں پیدا کرنا چاہیے تا کہ اُس آلہ کا صحیح استعمال کیا جاسکے ورنہ اُس آلہ سے دشمن کا حربہ کارگر ہوجائے گا یا بے طاقتی ضرورت کے وقت اُس آلہ کے فوائد سے محروم رکھے گی۔ لہٰذا ہنود اگر مسلمانوں سے متفق ہوئے ہیں تو مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے کو اب زیادہ مضبوط بنانا چاہیے تا کہ قوم ہنود کا اتفاق اُن کیلئے مفید ہوسکے ورنہ اسی طرح اُن کے آغوشِ شفقت میں دو برس اور لوٹتے اور کھیلتے رہے تو اُس کا بہت ہی برا نتیجہ آئے گا۔ مسٹر کھاپرڈے جیسے ہنود کا طرزِ عمل بتارہا ہے کہ اِس وقت مسئلہ خلافت میں اہلِ ہنود کا زبانی شریک ہونا سعدی کے اِس مقولے کو یاد دلاتا ہے کہ

"سرِ مار بدستِ دشمن بکوب کہ از احدی الحسنیین خالی نباشد"
یعنی سانپ کا سر دشمن کے ہاتھوں سے کچلو اس لیے کہ دو خوبیوں میں

ایک تمہیں ضرور حاصل ہوگی۔ اگر سانپ مرگیا تو ایک موذی سے تمہیں نجات مل جائے گی اور اگر سانپ غالب آ گیا اور دشمن کو کاٹ کھایا تو تم دشمن سے چھوٹ گئے۔ کہا جاسکتا ہے کہ بعض صنادید ہندو لیڈروں کا مسئلہ خلافت میں مسلمانوں کا ہم زبان ہونا نہ بربناء ہمدردی وخیر خواہی ہے بلکہ برٹش سلطنت اور مسلمانوں کے مابین منافرت اور اُس منافرت کی لوازم سے اپنا فائدہ حاصل کرنا ہے۔'' (۴۸)

ساتھ ہی آپ ایک مسلمان کی کسی غیر مسلم سے دوستی اور اُسے اپنے معاملات میں شریک وراز دار بنانے کے حوالے سے قرآن مجید میں ربّ تعالیٰ کا بیان کردہ حکم یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ'' سچ فرمایا مولیٰ تبارک تعالیٰ نے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ. (سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۸)

یعنی اے ایمان والو! غیر مذہب والوں کو اپنا راز دار اور دلی دوست نہ بناؤ یہ تمہاری خرابی میں کچھ اٹھا نہیں رکھتے، دوست رکھتے ہیں ایسی چیزوں کو جو تمہیں مشققت ومصیبت میں ڈال دے، بغض کی باتیں تو اُن کے منہ سے نکلی ہی پڑتی ہیں اور جو کچھ اُن کے دل چھپائے ہوئے ہیں وہ تو بہت ہی بڑی ہیں۔ ہم نے کھول کر تمہارے نفع کی نشانیاں بیان کردیں اگر تم عقل سے کام لو۔'' (۴۹)

مسلمان مسلمان نہ رہیں، اتحاد کا اصل مقصد

جب ہندو مسلم اتحاد کے نام پر مسلمانوں کے دینی تشخص اور وحدتِ ملّی کو ہندو مذہب میں مدغم کرنے کی ناپاک کوششیں کی گئیں اور علمائے حق کے بروقت انتباہ کے باوجود صرف نظر کیا گیا تو سیّد سلیمان اشرف نے ایک مرتبہ پھر اپنے فرض منصبی کو ادا کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کا مقصد ومدعا اُنہیں سمجھایا۔ آپ نے لکھا:

''(اے) فدائیانِ وطن! مسلم اور ہنود کے اتفاق واتحاد کا مقصد تو یہ تھا کہ اغراضِ سیاسی وملکی میں دونوں قومیں یک زبان ہوکر مطالبہ پیش کریں اور دونوں ہاتھ ایک بن کر انتظامات میں شریک ہوں۔ اِس اتحاد کا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا اور نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان مسلمان نہ رہیں۔'' (۵۰)

مذہبِ ممزوج ودین مرکب نہ ایجاد کریں

اِس مقام پر سیّد سلیمان اشرف دین اور دینی تعلیمات کو دنیاوی ترقی وخوشحالی میں رکاوٹ اور سنگِ راہ سمجھنے والوں سے بالخصوص مخاطب ہوتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اگر اِس صدی کے مسلمانوں کے نزدیک اُن کا دین اُن کی شاہراہ ترقی میں سنگِ راہ ہے تو اُنہیں اِس کا اختیار ہے کہ اِس صراطِ مستقیم اور اِس دین قویم سے اپنے کو علیحدہ کرلیں اور جو مذہب اُنہیں دنیاوی متمعات سے مالا مال کردے اُسے اختیار کرلیں۔ لیکن اِس کا اُنہیں اختیار نہیں کہ اپنے کو مسلم اور مومن کہہ کر قوانین ایمان اور شریعت اسلام میں اصلاحیں دیں اور مذہبِ ممزوج اور ایک دین مرکب ایجاد کریں۔'' (۵۱)

خوابیدہ ذہن وضمیر سے چند سوالات

آپ حدود اللہ سے متجاوز طرزِ عمل اختیار کرنے اور اہل ہنود سے ہمدردی ومدد کے طالب ہونے پر قوم اور لیڈران قوم کے ذہن اور خوابیدہ ضمیر کو جگانے کیلئے اُن سے سوال کرتے ہیں:

''(اے) برادران اسلام! کیا اِس موجودہ ہنگامہ اضطرار میں آپ اُس مرکز خصوصی سے متجاوز نہیں ہوگئے۔؟ کیا اِس بے چینی میں آپ نے اہل ہنود کا اِس طرح دامن نہیں پکڑا جس سے آپ کا مذہب آپ سے فریادی ہوگیا۔؟ کیا اِس اتفاق واتحاد میں وہ اصول حکیمانہ جس سے اتحاد کی جڑیں فی الحقیقت مضبوط ہوجاتی آپ سے نظر انداز نہیں ہوگیا۔؟'' (۵۲)

دشمنان اسلام سے دوستی کا حکم شرعی

سیّد سلیمان اشرف غیر مسلموں سے ایسے تعلقات اور دوستی جس سے اسلام اور غیر اسلام کا فرق مٹ ہو جائے اور اِن تعلقات و دوستی کے نتیجے میں دین کو نقصان عظیم پہنچے اور ادیان باطلہ کو فروغ حاصل ہو، کا حکم شرعی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مذہب اسلام نے اپنے متبعین کو یہ ہدایت فرمائی کہ تمہارا غیر مسلم قوم سے کسی حال میں بھی ایسا میل جول نہ ہونا چاہیے جس سے فرق اسلام وغیر اسلام مٹ جائے۔ ایسا تعلق خواہ تمہارے معاملات (یعنی اعمال اعضا وجوارح) کا پایا جائے یا معتقدات (یعنی تصدیقات قلبیہ) کا شریعت کے نزدیک جرم عظیم ہے...... اگر کسی فرد مسلم یا جماعت مسلم کا کسی غیر مسلم سے قرب من حیث دین یا اعتقاد پایا جائے گا تو یقیناً اُس کا شمار اُسی گروہ میں ہوگا جس کے دین و اعتقاد سے یہ نزدیک ہوا۔ اِسی طرح صداقت، سچی دوستی اور دلی محبت کا نام ہے، دو شخص باہم صدیق یعنی سچے دوست صحیح معنوں میں اُسی وقت کہے جائیں گے جب کہ احکام اثنیت اور دوئی بالکلیہ اُٹھ جائیں۔ شریعت محمدی نے اپنے پیروی کرنے والوں کو ایک غیر مسلم قوم سے صداقت وروداد پیدا کرنے یا باقی رکھنے سے منع کیا۔ وہ دل جس میں اللہ اور اُس کے رسول برحق کی محبت ہو اُس میں ایسے اشخاص یا اقوام کی کہاں سمائی ہوسکتی ہے جو اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن ہوں...... ایسا کام یا ایسا فعل جس سے ادیان باطلہ کا فروغ ہوتا ہو یا اپنے دین و مذہب کو نقصان پہنچتا ہو ناروا و ناجائز ہے اور اِسے موالات فی العمل کہیں گے، ایسی نصرت و مدد غیر مسلم سے لینا یا غیر مسلم کو پہنچانا جس سے اُس کے مذہب کی تقویت ہو یا اپنے دین پر گزند آئے شریعت میں گناہ کبیرہ ہے۔'' (۵۳)

علمائے سیاسی، تقلیدِ کفار اور وعیدِ حدیث

اِس مقام پر سیّد سلیمان اشرف تقلیدِ کفار اور معاشرتی، تمدنی اور دینی اُمور میں اہل

اسلام کے کفار سے تعلقات کے ضمن میں ماضی اور حال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے اِس بات پر شدید دکھ کا اظہار کرتے ہیں کہ ہندوؤں سے محبت اور دوستی میں مسلمانان ہند نے اپنی قومی طاقت اور قوت تک فنا کردی ہے۔ آپ اِس بات پر بھی کبیدہ خاطر ہوتے ہیں کہ واعظین کلمہ کفر بکیں اور سامعین خوشی سے بھنگڑے ڈالیں جبکہ علماء اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے بجائے خاموشی سے کام لے کر اِس غیر شرعی فعل کی تائید و توثیق کریں۔ ایسے علماء کو سیّد سلیمان اشرف ''علمائے سیاسی'' کے خطاب سے نوازتے ہیں اور ان سے متعلق حدیث مبارکہ میں بیان کی گئی پیشین گوئی وعید سناتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلام نے اپنے متبعین کو کفار سے بیگانگی کا حکم اِس تاکید و مبالغہ سے دیا تھا کہ معاشرتی اُمور میں بھی یہ ہدایت کی گئی تھی کہ کفار کی تقلید اس میں بھی نہ ہونے پائے۔ وضع لباس، شکل وصورت، مآکل ومشارب، سلام وتحیۃ، تعزیۃ وتہنیت غرض جملہ شعبہائے حیات مسلم تقلیدِ کافر سے مصئون ومحفوظ رہے۔ چنانچہ آج تک مسلمان یہی جانتے تھے اور بقدرِ توفیق اسی پر اُن کا عمل بھی تھا۔ لیکن اِس دور میں مسلمانوں کی عصبیت اِس طرح فنا کردی گئی کہ معاشرتی وتمدنی اُمور کا کیا ذکر دینی اُمور میں کفار کی تقلید کمال ارادت وعقیدت سے ہونے لگی اور اسے ایمان واسلام کا لقب عطا کیا گیا۔ کہنے والا منہ بھر کر کفر کا کلمہ کہتا ہے، سامع اُسے سنتا ہے اور جوش طرب میں آکر رقص کرتا ہے، علمائے سیاسی دیکھتے ہیں، سنتے ہیں، لیکن کہیں اپنے سکوت، کہیں اپنی مداہنت اور کہیں اپنے فتاوے سے ایجاد کفر وتکرار کفر پر ترغیب وتحریص دیتے ہیں یہ وہی زمانہ ہے جس کے متعلق مسلم شریف میں روایت موجود ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آخر زمانے میں جھوٹے دجال تمہارے پاس ایسی حدیثیں لائیں گے جنھیں نہ تم نے کبھی سنا ہوگا، نہ تمہارے باپ کے کان آشنا ہوئے ہوں گے، اپنے کو

اُن سے اور اُن کو اپنے سے بچانا، خبردار وہ تمہیں گمراہ نہ کرنے پائیں اور نہ تمہیں فتنہ میں ڈالیں۔"(۵۴)

اختلاف کی وجہ اصلی

اَمر واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے کم وبیش ہزار سال برعظیم پر حکمرانی کی۔ ہزاروں علما اِس خاک ہند میں پیدا ہوئے لیکن کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی کہ علماء نے ہندوؤں کو مسلمانوں کا رہبر بنایا ہو۔ بتایئے کس صدی کے علماء نے کفارِ ہند کو اہل کتاب قرار دیا۔ یہ ہندو پرستی تو انہی مدعیانِ علم کے حصے میں آئی جنھوں نے اُس دور میں مشرکینِ ہند سے اتحاد ویگانگت کی خاطر اسلامی خصوصیات اور امتیازات کو مٹا ڈالا۔

مزید طرفہ تماشہ دیکھئے کہ جمعیت العلمائے ہند کے جری فاضلوں نے ہندوؤں سے داد واتحاد کے جواز پر قرآنی آیات چسپاں کیں۔ ترکی کی حمایت اور حرمین طیبین کی اعانت کے نمائشی مرثیے پڑھ پڑھ کر مسلمانوں کو خیرخواہیٔ اسلام اور دردِ ملت کا یقین دلایا اور اُن کے اعتبار وبھروسہ کا خون کرکے ہندوؤں کی خواہشیں پوری کرتے رہے۔ یوں اُنہوں نے ہندو کی حمایت کو اپنا شعار بنا کر مسلمانوں کو بحیثیت قوم برباد کرکے رکھ دیا۔ یہی اُس وقت کے لیڈران قوم اور علمائے حق کے درمیان اختلاف کی وجہ اصلی تھا۔ علمائے حق تمام معاملات کو قرآن وحدیث اور سنتِ مصطفےٰ ﷺ کی روشنی میں دیکھنے، پرکھنے اور سرانجام دینے کے حامی تھے جبکہ لیڈران جمعیت العلمائے ہند اور خلافت کمیٹی اِس سے انحراف کے راستوں پر گامزن تھے۔

چنانچہ سیّد سلیمان اشرف اِن لیڈران قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے اور اہل حق کے خلافت و جمعیت العلماء کے لیڈران سے اختلاف کو یوں واضح کرتے ہیں:

"حضراتِ لیڈر، اہل حق کی آپ سے اختلاف کی اصلی وجہ یہی ہے کہ آپ اہل ہنود سے وہ سارے تعلقات پیدا کر رہے ہیں جنھیں حق سبحانہٗ نے حرام فرمایا ہے۔ موالات وداد اور رکون، یہ تین ایسے اُمور ہیں جنھیں ایک مومن کسی حال میں بھی کافر کے ساتھ برتنے اور پیدا کرنے کا مجاز نہیں بنایا گیا۔ آپ حضرات انہیں منہی عنہ اُمور کو نہ صرف جائز بلکہ

واجب وفرض قرار دے رہے ہیں۔ کمال غلو اور انتہائے انہاک سے کفر کی امداد اور مسلمانوں کے حقوق مذہبی کا اتلاف کر رہے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتا تو آپ سے کچھ بھی اختلاف نہ تھا۔ آپ جائز تعلقات کو انگریز سے موالات کہتے تھے، ضعف کو قوت سمجھتے تھے، غفلت کو تیاری جانتے تھے، اہل حق آپ کے اِن خیالات کو جوشِ مضرط ("مضرت"، یعنی نقصان، زیاں) پر محمول کر لیتے پھر آپ سے مخلصانہ عرض کرتے کہ جائز اُمور کو موالات کہنا شارع علیہ السلام اور شریعت پر الزام ہے۔ لفظ موالات کا استعمال نہ کیجئے، ضعف کو قوت سمجھنے میں مسلمانوں کی تباہی ہے، غفلت کو تیاری سمجھنا دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہونا ہے۔ اُمید تھی کہ آپ گرامی قدر حضرات بھی سمجھ جاتے اور باہمی مفاہمہ وتبادلہ خیال سے اصلاح مسلمین کی کوئی صورت پیدا ہو جاتی۔ لیکن ستم تو یہ ہے کہ آپ گاندھی کو اپنا امام بناتے ہیں اور مسلمانوں کو اُس کی اقتداء پر مجبور کرتے ہیں۔ آپ کفر کی حمایت کرتے ہیں اور مسلمانوں پر اعانت کفر کیلئے زور ڈالتے ہیں، زبردستی کرتے ہیں۔"(۵۵)

مسلمانوں کی مذہبی حالت کی اِس تباہی و بربادی پر سیّد صاحب لکھتے ہیں کہ آج:

"ہماری مذہبی حالت اِس طرح تباہ و برباد ہوگئی ہے کہ اگر ہمارے اسلاف اپنے قبروں سے نکل ہماری کیفیتوں کا نظارہ کریں تو واللہ انہیں کسی طرح ہمارے اسلام کا وہم بھی نہ ہو...... افسوس اسلام کیا تھا اور ہم نے کیا بنا رکھا ہے۔"(۵۶)

آپ کے نزدیک مسلمانانِ ہند کی موجودہ تباہی و بربادی اور ذلت ورسوائی کے ذمہ دار خود مسلمان اور اُن کے کوتاہ فہم قائدین ہیں۔ چنانچہ آپ انہیں اِس حالت زار کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور اِس تناظر میں لکھتے ہیں:

"اسلام کو اقوام غیر سے اِس قدر جاں ستاں صدمہ نہیں پہنچا جیسا خود

مسلمانوں کے ہاتھوں سے اُسے زخم کاری لگتا رہا۔ وہ مسلمان ہی تو ہیں جن کی بدولت دولتِ عباسیہ کا چراغ گل ہوگیا، ہندوستان کی یہ فلاکت زدہ حالت ہوگئی۔" (۵۷)

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا
وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ایک سنگین اور فاش غلطی کی نشاندہی

سیّد سلیمان اشرف "الرشاد" میں متذکرہ تحاریک کے دوران ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کی ایثار وقربانی کی قدردانی اور اہلِ ہنود کے اتحاد واتفاق کی غرض وغایت اور مدت صلح کو بھی واضح کرتے ہیں۔ ساتھ ہی آپ ہندو مسلم اتحاد کو ایک ہوائی اتحاد قرار دیتے ہیں اور اِسے بکری اور بھیڑیے کی دوستی سے بھی تشبیہ دیتے ہیں۔ سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک اپنی مذہبی شناخت، اپنا قومی تشخص اور من حیث القوم اپنا وجود ہندوؤں کے سپرد کردینا ایک ایسی سنگین اور فاش غلطی ہے جس کا ناقابل تلافی نقصان تمام مسلمانان ہند کو اٹھانا پڑے گا۔ چنانچہ آپ اِس غلطی سے بچنے کا احساس جگاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اپنے آپ کو من کل الوجوہ اُن (ہندوؤں) کے ہاتھوں میں سپرد کردینا ایسی فاش غلطی ہے جس کا خمیازہ بہت جلد اُٹھانا پڑے گا۔" (۵۸)

آپ مزید لکھتے ہیں کہ "عزیزانِ وطن ایسے وقت میں جب کہ اسلام اپنے متبعین کو آخری پیغامِ بیداری دے رہا ہو، کیا یہ اسی کا موقع تھا کہ مسلمانوں کی جماعت اِس طرح پراگندہ کردی جائے، اُن میں ایسا افتراق ڈالا جائے کہ گھر گھر نزاع قائم ہوجائے۔ کیا یہ اسی کا وقت تھا کہ مسلمانوں کے رہے سہے اخلاق بھی تباہ وبرباد کردیئے جائیں، کیا یہ اسی کا محل تھا کہ اُن کی بچی بچائی ہستی یوں کفار میں مدغم کردی جائے

......عزیزان وطن اگر اِن حضرات کو خلافت کی ہمدردی ہوتی اور دل میں اسلام کا درد ہوتا تو خدمت گزاریٔ دین کی وہ روش اختیار کرتے جو صلحائے اُمت کی سنتِ سنیہ ہے۔" (۵۹)

کوئی مذہبِ باطل اسلام کا ہمدرد و دوست نہیں

اسلام کے سوا دنیا کے تمام ادیان باطل ہیں اور اِن کے ماننے والے کبھی بھی اسلام اور مسلمانوں کے ہمدرد وخیرخواہ اور دوست نہیں ہوسکتے۔ قرآن نے اِس حقیقت کو متعدد مقامات پر دہرایا۔ سورہ مائدہ کی آیت ۵۱، بطورِ خاص اہل کتاب سے دوستی وتعلق قائم کرنے کی حرمت وممانعت پر دلیل ہے۔ جبکہ سورۃ الممتحنۃ کی پہلی آیت میں صاف طور پر ارشاد فرمایا گیا کہ "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ" یعنی "اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمن کو (اپنا) دوست مت بناؤ۔"

اِن ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ کفار ومشرکین اسلام اور اہل اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف متحد وصف آرا رہے اور انہوں نے کبھی بھی اسلام دشمنی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور ہجرت کے دوران قوم اور رہبران قوم نے اِس اٹل حقیقت کو بہت بری طرح نظر انداز کیا۔ اور صرف انگریز کو اپنا دشمن گردانتے ہوئے اہلِ ہنود سے محبت ودوستی کی پینگیں بڑھائیں حالانکہ وہ بھی اسلام اور مسلمانوں کے اُتنے ہی جانی دشمن تھے جتنے کہ انگریز۔ چنانچہ سیّد سلیمان اشرف نے اِس بات کو باور کرتے ہوئے لکھا:

"عزیزانِ وطن! پاک مذہبِ اسلام جس کی ساری تعلیمات کا جوہر توحید وخدا پرستی ہے اُس کا دشمن تم صرف انگریزوں کو کیوں قرار دیتے ہو، ہر وہ مذہبِ باطل جو دنیا میں موجود ہے یا کسی وقت اختراع کیا جاسکتا ہے وہ اِس دینِ قویم اور صراطِ مستقیم کا جانی دشمن ہے۔ کفر واسلام میں جب کہ تضاد ذاتی ہے پس یہ محال عقلی ہے کہ کوئی مذہبِ کفر ٹھنڈی آنکھوں سے اسلام کو دیکھنا گوارا کرے، ہاں مجبوری اور معذوری کی اور

بات ہے۔قرآن کریم نے سیکڑوں جگہ اِسی کی خبر دی ہے۔ پس مسلمانوں کوخود اپنے آپ میں قوت پیدا کرنے کی ضرورت ہے نہ غیر قوم میں جذب و مدغم ہونا۔یہی شریعت کا فتویٰ ہے اور یہی عقلِ سلیم کا حکم۔ایک دشمن سے نجات پانے کی تدبیر میں رستگاری سے قبل دوسرے دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار ہوجانا نہ عقل کا فتویٰ ہے نہ تعمیل حکم شریعتِ الٰہی ہے۔"(۶۰)

حامیانِ ہندو مسلم اتحاد اور پیغام تنبیہہ و اصلاح

چنانچہ آپ اپنی معرکتہ الآراء کتاب "النور" میں ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں کو پیغام اصلاح وتنبیہہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غالب گروہ کفار کو اپنی معیت میں اِس طرح لینا کہ کفر کا علم بلند ہو اور مسلمان اُس کے تحت لڑ رہے ہوں یہ قطعی حرام ہے۔نصوص صریحہ کے بعد کسی صاحب ایمان کیلئے مزید بحث وگفتگو کی حاجت نہیں رہتی اگر علمائے سیاسی و جینٹلمین لیڈر کو دعویٰ ایمان ہے تو کفار ومشرکین کی معیت اُمور دینیہ میں ترک کریں اور مذہبِ کفر کی اعانت وتائید جو صریح حرام ہے توبہ کریں۔مسٹر گاندھی اور اُن کی پارٹی کے ساتھ مدارات، فعل معروف اور رحم وشفقت کیجئے،ضروریات زندگی میں اُن کی مدد کیجئے،اگر اُن میں کوئی بیمار ہو تو بیمار پرسی کیجئے،دوا وعلاج سے ہمدردی فرمائیے حیات تمدنی اور معاملات دنیوی میں خرید وفروخت، بیع ورہن اور اجارہ وغیرہ بے دغدغہ بشروطہا جاری رکھیئے، اِس لیے کہ یہ اُمور نہ موالات ہیں نہ وداد ورکون بلکہ جائز ومرخص ہیں رسول اللہ ﷺ نے بہ نفس نفیس اِن اُمور کو عزت عمل عطا فرمائی ہے۔لیکن خدا کیلئے یہ مصیبت مسلمانوں پر نہ لائیے کہ جلسہ جمعیت العلماء کا منعقد ہوا اور مسٹر گاندھی اُس میں خطیب ومذکر بن کر علما اور عامہ مسلمین سے خطاب کرے،جلسہ خلافت و

اَماکن مقدسہ ہو اور مسٹر گاندھی اُس کی صدارت کریں،علماء زیر صدارت گاندھی تحریک شرعی پیش کریں،للہ مسلمانوں کی دینی مجالیس کو کفار ومشرکین سے پاک کیجئے۔"(۶۱)

الغرض ایک طرف تو پروفیسر سیّد سلیمان اشرف جیسے مخلص اور دردمند دل رکھنے والے قومی وملّی مدبر ورہنما تھے جو دینی وسیاسی بصیرت اور تجربے کی بناء پر یہ رائے قائم کرچکے تھے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان مستقبل میں بحثیت ایک قوم تب ہی زندہ رہ سکتے ہیں جب وہ اپنے دین کو اپنا راہنما بنالیں اور اپنی تہذیب وثقافت کے تحفظ وبقاء کی جدوجہد کریں۔

جبکہ دوسری طرف مذہبی لبادوں میں ملبوس بڑے بڑے شیخ الہند اور شیخ الحدیث تھے جو گاندھی کی نقاب پوش سیاست کے نقیب بنے متحدہ قومیت کے نظریے کو قرآن وحدیث سے درست ثابت کررہے تھے۔اِن نیشنلسٹ علماء میں جمعیت علمائے ہند اور مجلس احرار کے بڑے بڑے زعماء شامل تھے۔یہ سب ہی کانگرس کے موقف کے براہ راست یا بالواسطہ طور پر حامی تھے۔جو پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں متحدہ قومیت کا ڈھونگ پھیلا رہے تھے۔

حقیقت حال یہ تھی کہ ملتِ اسلامیہ ہند بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔ایک طبقہ وہ تھا جس نے اپنی غیر ایمانی فکر کے باعث حالات سے سمجھوتہ کر رکھا تھا اور قوم کو کانگریس کا میٹھا زہر پلا کر سلا دینا چاہتا تھا۔جبکہ دوسرے وہ علمائے حق کا گروہ تھا جس پروفیسر سیّد سلیمان اشرف بھی شامل تھے،جو اُس ہیجانی دور میں مسلمانان ہند کو گاندھی اور گاندھی نوازوں کی منافقانہ سیاست اور گاندھی کی مہاتمائیت کا طلسم توڑ کر مسلمانوں کو سیاسی خودکشی سے بچانے کی کوشش کررہے تھے۔یہی وجہ تھی جو آپ نے مسلمانوں کے دلوں میں گاندھی کی محبت وعقیدت پیدا کرنے والے لیڈروں کی گرفت کی اور غیر شرعی اُمور پر اُن کا تعاقب کیا۔

سیّد سلیمان اشرف نے اپنی تحاریر وتقاریر سے اُس نازک اور پُرفتن دور میں اسلامیانِ ہند کی راہنمائی کا فریضہ ہی سرانجام نہیں دیا بلکہ اُن کو بلاخوف لومۃ لائم مشرکین ہند کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط واتحاد کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا اور علما کو اُن کی دینی وملّی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر اپنی بالغ نظری، علمی ثقاہت اور سیاسی بصیرت کا بھی بین

ثبوت دیا۔سیّد سلیمان اشرف نے اُس دور میں تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور ہندو مسلم اتحاد کے نتائج کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوااور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ سیّد سلیمان اشرف صاحب کو حق تعالیٰ نے جس بصیرت و بصارت سے نوازا تھا اُس دور کے لیڈرانِ خلافت و جمعیت علمائے ہند اِس سے محروم تھے۔

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے
اثر یہ بھی اک میرے جنون فتنہ ساماں کا
میرا آئینہ دل ہے قضا کے راز دانوں میں

حواشی وحوالہ جات

(۱) گاندھی کا ۲۴، اپریل ۱۹۳۵ء کو بارتیہ ساہتیہ پریشد سے خطاب، ماہنامہ جامعہ دہلی، مئی ۱۹۳۹ء، مشمولہ،تحریک آزادی ہند اورالسواد الاعظم، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۱۷

(۲) مسعوداحمد، پروفیسر،تحریک آزادی ہند اورالسواد الاعظم،ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۷ء، ص:۷۰۔۶۹

(۳) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر،النور، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ،۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور،اگست ۲۰۰۸ء، ص:۲۳

نوٹ:۔ایم پانکر کے مطابق'' اسی دور میں اربندوگوش نے ویدانیت کا تصور عام کرنے کیلئے بھگوت گیتا پر زوردار مضامین لکھے اور بعد میں انہیں کتابی شکل دی۔'' اربندوگوش نے اعلان کیا کہ ہندوقومیت صرف کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے بلکہ اسے خدا نے بنایا ہے۔قتل وغارت گری بھی ویسا ہی آفاقی اور عالمگیر اصول ہے جیسا محبت اور اتحاد ہے۔اس نے اپنے مضامین میں بار بار اس نکتے پر زور دیا کہ ہم ہندوستان میں ہندو مذہب ہندوتہذیب اور ہندو فلسفے کی تجدید چاہتے ہیں لہٰذا ان تینوں چیزوں کا مجموعی نام ہم نے برہمنی تہذیب رکھا ہے۔''(اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام،سیّد قاسم محمود،الفیصل،لاہور۲۰۱۲،ص:۳۱۸۔۳۱۷)

(۴) فرینک موریس، جواہر لال نہرو،ص:۶۰،مشمولہ فاضل بریلوی اورتحریک ترک قربانی گاؤ، قاضی عبدالنبی کوکب

(۵) سردار محمد خان، چودھری،حیات قائد اعظم،مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹ء، ص:۱۶۸۔۱۸۱،مشمولہ النور طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور اگست ۲۰۰۸،ص:۶۹۔۶۸

(۶) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر،النور، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ،۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور،اگست ۲۰۰۸ء، ص:۴۶

(۷) ماہنامہ حکایت لاہور، شمارہ جون، ۱۹۷۸ء ص:۱۰۱۔۱۰۰

(۸) جمشید قمر، جہان ابوالکلام فکر وتحقیق کی چند جہتیں ،مولانا آزاد اسٹڈی سرکل رانچی، ۲۰۰۸ء، ص:۲۰۱

(۹) انور عارف، آزادی کی تقریریں، نیوتاج آفس دہلی، ص:۱۰۲، مشمولہ امام احمد رضا کے افکار و نظریات، ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم، ص:۹۹۔۹۸، کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور

(۱۰) الہلال مقدمہ، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۱۹۸۸ء ص:۸۔۷، مشمولہ امام احمد رضا کے افکار و نظریات، ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم، ص:۱۰۰، کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور

(۱۱) مسعود احمد، پروفیسر تحریک آزادی ہند اور السواد اعظم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۷ء، ص:۸۹

(۱۲) جمشید قمر، جہان ابوالکلام فکر و تحقیق کی چند جہتیں، مولانا آزاد اسٹڈی سرکل رانچی، ۲۰۰۸ء، ص:۱۹۵

(۱۳) A.B Rajput,Maulana Abul Kalam Azad,Lion Press Lahore,1957,Page.40

(۱۴) مضمون، مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر میں سیکولرزم کا علمبردار، مترجم، نیاز سواتی بحوالہ انٹرنیٹ

(۱۵) عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص:۲۸۵

(۱۶) حسین احمد مدنی، نقش حیات، دارالاشاعت اردو بازار کراچی، جلد دوم، ص:۶۷۹

(۱۷) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، المحجتہ المؤتمنہ فی آیۃ اللتحنہ، مطبوعہ بریلی، مشمولہ اوراق گم گشتہ، رئیس احمد جعفری ندوی، مطبوعہ محمد علی اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۲۳۷

(۱۸) محمد میاں، علمائے حق، حصہ اوّل، مطبوعہ مراد آباد، ۱۹۴۶ء، ص:۹۶

(۱۹) مضمون مجاہد جلیل حضرت مولانا حسین احمد مدنی سیاسی جدوجہد کے آئینے میں، ڈاکٹر رشید الوحیدی قاسمی، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، شمارہ ۴، جلد:۹۷، جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ ہجری مطابق اپریل ۲۰۱۳ء، ص:۴۴

(۲۰) مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی گاندھی مطابقت کا تو یہ حال تھا کہ خواجہ حسن نظامی کو دیئے گئے تار میں خود لکھتے ہیں ''فقیر نان کو آپریشن کے مسئلے میں بالکل پس رو گاندھی صاحب کا ہے، کیونکہ اِس طریقہ کار کا واقف نہیں ہے، اُن کو اپنا راہ نما بنالیا ہے، جو وہ کہتے ہیں وہی مانتا ہوں، میرا حال تو سر دست اِس شعر کے موافق ہے۔

عمر یکہ بآیات و احادیث گزشت
رفتی و نثار بت پرست کردی

(خواجہ حسن نظامی، مہاتما گاندھی کا فیصلہ، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی۔ ۱۹۲۰ء، مشمولہ تحریک آزادِ ہند اور السواد الاعظم، پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء،

ص:۱۰۳)

(۲۱) مسعود احمد، پروفیسر تحریک آزادی ہند اور السواد اعظم، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور ۱۹۸۷ء، ص:۱۱۷۔۱۱۶

(۲۲) محمد عبدالغفار، قاضی، حیات اجمل، ص:۴۲۵۔۴۲۰۔۴۱۹۔۲۵۴

(۲۳) مکتوب بنام سی آر داس، مطبوعہ ۲۱ فروری ۱۹۴۰ء، مشمولہ تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم، پروفیسر مسعود احمد، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص:۲۲۵۔۲۲۴

(۲۴) رئیس احمد جعفری، ندوی' قائد اعظم محمد علی جناح اور اُن کا عہد، ص:۱۵۰

(۲۵) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، تدبیر فلاح ونجات واصلاح، نیٹ ایڈیشن اعلیٰ حضرت نیٹ ورک، ص:۱۴۷

(۲۶) وہاں (ترکی میں) مسلمانوں پر یہ کچھ (مصیبت) گزر رہی ہے، یہاں وہی جلسے وہی رنگ، وہی تھیٹر، وہی تماشے بازیاں، وہی غفلتیں، وہی فضول خرچیاں، ایک بات کی بھی کمی نہیں ...... اور مظلوم اسلام کی مدد کیلئے جو کچھ جوش دکھائے جا رہے ہیں آسمان سے بھی اونچے ہیں اور جو اصلی کاروائی ہو رہی ہے زمین کی تہہ میں ہے۔'' (محدث بریلوی تدبیر فلاح ونجات واصلاح، نیٹ ایڈیشن اعلیٰ حضرت نیٹ ورک، ص:۱۴۳)

(۲۷) ایضاً ص:۱۴۵۔۱۴۴

(۲۸) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، المحجۃ المؤتمنۃ فی آیات الممتحنۃ، رسائل رضویہ، ج ۲، مکتبہ حمیدیہ ۱۹۷۶ء، ص:۱۵۵

(۲۹) ایضاً ص:۱۹۷

(۳۰) ایضاً ص:۹۵

(۳۱) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، الطاری الداری، حصہ سوم، مطبوعہ بریلی، ص:۹۹

(۳۲) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، المحجتہ المؤتمنہ فی آیۃ اللتحنہ، مطبوعہ بریلی، مشمولہ اوراق گم گشتہ، رئیس احمد جعفری ندوی، مطبوعہ محمد علی اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۲۹۹

(۳۳) احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، المحجتہ المؤتمنہ فی آیۃ اللتحنہ، مطبوعہ بریلی، مشمولہ اوراق گم گشتہ، رئیس احمد جعفری ندوی، مطبوعہ محمد علی اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۳۰۵

(۳۴) اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر، علماء ان پالیٹکس، شعبہ تصنیف تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، جولائی ۱۹۹۴ء، ص:۳۲۹۔۳۲۸

(۳۵) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الرشاد مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، ص۶، طبع جدید، دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء

(۳۶) ایضاً ص:۷

(۳۷) ایضاً ص:۸

(۳۸) ایضاً ص:۱۷-۱۶

(۳۹) ایضاً ص:۸

(۴۰) ایضاً ص:۸

(۴۱) ایضاً ص:۱۰-۸

(۴۲) ایضاً ص:۱۱-۱۰

(۴۳) ایضاً ص:۱۲-۱۱

(۴۴) ایضاً ص:۱۴-۱۳

(۴۵) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۲۴

(۴۶) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الرشاد مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، ص۱۴، طبع جدید، دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱

(۴۷) ایضاً ص:۱۵-۱۴

(۴۸) ایضاً ص:۳۱-۳۰

(۴۹) ایضاً ص:۳۲-۳۱

(۵۰) ایضاً ص:۱۵

(۵۱) ایضاً ص:۱۵

(۵۲) ایضاً ص:۵

(۵۳) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۶۶-۶۴

(۵۴) ایضاً ص:۱۵۵-۱۵۴

(۵۵) ایضاً ص:۲۱۵-۲۱۴

(۵۶) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، البلاغ، اسلام اور خلافت، مطبع احمد علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، ص:۳۵، طبع

جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۵۷) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، البلاغ، مسلمانوں کا ملی انحطاط، مطبع احمد علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، ص:۱۸، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۵۸) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الرشاد مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء، ص۳۰، طبع جدید، دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء

(۵۹) سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء، ص:۱۹۹

(۶۰) ایضاً ص:۲۰۹

(۶۱) ایضاً ص:۲۲۴-۲۲۳

باب هفتم

ملّی تحریکات اور دوقومی نظریہ

ملّی تحریکات اور دوقومی نظریہ

پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۹ء۔۱۹۱۴ء) میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ جنگ کے دوران ہی مسلمانانِ ہند محسوس کرنے لگے کہ اگر جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی تو ترکی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جائے گا۔ اِس سے قبل ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء کے درمیان سلطنت عثمانیہ کے ہاتھ سے بہت سے علاقے ''مقدونیہ، اپی رس، البانیہ، تھریس کا بڑا حصہ، بحیرہ ایجین میں کریٹ، قبرص، اور کئی جزائر، بلغاریہ، بوسنیا، ہرزی گووینا، اور مصر وطرابلس'' وغیرہ نکل چکے تھے۔ جس وقت ترکی جنگِ عظیم اوّل میں شریک ہوا، مسلمانانِ ہند بے قرار ومضطرب ہوگئے۔ خلافت عثمانیہ سے مذہبی وابستگی اور ترکی کے ساتھ جذباتی لگاؤ اِس بے چینی کا بنیادی سبب تھا۔ جو بحیثیت مسلم یہ ایک فطری ردّعمل تھا۔

چونکہ ترکی کے قبضے سے پہلے ہی بہت سے علاقوں کا نکل جانا اُن کے دلوں پر ایک زخم چھوڑ گیا تھا۔ اِس لیے اب انہیں نئے اندیشے ستا رہے تھے۔ اور جزیرۃ العرب، مقامات مقدسہ اور خلافت کا تحفظ وبقاء سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ وہ فکر مند تھے کہ اگر جرمنی کو شکست ہوئی تو دنیا میں مسلمانوں کا کہیں ٹھکانہ نہ رہے گا۔

اُس دور میں یورپ کی عیسائی ریاستیں اپنے اندر بے پناہ سامراجی اور توسیعی عزائم رکھتی تھیں۔ کرہ ارض پر شاید ہی کوئی مسلمان ملک یا علاقہ ایسا ہو جو اُن کے قبضے میں نہ ہو۔ شمالی افریقہ ہو یا ایشیا، وسطی ایشیا ہو یا بلقان کا علاقہ سب کے سب عیسائی طاقتوں کے اسیر تھے۔ ساری دنیا میں بس ایک دولتِ عثمانیہ ہی بچی تھی جو اپنی شان وشوکت کھونے کے باوجود عیسائی تسلط سے آزاد اور ایک خود مختار مسلم ریاست کے طور پر اپنا وجود برقرار رکھے

ہوئے تھی۔

سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف عالمی سازشیں

ترکی اُس وقت دنیا میں مسلمانوں کی واحد آزاد ریاست تھی۔ صلیبی طاقتیں اُسے بھی کھوکھلا کر کے ختم کردینا چاہتی تھیں۔ ترکی اہلِ مغرب کی چیرہ دستیوں کا شکار تھا۔ مغربی اتحادی ایک طرف سلطنتِ عثمانیہ کے غیر مسلم عناصر کو خلیفۂ اسلام کے خلاف بھڑکا رہے تھے تو دوسری طرف اُن کے ساتھ بدسلوکی اور ظلم کے فرضی الزامات کے سہارے انسانیت کے نام پر ایک مسلمان مملکت کے اندورنی معاملات میں مداخلت بھی کررہے تھے۔ ۱۸۷۶ء میں بلقان میں سازشوں کے ذریعے سلطنتِ عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی کوشش، ۱۸۷۷ء میں روسیوں کی عثمانیوں کے حصے بخرے کرنے کے عزم پر برطانیہ کی خاموشی اور ۱۸۹۷ء میں یونان کیلئے برطانیہ کی حمایت سب اسی پالیسی کا حصہ تھیں۔

یہ سوال کہ کیا برطانیہ اِس منصوبہ کے تیار کنندگان میں سے تھا جس کا مقصد دولت عثمانیہ کی بیخ کنی تھی، کیا برطانیہ دنیائے اسلام کو پابہ زنجیر کیے جانے کے ڈرامے کے مرکزی کرداروں میں سے ایک تھا؟ اُس کے سابقہ کردار کو مدنظر رکھتے ہوئے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کیلئے اِس لیے سوہان روح اور پریشان کن تھا کہ وہ ترکی کے ساتھ یہ اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے کہ ترکی کی خلافتِ عثمانیہ کے برقرار رہنے کی صورت میں کسی وقت بھی اُمتِ مسلمہ کیلئے مرکزیت اور وحدت کی صورت پیدا ہوجائے گی۔

اِسی دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ برطانیہ نے مسلمان ممالک خصوصاً سلطنت عثمانیہ کی حمایت کی پالیسی کو خیرآباد کہہ دیا ہے۔ حتیٰ کہ برطانوی حکومت عیسائی ممالک کے اس خفیہ اتحاد میں شریک ہوگئی ہے جس کا مطمع نظر اسلام کی بیخ کنی، مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا، ترکی کی آزادی وخودمختاری کو سلب کرنا اور سارے مسلمان ممالک کو غلام بنانا تھا:

> ''کلکتہ سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار ''مسلمان'' The Mussulman میں بڑے افسوس کے ساتھ بتایا گیا کہ ہر جگہ اسلام کے وقار کو صدمہ پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے اور اِن حالات میں جنوبی

> ایشیا کے مسلمانوں کا خاموش رہنا ناممکن ہے۔ اخبار نے لکھا کہ برصغیر کے مسلمان ترکی کے دفاع کیلئے فوج نہیں بھیج سکتے لیکن کم ازکم جنگ میں اُس کو پہنچنے والے نقصانات کا ازالہ کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔''(۱)

اصل معاملہ یہ تھا کہ برطانیہ اُنیسویں صدی عیسوی میں بہت سے مسلمان ممالک کو اپنے قبضے میں لینے کے بعد ایک بڑی سلطنت کے طور پر اسلامی دنیا میں دولتِ عثمانیہ کی عظمت وسطوت اور اثرورسوخ کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں آگیا تھا اور وہ سلطنت عثمانیہ کو جڑ سے اکھاڑنے پھینکنے کی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ سلطان عبدالحمید دوم (۱۸۴۲ء۔۱۹۱۸ء) جس نے ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۹ء تک خلافت کی باگ دوڑ سنبھالی، کے دور خلافت میں ایک عرب خلافت کا شوشہ چھوڑنے کا مقصد بھی ایک پنتھ دوکاج تھا۔ یعنی ایک طرف عرب قوم پرستوں کی پیٹھ ٹھونکنا اور دوسری طرف ترکی کی خلافت کو ختم کرکے ایک پارلیمانی نظام کا خواب دیکھنے والے ''نوجوان ترک'' (YoungTurk) تحریک جس کا آغاز ۳، جولائی ۱۹۰۸ء میں ہوا، کے حامیوں کو شہ دینا ہی تھا۔

ابھی طرابلس پر اٹلی کے جارحانہ قبضے کے نتیجے میں ہندوستان کے مسلم اداروں، جماعتوں اور افراد کا غم وغصہ کم نہیں ہوا تھا کہ بلقان میں ترکوں کے خلاف مقامی عیسائی آبادی کو بڑی طاقتیں سرکشی اور بغاوت کی ترغیب دینے لگیں اور بلقان کی مقامی آبادی اِن بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگی۔ یہ کھیل اب دولت عثمانیہ کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا۔ لہٰذا ترکی کی عوام کیلئے اپنے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

اُدھر بلقان میں یکے بعد دیگرے ہونے والی بغاوتوں اور حملوں کے واقعات جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کیلئے شدید ذہنی پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ اُن کی دلی خواہش تھی کہ اُن کے ترک بھائی امن وامان اور آزادی کے ساتھ رہیں اور اُنہیں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ اسلامی بھائی چارے کا ناگزیر اصول ہے۔

پہلے طرابلس پر حملہ اور بعد میں بلقان کی جنگوں کی بناء پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا برطانیہ پر سے اعتماد بالکل ہی اٹھ گیا۔ اُن کو اِس بات سے بہت مایوسی ہوئی کہ برطانیہ نے

اِن دونوں مواقع پر ضروری مداخلت نہیں کی اور ترکوں کی حمایت میں انگلی تک نہیں اٹھائی۔ اُنہیں یہ بھی احساس ہوا کہ اب برطانیہ مسلمانوں کا دوست اور خیر خواہ نہیں رہا ہے بلکہ اُس نے یورپی اقوام کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف دوبارہ صلیبی جنگوں کو آغاز کر دیا ہے۔

فکری اور گروہی تقسیم

۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید دوم کے اختیارات میں کمی اور ایک سال بعد ہی اُس کے اقتدار کے مکمل خاتمے کیلئے نوجوان ترکوں کے اختیار کردہ طریقہ کار یعنی متضاد عناصر کے ساتھ اتحاد وتعاون نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں اِس خیال کو تقویت دی کہ وہ بھی انگریزوں کے خلاف باہمی مذہبی اتحاد وتعاون کے ذریعے برطانوی راج کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ اِس خیال کے ایک متاثر اور سب سے بڑے حامی ابوالکلام آزاد بھی تھے:

> "اُن کے مطابق "ترقی" کا مطلب آزادی کی جانب قدم بڑھانا اور "اتحاد" کا مطلب دولتِ عثمانیہ کے خطوط پر غیر مسلموں اور مخالف عناصر یعنی ہندوؤں کے ساتھ تعاون تھا۔" (۲)

چنانچہ اِس طرز فکر اور ہندوستان کے حالات نے کچھ مسلم رہنماؤں کو ہندوؤں کے قریب کر دیا۔ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کی دعوت کا بظاہر مثبت جواب دیا۔ اِسی سال یعنی ۱۹۱۳ء میں پہلی مرتبہ ہندوؤں نے مسلم لیگ اور دوسری اسلامی تنظیموں کے اجتماعات میں شرکت کی اور کانگریس نے بھی ترکوں کی حمایت میں بعض قراردادیں پاس کیں۔ یوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد قائم ہوتے ہی یورپ سے درآمد ہونے والے مال کا بائیکاٹ شروع ہو گیا، اور طرابلس کی جنگ کے دوران ترکوں کی امداد کیلئے بڑے پیمانے پر ایک مہم شروع کی گئی۔ جس میں ہر ایک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوششوں سے قائم ہونے والا ایک طبی مشن ۱۹۱۳ء میں خود اُن ہی کی سربراہی میں ترکی بھیجا گیا۔

اِسی اثناء میں جنوبی ایشیا کے مسلمان لیڈروں میں اختلاف رائے کی نشانیاں نظر آنے لگیں۔ مسلمانانِ ہند اب واضح طور پر دو گروپوں میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ بلکہ ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بند نظر آرہے تھے۔ اِن میں ایک کی قیادت سید امیر

علی (۱۸۴۹ء۔۱۹۲۸ء) اور آغا خان سوم (۱۸۷۷ء۔۱۹۵۷ء) اور دوسرے کی قیادت مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے۔ سید امیر علی کا گروپ انگریزوں کا حامی تھا جبکہ مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے ساتھی ترکوں کے حامی تھے۔ یہ دونوں اب ایک ایسے موڑ پر آگئے تھے جہاں سے اُن کے راستے جدا ہو جاتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کے طرف داروں میں سامراجیت کے خلاف ملت پرست عوام اور بالخصوص جوانوں کو اب یہ اچھی طرح پتا چل گیا تھا کہ جو انگریز بلقان کی جنگوں میں ترکوں کے معاملے میں بے حس ہو چکے تھے وہ اپنی مسلمان رعایا کے نہ ہمدرد ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے ساتھی ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات واحساسات کے ترجمان کی حیثیت اختیار کر گئے اور مسلم لیگ بھی امیر علی اور آغا خان جیسے لوگوں کی بیڑیوں سے آزاد ہوگئی۔

نظریاتی اور اصولی اختلافِ رائے

دوسری طرف جنوبی ایشیا کے مسلمان بھی نظریاتی طور پر دو واضح گروپوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ایک ہندوؤں کے تعاون سے ہر قیمت پر خلافتِ عثمانیہ کا تحفظ و بقاء چاہتا تھا جبکہ دوسرا ترکوں اور سلطنتِ ترکیہ کا حامی و ہمدرد تو تھا لیکن مسئلہ خلافت پر اُس کا شرعی نقطہ نظر حامیانِ خلافت سے مختلف و جدا اور شرعی اُصولوں کے عین مطابق تھا۔ وہ اِس تحریک میں ہندوؤں کی شمولیت کو تحریک اور بالخصوص برعظیم کے مسلم مفادات کیلئے سخت مضر خیال کرتا تھا۔ یہ وہ علمائے حق تھے جن میں محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ اُس زمانے میں محدث بریلوی نے رہبرانِ خلافت اور مسلمانانِ ہند کو بارہا متنبہ کیا اور اِس اتحاد کے اثرات ومضمرات اور اِس کی شرعی حیثیت سے آگاہ کیا۔ آپ فرماتے ہیں:

> "مشرکین سے اتحاد و وداد، دوستی موالات کہ سب کا حاصل ایک ہے، بلکہ اتحاد سب میں زائد ہے، حرام قطعی وکبیرہ شدیدہ ہے، اس کا استحلال بلکہ استحسان کفر ہے..... ایسے مذہب کا ایجاد جو ہندو مسلمانوں کا امتیاز موقوف کرے، پریاگ وسنگھم معابد مشرکین کو مقدس بنانا وغیرہ کفریات ملعونہ....." آپ نے مزید لکھا کہ "اِس (اتحاد) میں مشرک کو راہنما بنانا،

اِن دونوں مواقع پر ضروری مداخلت نہیں کی اور ترکوں کی حمایت میں انگلی تک نہیں اٹھائی۔ اُنہیں یہ بھی احساس ہوا کہ اب برطانیہ مسلمانوں کا دوست اور خیر خواہ نہیں رہا ہے بلکہ اُس نے یورپی اقوام کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف دوبارہ صلیبی جنگوں کو آغاز کر دیا ہے۔

فکری اور گروہی تقسیم

۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید دوم کے اختیارات میں کمی اور ایک سال بعد ہی اُس کے اقتدار کے مکمل خاتمے کیلئے نوجوان ترکوں کے اختیار کردہ طریقہ کار یعنی متضاد عناصر کے ساتھ اتحاد وتعاون نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں اِس خیال کو تقویت دی کہ وہ بھی انگریزوں کے خلاف باہمی مذہبی اتحاد وتعاون کے ذریعے برطانوی راج کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ اِس خیال کے ایک متاثر اور سب سے بڑے حامی ابوالکلام آزاد بھی تھے:

> ''اُن کے مطابق ''ترقی'' کا مطلب آزادی کی جانب قدم بڑھانا اور ''اتحاد'' کا مطلب دولتِ عثمانیہ کے خطوط پر غیر مسلموں اور مخالف عناصر یعنی ہندوؤں کے ساتھ تعاون تھا۔''(۲)

چنانچہ اِس طرزِ فکر اور ہندوستان کے حالات نے کچھ مسلم رہنماؤں کو ہندوؤں کے قریب کر دیا۔ ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کی دعوت کا بظاہر مثبت جواب دیا۔ اِسی سال یعنی ۱۹۱۳ء میں پہلی مرتبہ ہندوؤں نے مسلم لیگ اور دوسری اسلامی تنظیموں کے اجتماعات میں شرکت کی اور کانگریس نے بھی ترکوں کی حمایت میں بعض قراردادیں پاس کیں۔ یوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد قائم ہوتے ہی یورپ سے درآمد ہونے والے مال کا بائیکاٹ شروع ہو گیا، اور طرابلس کی جنگ کے دوران ترکوں کی امداد کیلئے بڑے پیمانے پر ایک مہم شروع کی گئی۔ جس میں ہر ایک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوششوں سے قائم ہونے والا ایک طبی مشن ۱۹۱۳ء میں خود اُن ہی کی سربراہی میں ترکی بھیجا گیا۔

اِسی اثناء میں جنوبی ایشیا کے مسلمان لیڈروں میں اختلافِ رائے کی نشانیاں نظر آنے لگیں۔ مسلمانانِ ہند اب واضح طور پر دو گروپوں میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ بلکہ ایک دوسرے کے خلاف مورچہ بند نظر آرہے تھے۔ اِن میں ایک کی قیادت سید امیر

علی (۱۸۴۹ء۔۱۹۲۸ء) اور آغا خان سوم (۱۸۷۷ء۔۱۹۵۷ء) اور دوسرے کی قیادت مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے۔ سید امیر علی کا گروپ انگریزوں کا حامی تھا جبکہ مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے ساتھی ترکوں کے حامی تھے۔ یہ دونوں اب ایک ایسے موڑ پر آگئے تھے جہاں سے اُن کے راستے جدا ہو جاتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کے طرف داروں میں سامراجیت کے خلاف ملت پرست عوام اور بالخصوص جوانوں کو اب یہ اچھی طرح پتا چل گیا تھا کہ جو انگریز بلقان کی جنگوں میں ترکوں کے معاملے میں بے حس ہو چکے تھے وہ اپنی مسلمان رعایا کے نہ ہمدرد ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے ساتھی ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات واحساسات کے ترجمان کی حیثیت اختیار کر گئے اور مسلم لیگ بھی امیر علی اور آغا خان جیسے لوگوں کی بیڑیوں سے آزاد ہوگئی۔

نظریاتی اور اصولی اختلافِ رائے

دوسری طرف جنوبی ایشیا کے مسلمان بھی نظریاتی طور پر دو واضح گروپوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ایک ہندوؤں کے تعاون سے ہر قیمت پر خلافتِ عثمانیہ کا تحفظ وبقاء چاہتا تھا جبکہ دوسرا ترکوں اور سلطنتِ ترکیہ کا حامی و ہمدرد تو تھا لیکن مسئلہ خلافت پر اُس کا شرعی نقطہ نظر حامیانِ خلافت سے مختلف و جدا اور شرعی اُصولوں کے عین مطابق تھا۔ وہ اِس تحریک میں ہندوؤں کی شمولیت کو تحریک اور بالخصوص برِعظیم کے مسلم مفادات کیلئے سخت مضر خیال کرتا تھا۔ یہ وہ علمائے حق تھے جن میں محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے۔ اُس زمانے میں محدث بریلوی نے رہبرانِ خلافت اور مسلمانانِ ہند کو بارہا متنبہ کیا اور اِس اتحاد کے اثرات ومضمرات اور اِس کی شرعی حیثیت سے آگاہ کیا۔ آپ فرماتے ہیں:

> ''مشرکین سے اتحاد وداد، دوستی موالات کہ سب کا حاصل ایک ہے، بلکہ اتحاد سب میں زائد ہے، حرام قطعی وکبیرہ شدیدہ ہے، اس کا استحلال بلکہ استحسان کفر ہے..... ایسے مذہب کا ایجاد جو ہندو مسلمانوں کا امتیاز موقوف کرے، پریاگ وسنگھم معابدِ مشرکین کو مقدس بنانا وغیرہ کفریات ملعونہ.....'' آپ نے مزید لکھا کہ ''اِس (اتحاد) میں مشرک کو راہنما بنانا،

مشرک کی تقلید کرنی، اُسے اپنا امام بنانا، خود اُس کے پس رُو ہونا، اُس کی
اطاعت اور وہ بھی برجہ کلّی کرنا، اپنے آپ کو اُس کے ہاتھ میں
دینا، قرآن وحدیث کی عمر اُس پر قربان کردینا، یہ سب حرام ومناقض و
منافیٔ اسلام ہے۔'' (۳)

محدث بریلوی، اُن کے خلفاء اور عقیدت مندوں نے مسلمانانِ ہند کی رہنمائی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اُنہی دنوں پیسہ اخبار لاہور نے ۲۶، نومبر ۱۹۲۰ء کی اشاعت میں ''ہندو مسلمانوں کا خطرناک اتحاد اور حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی مجدد مایۂ حاضرہ کا فتویٰ'' کے عنوان سے کئی صفحات پر مشتمل مواد بھی شائع کیا۔ جس میں کہا گیا:

''مشرکین سے اتحاد درکنار وداد حرام قطعی ہے..... مشرک کو حاجت دینیہ
میں ہادی بنانا۔ امام ٹھہرانا قرآن عظیم کی تکذیب ہے...... مشرک کیلئے
ہرگز کوئی عزت نہیں، اُس کی تعظیم سخت سے سخت کبیرہ اور قرآن عظیم کی
مخالفتِ شدیدہ ہے۔'' (۴)

محدث بریلوی کا انتباہ دوقومی نظریے کا اعلان

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ محدث بریلوی کی اِس مخالفت کا مقصد شریعتِ مطہرہ کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کی دینی و سیاسی رہنمائی کرنا تھا اور انہیں اُس خطرناک نتائج سے بچانا تھا جو ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کی صورت میں آپ کی نگاہِ بصیرت اور مومنانہ فراست قبل از وقت محسوس کررہی تھی۔ اُس دور میں برعظیم پاک و ہند میں محدث بریلوی پہلے فرد تھے جنھوں نے سب سے پہلے اِس خطرے کی نشاندہی کی۔ درحقیقت آپ کا یہ انتباہ اُس دوقومی نظریے کا ہی اعلان تھا جو بعد میں تحریک پاکستان کی بنیاد واساس قرار پایا۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی (ادارہ تحقیقات اسلامی، ماہنامہ فکرونظر، اسلام آباد، شمارہ جولائی ۱۹۷۱ء، ص: ۸۰۔۷۹ پر) اِس تاریخی حقیقت کو کس انداز سے بیان کرتے ہیں آیئے دیکھتے ہیں:

''جب گاندھی نے انگریزوں کے خلاف تحریکِ ترکِ موالات شروع کی

اور مسلمانوں کو یہ کہہ کر اس میں شمولیت کی دعوت دی کہ ہندوستان میں
بسنے والے ہندو مسلمان ایک قوم ہیں اور انہیں متحد ہوکر انگریزوں کے
خلاف تحریک چلانی چاہیے۔ اس دعوت کے مضمرات مسلمانوں کے حق
میں جتنے خطرناک تھے بعد کے تجربات نے خود انہیں آشکارا کردیا۔ اِس
خطرے کی سب سے پہلے جس شخص نے نشاندہی کی وہ مولانا احمد رضا
خاں بریلوی تھے۔ یہ انتباہ گویا اُس دوقومی نظریے کا اعلان تھا جس کی
بنیاد پر آگے چل کر پاکستان بنا۔''

اِس کے برخلاف پہلے گروہ (حامیانِ خلافت) کا استدلال اور مؤقف فکر اسلامی کے خلاف اور اُس کا رویہ انتہائی سخت و جارحانہ تھا۔ وہ ہر حال اور ہر قیمت پر جدوجہد جاری رکھنا چاہتے تھے۔ ترک محقق ڈاکٹر میم کمال اوکے ''تحریک خلافت'' صفحہ ۴۶۔۴۵، پر لکھتے ہیں چنانچہ:

''انہوں نے جدوجہد جاری رکھنے کے لیے مولانا عبدالباری فرنگی محلی
کی قیادت میں ۶، مئی ۱۹۱۳ء کو ''انجمن خدام کعبہ'' کے نام سے ایک نئی
تنظیم قائم کی۔ جس کا سب سے بڑا نعرہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے مقدس
مقامات کی دیکھ بھال خلیفہ اسلام کے ذمے ہے اور اِس میں کسی قسم کی
مداخلت برداشت نہیں کی جائے گی۔''

لہٰذا ہندوستان میں پیش آنے والے واقعات اور اِس نئی پیش رفت نے برطانوی حکام کو تشویش میں مبتلا کردیا۔ اُدھر خود وائسرائے ہند بھی مضطرب تھا لیکن وزیر ہند معاملے کی نزاکت کے احساس کے باوجود اِس خیال کا حامی تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ اصولی رویہ اختیار کیا جائے، کمزوری کا رویہ اختیار کرنے سے اُن کو شہ ملے گی جو زیادہ خطرناک ہوگی اور یہ کہ برطانیہ کی خارجہ پالیسی مسلمان رعایا کی خواہش کے مطابق بدلی نہیں جاسکتی اور نہ ہی اُسے بدلنا چاہیے۔ چنانچہ برطانوی وزارت خارجہ نے سیکرٹری ہند کو صاف صاف کہہ دیا:

''ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ محض ہندوستان کے مسلمانوں کو خوش کرنے

کیلئے ترکی کے معاملے میں زیادہ رواداری سے کام لیں یا یہ کہ اُس کے ساتھ زیادہ ہمدردانہ طریقہ اختیار کریں۔''(۵)

اِس فیصلے کے تین ماہ بعد برطانوی وزارت خارجہ نے وزیر ہند کو ایک خط لکھا جس میں اُس سے کہا گیا کہ وہ مسلمانوں کو خاموش کرنے کیلئے یہ اعلان کرے کہ برطانیہ اُن کے مقدس مقامات کو ہتھیانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ دراصل مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کی ایک چال تھی۔

جھوٹی یقین دہانیاں اور در پردہ سامراجی سازشیں

چنانچہ ہندوستان کے انگریز حکمران اور لندن کے ارباب حل وعقد اِس بات کی برابر یقین دہانی کرا رہے تھے کہ جنگ عظیم کا کوئی پہلو مذہبی نہیں ہے۔ اور نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو عثمانی خلیفہ اور بادشاہ کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جائے گی۔ لیکن اندرون خانہ اُن کے ارادے کچھ اور ہی تھے۔ جس کا اظہار برطانوی وزیر ہند کریو (Crew) کی اُس رپورٹ سے ہوتا ہے جو اُس نے ۱۳، اپریل ۱۹۱۵ء کو اپنے حکام بالا کے نام لکھی۔ کریو اِس رپورٹ میں لکھتا ہے:

> ''میں نہیں سمجھتا کہ استنبول پر قبضہ ہوجانے کے بعد شریف مکہ حسین (۱۸۵۳ء۔۱۹۳۱ء) سے متعلق ہماری پالیسی کی وجہ سے ہمیں کوئی پریشانی ہوگی، ہمیں چاہیے کہ ہم اُسے ترکی کی غلامی سے نجات دلانے کیلئے ہمارے بس میں جو کچھ ہے کریں، لیکن اِس سلسلے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے اور کسی کو پتہ نہ چلے کہ ہم اُسے مقامِ خلافت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔ ہندوستان میں آج کل پین اسلام ازم کی جو تحریک چلی ہوئی ہے اُس کا منبع اور مرکز استنبول ہے۔ یہاں کے مسلم اِس بات کو قطعی پسند نہیں کریں گے کہ خلافت عثمانیوں کے ہاتھ سے نکل جائے، لیکن شریف مکہ یا کوئی اور عرب سنی لیڈر اپنے آپ کو عثمانیوں سے آزاد کر کے خلافت جیسے متبرک عنوان کو حاصل کرلے تو مسلمان رائے عامہ

> اِس اَمر واقعی کو قبول کرلے گی اور ہندوستانی مسلمانوں کیلئے بھی اُن کا ساتھ دینے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جائے گا...... لیکن اس کے باوجود میرا خیال یہ ہے کہ آئندہ مسئلہ خلافت کی بناء پر مسلمانوں میں پھوٹ پڑسکتی ہے۔ درحقیقت دیکھا جائے تو اِس پھوٹ میں ہمارا سراسر فائدہ ہی ہے۔''(٦)

چنانچہ ۱۹۱٦ء میں برطانیہ نے شریفِ مکہ حسین کو بغاوت پر اُکسایا۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے شریفِ مکہ کے خلیفہ بنائے جانے سے متعلق برطانیہ کی کوششوں کی کھل کر مخالفت کی۔ اور اس سلسلے میں سب سے پہلا احتجاج جمعیت خدامِ کعبہ (جس کی داغ بیل ٦، مئی ۱۹۱۳ء کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ڈالی) کے رہنماء مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی طرف سے ہوا۔

ڈاکٹر میم کمال اوکے ''تحریک خلافت، صفحہ ٦۰، پر لکھتے ہیں کہ'' مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے علمائے ہند کی جانب سے ایک فتویٰ بھی جاری کروایا جس میں شریفِ مکہ حسین کی انتہائی سخت الفاظ میں مذمت اور خلیفۃ المسلمین کے ساتھ وفاداری کی تجدید کی گئی تھی۔''

اُدھر ترکی کے اخبارات ورسائل کے ساتھ ہندوستان کے اخبارات وجرائد نے بھی شریفِ مکہ کی بغاوت کو نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھا اور اِسے مسلمانوں اور اسلام کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف قرار دیا۔

۳۰، دسمبر ۱۹۱۸ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس عام میں ڈاکٹر انصاری نے منصب اور مقام خلافت کی اہمیت پر زور دیا۔ ڈاکٹر انصاری نے اپنی تقریر میں شریفِ مکہ حسین کو قرآن وسنت کی خلاف ورزی کا مرتکب اور ذاتی مفاد پر قومی مفاد کو قربان کرنے والا بھی قرار دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ برطانیہ کے سرکردہ لیڈروں اور حکام نے جنگِ عظیم کی ابتداء میں جو یقین دہانیاں کرائی تھیں وہ جھوٹی ثابت ہوئی جس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ برطانیہ کا اصل مقصد کیا ہے۔

مسلم لیگ کے اِسی اجلاس مین مولوی فضل الحق (۱۸۷۳ء۔۱۹٦۲ء) نے برطانیہ کو

وارننگ دی کہ وہ مسئلہ خلافت جیسے مسلمانوں کے اندرونی معاملات میں ٹانگ نہ اڑائے۔ مولوی فضل الحق نے یہ بھی واضح کردیا کہ برطانیہ نے شریفِ مکہ کو بغاوت پر اُکسا کر فاش غلطی کی ہے اور یہ کہ ایک باغی کبھی بھی مسلمانوں کا خلیفہ نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں یہ بھی کہا کہ مسلمان ممالک کی سلامتی عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے خطرے میں پڑگئی ہے۔ خاص طور پر سامراجی طاقتیں ترکی کے حصے بخرے کرنا چاہتی ہیں۔ اِس موقع پر مولوی فضل الحق نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ مسلمانوں کے مقدس مقامات کو عثمانی سلطان کی حکمرانی سے دور نہ کیا جائے۔

درحقیقت جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا۔ وہ کس قدر غیظ وغضب کے عالم میں تھے۔ اِس کا اندازا شیخ حسین قدوائی کے اُس مراسلے سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۲۴، دسمبر ۱۹۱۹ء کو روزنامہ ''دی ٹائمز'' لندن کو ارسال کیا جس میں انہوں نے انگریزوں کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''ایک ایسے دور میں جبکہ ایک بے مثال قوم (ترک) ذلیل وخوار ہورہی ہے ایک ایسی سلطنت (سلطنتِ عثمانیہ) کو جس کی تاریخ شاندار فتوحات سے بھری ہوئی ہے منتشر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور ایک عظیم الشان مذہب (اسلام) کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی جارہی ہے، آپ یقیناً ہم سے خاموش رہنے کی توقع نہیں کرسکتے۔ کیا کسی بھی باعزت قوم کا رویہ ہم سے مختلف ہوسکتا ہے۔؟'' (۷)

مرکزی خلافت کمیٹی اِک نئی آواز

لیکن جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی زبانی اور تحریری احتجاجات کا جب انگریز حکمرانوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو انہیں اپنی آواز کو زیادہ موثر طریقے سے سنانے کیلئے ایک تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ''لکھنو کی مسلم کانفرنس میں اس خیال پر گفتگو ہوئی کہ خلافت، حرمین شریفین اور مقاماتِ مقدسہ کے تحفظ کیلئے کوئی مستقل نظام ہونا چاہیے۔ بمبئی کے نمائندوں نے یہ اطلاع دی کہ بمبئی کے سیٹھوں نے بمبئی میں ''مجلس خلافت'' کے نام سے کوئی انجمن قائم کی

ہے۔ اِس کو ''آل انڈیا انجمن'' قرار دے دیا جائے۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ آل انڈیا سینٹر خلافت کمیٹی قائم کی جائے جس کا مرکز بمبئی میں ہو۔'' (۸) چنانچہ لکھنو اجلاس میں مرکزی خلافت کمیٹی کے قیام کی تجویز پر عمل درآمد اور پہلے سے قائم مختلف علاقائی خلافت کمیٹیوں کو ایک مرکزی تنظیم میں مربوط کرکے ''مرکزی خلافت کمیٹی'' قائم کرنے کا فیصلہ ۲۲، ستمبر ۱۹۱۹ء کو بمبئی اجلاس میں کیا گیا۔ (۹) اسی اجلاس میں مرکزی خلافت کمیٹی کا دستور اور اغراض ومقاصد بھی طے کیے گئے۔'' (۱۰)

تحریک خلافت نے ہندوستان کی سیاست اور تحریکِ آزادی میں ایک شدید جوش اور ولولہ پیدا کردیا۔ مسلمانوں نے اُس وقت محسوس کیا کہ اگر ہندوستان آزاد ہوگیا تو مسلم ممالک میں بھی آزادی کا جذبہ پیدا ہوجائے گا اور وہ بھی ایک مرحلے پر آزاد ہوسکیں گے یہ وہ بنیادی مقصد تھا جس نے انہیں تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے پر آمادہ کیا۔

ہندو مسلم تعلقات کا دورِ نو

اگرچہ لکھنو پیکٹ (۱۹۱۶ء) کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کا مجموعی رجحان پہلے ہی میل ملاپ اور یگانگت کی طرف مائل ہوچکا تھا۔ ویسے بھی مسلمانانِ ہند کی یہ نفسیات رہی کہ وہ اظہارِ خلوص اور اغیار پر اعتبار و بھروسے کے معاملے میں بہت زیادہ پُرجوش اور جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ رولٹ ایکٹ (جو ۱۸، مارچ ۱۹۱۹ء کو منظور ہوا) کے خلاف عوامی احتجاج اور جلیانوالہ باغ (۱۳، اپریل ۱۹۱۹ء) کے قتل عام نے ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کو اور بھی قریب کردیا تھا۔ خود ہندو بھی اِس بات پر بہت خوش تھے کہ رولٹ ایکٹ کے عوامی احتجاج میں، اِس کے باوجود کہ اُن کے لیڈر مسٹر گاندھی ہیں، مسلمان پورا پورا ساتھ دے رہے ہیں۔

دوسری طرف ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان، عباس طیب جی، مسٹر عمر سوہانی، ڈاکٹر انصاری، مولانا حسرت موہانی (۱۸۷۸ء۔۱۹۵۱ء)، سیٹھ یعقوب حسن اور چودھری خلیق الزماں (۱۸۸۹ء۔۱۹۷۳ء) وغیرہ جو پہلے ہی ستیہ گرہ (یعنی ظلم کے خلاف عوامی سطح پر عدم تشدد یا اہنسا پر مبنی منظم سول نافرمانی) کے معاہدے پر دستخط کرکے مسلمانوں کو ہندوؤں کے خاصے قریب کرچکے تھے، نے اِس موقع پر تحفظ حرمین شریفین کو بطور حربہ استعمال کرتے ہوئے

مسلمانانِ ہند کو ہندو حمایت کے حصول کے بدلے گائے کی قربانی ترک کرنے کا مشورہ دیا۔
چنانچہ سیّد سلیمان اشرف نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

''عام طور پر مسلمانوں کے سامنے یہی پیش کیا گیا کہ ہم خلافت اور مقاماتِ مقدسہ کیلئے انگریزوں سے مقابلہ کرتے ہیں اور اُن کے مظالم کا عوض لیتے ہیں ہندو ہمارا ساتھ دیتے ہیں تم بیت اللہ اور حرمِ رسول ﷺ کو بچالو گے اگر گائے کی قربانی موقوف کردو۔''

پھر آپ آگے گاندھی اور اُس کے فکر وفلسفہ کی حمایت کرنیوالوں کی گرفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسٹر گاندھی اور اُن کے چار پانچ متبعین اس وقت اِس طرح غوغا و ہنگامہ برپا کررہے ہیں کہ حق کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ آج کفر کا فتویٰ اُن کی بارگاہ سے صادر ہورہا ہے جو خود حقیقتِ کفر وشرک اور ایمان واسلام دونوں سے ناآشنا ہیں۔''(۱۱)

مذہب کا بطور ہتھیار استعمال

قائدینِ جمعیت العلماء اور خلافت کمیٹی کے اِس طریقہ کار کو پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے نپولین کی اُس پالیسی سے بھی تشبیہ دی جس میں اُس نے اپنی قوم کو دھوکہ دینے کیلئے اپنے مذہب اور مذہبی رجحان کو بطور ہتھیار استعمال کیا تھا۔ نپولین جانتا تھا کہ تالیفِ قلب کا یہی وہ واحد ذریعہ ہے جسے وسعت، ہمہ گیری اور عوام میں جلد پزیرائی کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ تحریکِ خلافت کے قائدین نے جب اسی پالیسی کا اعادہ کیا اور مسئلہ خلافت جیسے مذہبی معاملے کو مسلمانانِ ہند کے جذبات برانگیختہ کرنے کیلئے استعمال کیا تو سیّد سلیمان اشرف نے اِس موقع پر اُن کی سخت گرفت کی اور اِسے اپنے آپ کو ہندوؤں کی اطاعت و غلامی میں دینے سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا:

''نپولین کی اسی پالیسی کو مدنظر رکھ کر اُس وقت لیڈروں نے بھی کانگریس (کے مقاصد) کی تکمیل کیلئے جو مجلس منعقد فرمائی اُسے دلکش

ودل گیر بنانے کیلئے خلافت کمیٹی کا لقب دیا تاکہ نہایت سہولت سے مسلمانانِ ہندوستان کی گردنیں ہندوؤں کی غلامی واطاعت میں سربسجود ہوجائیں۔ برعکس نہند نام زنگی کافور۔''(۱۲)

آپ کے نزدیک رہبرانِ قوم کا یہ طرزِ عمل کسی طور لائق ستائش نہ تھا۔ آپ قوم کی اِس حرکت پر بھی سخت نالاں تھے کہ لیڈرانِ قوم کی اندھی تقلید نے اُنہیں فہم وفراست اور عقل وخرد سے محروم کردیا ہے اور وہ اپنے نفع ونقصان سے بے نیاز لیڈروں کے پیچھے دوڑے چلے جارہے ہیں۔ سیّد سلیمان اشرف اِس فدویانہ عمل کو مسلمانانِ ہند کیلئے سخت نقصان دہ اور مضر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اِس غلطی کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا:

''ایک مدت سے قوم کی باگ چند ذی اثر اور ذی وجاہت اشخاص کے ہاتھوں میں رہنے کا معمول و دستور ہے قوم اِسی کی خوگر ہورہی ہے کہ اعضا اِس کے شل ہوں اور دماغ سے اِس کے جمود کا پردہ اُٹھنے نہ پائے۔ لیڈر جو کچھ ارشاد فرمائیں قوم بے سوچے سمجھے آمین کہہ دے۔ لیڈروں کا یہ فرض ہے کہ غلامی اور ذلت کا طوق گراں سے گراں تر اور بوجھل سے بوجھل تیار کریں اور اپنی قوم کی گردنوں میں ڈال کر اُن کا گلا گھونٹتے رہیں اور پھر اِس طرح مٹا دینے اور فنا کردینے کا خراج بھی قوم سے وصول کریں۔''(۱۳)

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک مسلمان رہنماؤں کا یہ طرزِ عمل دراصل اُسی سحر و افسوں کا شاخسانہ تھا:

''جو اخص لیڈرانِ ہنود نے بصیغۂ راز لیڈرانِ مسلم کے کانوں میں پھونک دیا تھا۔''(۱۴)

ہندو مسلم اتحاد، قربت ودوستی کا نقطۂ کمال

چنانچہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اِس افہام وتفہیم اور قربت کو اُس وقت مزید تقویت حاصل ہوئی جب نیم عریاں، نحیف ولاغر اور تار کا چشمہ لگانے والے گاندھی نے اپنے

پیروؤں اور حامیوں کو بتایا کہ وہ بھی مجوزہ خلافت کانفرنس میں شریک ہوں۔ گاندھی نے کہا کہ:

"میں اِن الزامات پر یقین نہیں رکھتا کہ ترک کمزور، ظالم اور غیر ہنرمند ہیں۔ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرنا ہمارا مقدس فریضہ ہے۔ گاندھی نے مسلمانوں کی اِس رائے کی پوری حمایت کی کہ ترکی اور ترک انصاف پر ہیں اور اُن کو اُن کا حق ملنا چاہیے۔" (۱۵)

گاندھی کی خلافت اور خلیفہ سے متعلق مسلمانوں کے خدشات کی حمایت، ساتھ دینے کے ظاہری عمل اور ہندوؤں کی تحریک میں شمولیت نے مسلمانوں کو گاندھی اور ہندوؤں کے اِس قدر قریب کر دیا کہ اِس کا نتیجہ ہندو مسلم اتحاد کی صورت میں سامنے آیا۔ جو کسی طور بھی برعظیم کے مسلم مفادات کیلئے سودمند نہ تھا۔

سیّد سلیمان اشرف نے اِس خطرے کو بروقت محسوس کیا اور مسلمانانِ ہند کو گاندھی کی سازش اور خطرناک عزائم سے آگاہی دیتے ہوئے لکھا:

"مسٹر گاندھی کی دوربین نگاہوں نے جب دیکھا کہ مادرِ وطن کا نام لے کر مسلمانوں کو من حیث القوم حرکت میں نہیں لایا جاسکتا چاہے ذی وجاہت یا شہرت پسند (افراد اُن کے ساتھ) شریک ہوجائیں ......تو وہ ہندوؤں کے سامنے آزادیِ ہند کو شفیع لائے اور مسلمانوں کے سامنے مسئلہ خلافت پیش کیا اور اِس ایک مرکز پر کہ انگریزوں کا وجود دونوں کی گرفتاری اور پائمالی کا موجب ہے ہندو مسلم دونوں متضاد قوموں کا اجتماع کردیا۔"

آپ گاندھی کے شاطرانہ کردار کو مزید نمایاں کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

"مسٹر گاندھی کی کمال ہنرمندی کا اظہار اِس حکیمانہ طرزِ عمل سے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو برٹش گورنمنٹ کے مقابلہ میں صرف انہیں مقاصد واغراض کے تکملہ اور تحصیل کیلئے لا کھڑا کر دیا جس سے ہندوستان کی آزادی برسوں کی راہ گھنٹوں میں طے کرلے یہ ملک جس قدر آزادی

سے قریب ہوتا جائے اُسی قدر خود مسلمانوں ہی کے جدوجہد سے ہندوؤں کی حکومت یوماً فیوماً قوی ہوتی جائے اور مسلمانوں کی ہستی ہندوستان میں مٹتے مٹتے شودر کے مرتبہ پر پہنچ جائے۔" (۱۶)

گاندھی کی یہ حکمتِ عملی دراصل ایک منظم منصوبہ بندی اور اُس مسلم دشمن پالیسی کا حصہ تھی۔ جس کا مقصد ہندو غلبہ اور حکمرانی تھا۔ پروفیسر سلیمان اشرف نے گاندھی اور ہندوؤں کی اِس منصوبہ بندی کو قبل از وقت محسوس ہی نہیں کیا بلکہ اُسے اپنی کتاب "النور" میں بے نقاب کرتے ہوئے لکھا:

"ایسی قوت جس کا اپنے میں نہ پایا جانا اپنے ضعف کا موجب ہو تو پہلے کوشش اُس قوت کو حاصل کرنے کی ہونی چاہیے لیکن اگر اُس کا حصول متعذر (مشکل) ہو تو پھر اُس قوت کو فنا کردینا ضروری ہے تاکہ کسی وقت اُس سے تصادم ہوکر اپنے ضعیف و مضمحل ہوجانے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ ہندوؤں نے اِس اصل کو سمجھا اور کمال دانش مندی سے برتا۔" (۱۷)

اور ایک منظم حکمت عملی کے تحت دولت وثروت، تعلیم وترقی اور سیاسی میدان میں اپنے آپ کو مضبوط و مستحکم کیا۔ یہ ہندو لیڈروں کی بیدار مغزی اور وہ جامع منصوبہ بندی تھی جسے سیّد سلیمان اشرف "النور" صفحہ ۳۲-۳۱، پر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوؤں نے جب مسلمانوں کی نہ صرف کنارہ کشی بلکہ کانگریس کے مقاصد وطرزِ عمل سے مخالفت و بیزاری دیکھی ......تو انہوں نے نہایت عزم واستقلال سے حکیمانہ انداز پر اپنی قومی رفتار کی حرکت تین سمتوں میں منقسم کردی۔ ایک جماعت نے اقتصادیات کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اکتسابِ دولت کے جس قدر ذرائع اور وسائل تھے انہیں اپنے ہاتھوں میں لے لینے میں ساعی وکوشاں ہوئے ......(اور) ساہوکاری کو اِس سلیقہ سے انجام دیا کہ پچاس برس کے عرصے میں مسلمانوں کی تقریباً ساری دولت سمٹ کر ہندوؤں کی ملکیت ہوگئی۔ دوسری جماعت

نے تعلیم اور اُس کے ثمرات کی طرف قدم بڑھایا اور اِس راہ میں بھی انہیں بے انتہا کامیابی حاصل ہوئی...... تعلیم کے بعد ملازمت اور علمی پیشہ کا میدان سامنے آتا ہے یہاں بھی ہندوؤں کا مقابلہ مسلمانوں سے وہی نتیجہ دیتا ہے جو سابق کے دو مقابلوں میں حاصل ہو چکا ہے۔ تیسری جماعت نے عملاً سیاسیات کی طرف اپنا قدم بڑھایا اور نہایت عزم و استقلال سے اِس حوصلہ شکن صبر آزما راہ پر چلنے لگے۔"

مگر سیاست کا میدان جسم وجاں کی عملی قربانیوں کا متقاضی تھا۔ جس سے ہندوؤں کا دامن ابھی تک خالی تھا۔ ضرورت تھی کہ اپنی سیاسی دکانداری کو چمکانے اور بامِ عروج تک پہنچانے کیلئے اِس خلا کو پُر کیا جائے۔ چنانچہ ہندو شاطروں نے خود عملی قربانیاں دینے کے بجائے "قوت متعذر کو مٹا دینے والی" حکمت عملی اپنائی اور مسلمانوں کو تحفظِ خلافت اور حصول آزادی کا جھانسہ دے کر سوراج کی قربان گاہ تک لے گئے۔ یہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہوا، آیئے سیّد سلیمان اشرف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ بیان کرتے ہیں:

"حکومت کی ہمکناری جس چڑھاوے اور قربانی کی خواہاں تھی اب تک ہندوؤں کے ہاتھوں نے وہ نذرانہ پیش نہیں کیا تھا...... ضرورت تھی کہ بہت سی جانیں حکومت کی دیبی پر بھینٹ چڑھا دی جائیں۔ سیاست کے سارے منازل میں یہ منزل سخت تھی۔ قرب شوق کی آگ بھڑکا رہا تھا اور جان کی اضاعت دامن پکڑتی تھی۔ نکمی اور رائیگاں جانوں کی تلاش تھی۔ بالآخر امعان نظر اور تعمق فکر کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ تینوں جماعتیں اپنے سی سالہ کمائے ہوئے سرمایہ کی اِس طرز خاص سے ایک جھلک مسلمانوں کو دکھلائیں کہ اُن کی نگاہ خیرہ اور عقول حیرت زدہ ہو جائیں۔ (اور) کچھ اپنا خیر و شر انہیں نہ سجھائی دے، نہ سمجھ آئے، ہاں اِس پراگندگی حواس میں اپنی رہی سہی ہستی کھو بیٹھیں۔ اِس عمل سے قربانی کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی اور یہ پہلو کا کانٹا (وجود مسلم)

بھی نکل جائے گا۔" (۱۸)

سلیمان اشرف اور اقبالؒ کے افکار و نظریات میں یکسانیت

اِس مقام پر قابل توجہ اَمر یہ ہے کہ ہمیں علامہ اقبالؒ بھی سیّد سلیمان اشرف کے افکار و نظریات کے حامی نظر آتے ہیں۔ اور اقبالؒ کے جذبات و احساسات بھی وہی محسوس ہوتے ہیں جس کا اظہار سیّد سلیمان اشرف پہلے ہی کر چکے تھے۔ اِس تحریک سے علامہ اقبالؒ کے اختلاف کی بنیادی وجہ اِس کی قیادت کا گاندھی کے ہاتھ میں ہونا تھا۔ اُن کے خیال میں ہندو مسلم اتحاد غیر فطری اور ہمیشہ قائم رہنے والا نہیں تھا۔ اسی وجہ سے اُنہوں نے جنوری ۱۹۲۳ء میں تشکیل دی جانے والی جماعت "کانگریس خلافت سوراج پارٹی" میں شرکت سے انکار کر دیا تھا جو موتی لال نہرو اور سی، آر، داس نے بنائی تھی۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک یہی وہ عوامل تھے جس کی وجہ سے انہوں نے مسئلہ تحفظ خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کے تعاون اور اِس تحریک میں شمولیت کے مخالف کی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ ایسے اشتراک عمل اور مسلمانوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر متحدہ قومیت کے داعی اُن کی علیحدہ ملّی حیثیت کو ختم نہ کر دیں۔ دراصل یہ سیّد سلیمان اشرف کے ہی موقف کا اعادہ تھا۔

یہی وجہ تھی جو اقبالؒ کے نزدیک اِس اتحاد کا مطلب ہندوؤں کے ہاتھوں اسلام کی فروخت قرار پایا۔ چنانچہ اُنہوں نے ابتداء ہی میں صوبائی خلافت کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا۔ اور ۱۸، مارچ ۱۹۲۸ء کو سیّد سلیمان ندوی کے نام اپنے مکتوب میں مستعفی ہونے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھا:

"اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا گوارا نہیں ہوسکتا۔ افسوس اہل خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کیلئے بھی قبول نہیں کرسکتا۔" (۱۹)

روزگار فقیر جلد دوم (صفحہ ۱۱۹۔۱۱۸، مطبوعہ آتش فشاں لاہور) میں فقیر سیّد وحید

الدین علامہ اقبالؒ کی خلافت کمیٹی سے استعفے کے حوالے سے ایک اور وجہ بھی بیان کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا کہ تحریکِ خلافت کے لیڈر اور ممبران ناقابل بھروسہ اور اعتبار کے لائق نہ تھے۔ فقیر سیّد وحیدالدین لکھتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

''خلافت کمیٹی کے بعض ممبر ہر جگہ قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ وہ بظاہر جوشیلے مسلمان معلوم ہوتے ہیں لیکن در باطن اخوان الشیاطین ہیں۔ اسی وجہ سے میں نے خلافت کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ اِس استعفے کی وجوہ اِس قابل نہ تھے کہ پبلک کے سامنے پیش کیے جاتے لیکن اگر پیش کیے جاتے تو لوگوں کو سخت حیرانی ہوتی۔''

علامہ اقبال نہ صرف اِس تحریک کے حق میں نہیں تھے بلکہ سیّد سلیمان اشرف کی طرح اِس کو مسلمانوں کیلئے خطرناک خیال کرتے تھے۔ مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان، صفحہ ۲۷، پر اپنے اِن خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی ہے اور جو کچھ اِس کے بعض ممبروں کا مقصد تھا اُس کے اعتبار سے تو اِس کمیٹی کا وجود میری رائے میں مسلمانوں کیلئے خطرناک تھا۔''

یہ برعظیم کی مذہبی و سیاسی تاریخ میں پہلا اور آخری دور تھا جس میں ہندو مسلم اتحاد اپنے نقطہ کمال پر تھا۔ پروفیسر احمد سعید کے مطابق:

''ہندوستان کی تمام تاریخ میں یہ دور پہلا اور آخری دور تھا جس میں ہندو مسلم اتحاد اپنے عروج پر تھا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی دلجوئی حاصل کرنے کیلئے ہر ممکن کوشش کی۔ مسلمان رضا کاروں نے رام لیلا کا بندوبست کیا۔ مندروں میں دعائیں مانگی۔ وید کو الہامی کتاب تسلیم کیا۔ رامائن کی پوجا میں شرکت کی۔ مسلمانوں نے اپنے ماتھے پر تلک لگائے۔ گنگا پر پھول اور بتاشے چڑھائے۔ بار بار اِس بات کا اعلان کیا گیا کہ گاندھی مستحق نبوت تھا۔ اور یہ تک کہا گیا کہ ''اگر نبوت ختم نہ ہوتی

تو گاندھی نبی ہوتا'' (العیاذ باللہ) گائے کی قربانی کو موقوف کرنے کی تجاویز پیش کی گئیں۔ اور سب سے زیادہ غضب یہ کیا کہ دہلی کی جامع مسجد میں منبر رسول پر ایک متشدد ہندو شردھانند سے تقریر کروائی جس نے بعد میں مسلمانوں کو ہندو بنانے کیلئے شدھی تحریک کا آغاز کیا۔'' (۲۰)

سیّد سلیمان اشرف کا نعرہ حق

اُس وقت سیّد سلیمان اشرف نے غیر شرعی حرکات پر ہندو مسلم اتحاد کے حامی علماء کو اُن کا فرضِ منصبی یاد دلایا اور اِس اَمر پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کی جانب سے اِن اعمالِ قبیحہ کی انجام دہی پر وہ کیوں مہر برلب ہیں۔ آپ کے نزدیک عوام الناس کے اِس غیر شرعی طرزِ عمل پر علماء کی یہ خاموشی تائید وحمایت کے مترادف تھی۔ چنانچہ آپ نے اس سکوت، چشم پوشی اور خاموشی کو جواز واستحسان قرار دیتے ہوئے لکھا:

''علماء موسسین اتحاد ہندو و مسلم کا یہ فرض ہے کہ اتحاد کے حدود متعین فرمائیں۔ عوام کو قشقہ لگانے اور مندروں میں جا کر ریوڑیاں بتوں پر چڑھانے سے منع کریں اور اِن افعال کی شناعت کھلے لفظوں میں بیان فرمائیں ورنہ ایمان کی بربادی کا خطرہ ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ فقیر کی اِس التماس کی علمائے سیاسی کی خدمت میں بھی ذرہ برابر شنوائی نہ ہوئی۔ آج تک وہی سکوت ہے، وہی چشم پوشی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رہے سہے اعمال قبیحہ مسلمانوں نے تلک آنجہانی (بال گنگا دھر تلک ایک قوم پرست ہندو لیڈر تھا) کی مصنوعی لاش کے موقع پر ادا کیے اور علمائے سیاسی نے پھر اپنے سکوت سے اِن اُمور کے جواز واستحسان پر تازہ مہر ثبت کردی۔'' (۲۱)

دیرینہ آرزوؤں کی تکمیل کا خواب

دوسری جانب ہندو مسلم تعلقات کے اِس دورِ نو نے گاندھی کی اُمیدوں کو جِلا بخشی۔ وہ پہلے ہی سوراج (ہندو راج) کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اِس موقع پر مسلم تشخص کو

دھندلانے اور مسلم شناخت مٹانے کی صدیوں پرانی ہندوؤں کی دیرینہ آرزو گاندھی کو پوری ہوتی نظر آنے لگی۔ گاندھی جو اِس سے قبل مارچ ۱۹۱۸ء میں ڈاکٹر انصاری سے ملاقات کر کے یہ تجویز بھی دے چکا تھا کہ:

''ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی مقصد یعنی آزادی کیلئے جدوجہد کر رہے ہیں پھر وہ کیوں نہ آپس میں تعاون کریں۔'' (۲۲)

مسلم رہنماؤں نے بھی محسوس کیا کہ اگر ہندو اور خصوصاً گاندھی اُن کے ساتھ تعاون کریں تو اُن کے مطالبات اور پروگرام کو تقویت حاصل ہوگی۔ چنانچہ جہاں گاندھی نے مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا وہاں قائدین جمیعت وخلافت نے بھی اِس سلسلے میں اپنی کوششیں تیز کر دیں۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اِس میں مسلمانانِ ہند کا فائدہ ہے یا سراسر خسارہ۔ بس شترِ بے مہار کی طرح گاندھی کی پیروی میں جت گئے۔ قاضی محمد عبدالغفار اُس وقت کے حالات کی منظرکشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب پنجاب کے مظالم کی خونچکاں داستان ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے دلوں کو بے چین کر رہی تھی اُسی زمانہ میں خلافت اور اماکن مقدسہ کا مسئلہ بھی مسلمانوں کیلئے سخت تردّد کا باعث بن گیا۔ اماکن مقدسہ اور خلیفہ کے متعلق برطانوی وزراء کے تمام وعدے جھوٹے ثابت ہو چکے تھے اور صلح کانفرنس کی جو خبریں ہندوستان آ رہی تھیں اُن سے واضح ہوتا تھا کہ نہ تو ترکوں کیلئے آزادی اور عزت کا کوئی راستہ کھلا رکھا گیا ہے اور نہ جزیزۃ العرب کے متعلق برطانوی حکومت کے وعدوں کے پورا کئے جانے کے کوئی آثار ظاہر ہوتے ہیں اب عام مسلمانوں اور اُن کے لیڈروں کو یقین ہو گیا تھا کہ اگر انتہائی قربانیاں نہ کی گئیں تو اِن مسائل کا خاتمہ بہت بری طرح ہوگا۔ شوکت علی اور محمد علی ہنوز چھنڈواڑہ میں نظر بند تھے، مولانا ابوالکلام آزاد بھی مقید تھے۔ مسلمان لیڈروں میں صرف ڈاکٹر انصاری، حکیم صاحب اور مولانا

عبدالباری ہی ایسے تھے جو مہاتما گاندھی، مسٹر تلک اور بعض دوسرے لیڈروں سے اِن مسائل کے متعلق مشورے کر رہے تھے۔ مہاتما گاندھی اِس بات پر آمادہ تھے کہ خلافت کے مسئلہ کو ہندو مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ بنا کر خلافت اور مظالم پنجاب اور آزادی وطن، سب کیلئے ایک ہی محاذ قائم کیا جائے۔'' (۲۳)

تجاویز و یقین دہانیاں گاندھی کے ہتھکنڈے

مسلمان عمائدین گاندھی کی مندرجہ بالا تجویز سے متفق ہو گئے۔ اور ۲۳، نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں ہندو مسلم رہنماؤں کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد ہوا۔ مولوی فضل الحق کی صدارت میں ''خلافت کانفرنس'' کے نام سے بلائے جانے والے اِس اجلاس میں گاندھی اور کئی ممتاز ہندو لیڈر بھی شریک ہوئے۔ مولوی فضل الحق نے خطبہ صدارت میں ہندوستان کی غیر مسلم اقوام سے تائید حاصل کرنے کی مصلحت پر زور دیا۔ اِس کانفرنس میں مشہد اور دیگر مقامات مقدسہ پر اتحادی افواج کی زبردستیوں پر احتجاج کیا گیا اور مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ جشن صلح میں شریک نہ ہوں بلکہ اُس کے خلاف جلسے کریں۔ گاندھی کے مشورے کے مطابق مسلمان حکومت سے عدم تعاون کریں اور اگر صلح کا فیصلہ مسلمانوں کی منشا کے مطابق نہ ہو تو ولایتی مال کا بھی بائیکاٹ کیا جائے۔

اگلے روز ۲۴، نومبر ۱۹۱۹ء کو مجلس خلافت اور کانگریس کا ایک مشترکہ اجلاس گاندھی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں گاندھی کی تعریف وتوصیف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے گئے۔ بقول سیّد سلیمان اشرف:

''علمائے سیاسی نے آپ (گاندھی) کے تشکر وامتنان میں وہ سب کچھ ارشاد فرمایا جس کا جذبہ عقیدت اور جوش اتباع وتقلید مقتضی تھا۔'' (۲۴)

قائدین خلافت کے اِس حیرت انگیز طرزِ عمل پر آپ نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''الٰہی یہ مسلمانوں کی عقل کو کیا ہو گیا ہے جواب عالم الغیب قادرِ مطلق،

سمیع البصیر سے بھی پالیسی کرنے لگے ہیں۔" (۲۵)

اِس اجلاس میں گاندھی نے تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ یقین دلایا کہ خلافت کے مسئلہ میں مسلمانوں کے ساتھ اُن کے ہندو بھائی ہرطرح آمادۂ رفاقت ہیں۔ اُس نے مسلمانوں کو اعتماد میں لینے کیلئے اردو میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"ہندو اور مسلمان ایک ہی قوم ہیں۔ ہم مسلمانوں کو اُن کی مشکل گھڑی میں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔" (۲۶)

گاندھی نے ہندوؤں سے یہ بھی درخواست کی کہ:

"وہ اُس وقت تک جشن صلح میں شریک نہ ہوں جب تک اُنہیں اِس بات کا پورا اطمینان نہ دلایا جائے کہ سلطنت عثمانیہ کے بٹوارے اور خلافت کے برقرار رکھنے میں مسلمانوں کے جذبات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا۔" (۲۷)

ہندو شاطرانہ سیاست و جفا کاریوں کی نقاب کشائی

یہ دراصل گاندھی کی ایک شاطرانہ چال تھی۔ جسے سیّد سلیمان اشرف نے بروقت محسوس کیا اور ہندو لیڈروں کی منافقانہ سیاست، اسلام دشمن سرگرمیوں اور جفا کاریوں کو سیاق و سباق کے ساتھ بے نقاب کرتے ہوئے "النور" (صفحہ ۳۔۴، اور ۵) پر لکھا:

"ہندو مسلمانوں کے شعارِ دین کی توہین اور ارکان مذہبی کے نیست و نابود کرنے میں اپنی پوری جسمانی اور دماغی قوت گوناگوں طور پر صرف کرنے میں پچاس برس سے مسلسل ساعی و کوشاں ہیں...... ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے بعد مفاہمہ اتحاد کا آوازہ بلند کیا اُس وقت مسلمانوں کی خلافتِ مقدسہ یورپ کے نرغہ میں پھنسی ہوئی تھی اس لیے مناسب یہی تھا کہ مسلمانانِ ہند مقامی اور وطنی نزاعات کو صلح اور آشتی کے ساتھ طے کرلیں اور پوری توجہ سے خلافت اور مقامات مقدسہ کی حفاظت پر تدابیر سوچ کر عمل آراء ہوں۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے اِس

عالم پریشانی سے بغیر فائدہ حاصل کیے کیونکر رہ سکتے تھے...... ہندوؤں کا یہی مقصد تھا کہ مسلمانانِ ہند اپنے مصائب میں پھنس کر خدمتِ خلافت سے محروم رہ جائیں اور یورپ کی وہ سلطنتیں جو اسلامی مرکز پر حملہ آور ہیں ہندوؤں کے اِس فتنہ و فساد سے مظاہرہ و اعانت کا فائدہ حاصل کریں...... اِس انتہائی ایامِ مصیبت میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں اتحادی سلطنتیں اور اُن کے ملکی بھائی (ہندو) دونوں برابر کے شریک و سہیم (حصے دار) تھے۔"

اُس وقت سیّد سلیمان اشرف نے جو ہنود و یہود اور نصاریٰ کو اسلام اور مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے، ایک بیدار مغز قومی رہنماء کا کردار ادا کیا۔ اور گاندھی کی مکارانہ سیاست کے پس پردہ عزائم سے نہ صرف پردہ اٹھایا بلکہ اُس کی اصل ہندوآنہ فطرت کو نمایاں کرتے ہوئے صاف صاف لکھا:

"(جب) گاندھی صاحب نے مسلمانوں کے اِس جذبہ شہادت میں رمقِ حیات باقی پائی اور کمالِ دانشمندی سے مسلمانوں کے اِس جذبہ کو آہستہ آہستہ بھڑکانا شروع کیا۔ مسلمان یہ سمجھے کہ سچ مچ یہ ہمارے دوست ہیں اور انہیں ہماری بربادی پر اِس قدر غم گساری و تاسف ہے کہ اپنا سر دینے پر تیار ہیں۔ حالانکہ جس شخص کا مذہب خود اُس کے مقاماتِ مقدسہ اور معابد کیلئے ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہ دیتا ہو وہ مسلمانوں کے مقاماتِ مقدسہ کیلئے کب تلوار اُٹھا سکتا ہے۔ لیکن افسوس مسلمانوں نے یہ نہ سمجھا کہ وہ سر دینا نہیں چاہتے ہیں بلکہ مسلمانوں کے سروں کی اُنہیں حاجت ہے یہ کہہ کر ایک کثیر تعداد میں اُسے مفت لیا چاہتے ہیں۔" (۲۸)

سیّد سلیمان اشرف کی اِس واضح تنبیہہ کے باوجود مسلمان زعماء گاندھی کے مکرو فریب اور جھانسے میں آ گئے۔ خود گاندھی نے بھی مسلمانوں کو دھوکہ دینے کیلئے مسئلہ خلافت

میں مسلمانوں سے بڑھ کر دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ بقول قاضی محمد عدیل عباسی:

"مہاتما گاندھی نے مسئلہ خلافت سے دلچسپی ظاہر کی اور نہ صرف دلچسپی ظاہر کی بلکہ اِس میں شرکت کا وعدہ فرمایا اور نہ صرف شرکت کا وعدہ فرمایا بلکہ اِس میں کود پڑے اور بہت جلد مسلمانوں کے تمام لیڈروں نے اُن کو اپنا لیڈر مان لیا۔" (۲۹) "اور مسلمانوں نے مہاتما جی پر وہ اعتبار و یقین دکھایا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔" (۳۰)

رہبرانِ قوم کا جذبۂ جنوں یا......

گاندھی کی یہ حمایت دراصل ایک ملمع کاری تھی۔ وہ ظاہراً مسلمانوں کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا کہ مسئلہ خلافت میں وہ مسلمانوں کے موقف کا نہ صرف حامی ہے بلکہ خلافت کی بقاء واستحکام کی جدوجہد میں بھی اُن کے ساتھ ہے۔ مگر اندورن خانہ اُس نے خلافت کا نعرہ سوراج کے حصول کیلئے لگایا اور خلافت کمیٹی کے رہنماؤں کو بھی اسی راہ پر ڈال دیا۔ اِس موقع پر سیّد سلیمان اشرف نے شدید دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

"کیا مصیبت ہے کہ مسلمانوں کو خلافت کا نام لے کر بھڑکایا گیا اور جب اُن میں گرمی پیدا ہوگئی تو اُن کے جوش کا رخ سوراج کی طرف پھیر دیا گیا۔ اب مسلمان ہیں کہ جوش میں بھرے جاتے ہیں اور ہندوستان کیلئے جان دینے پر آمادہ ہیں۔ اگر یہ اب بھی ہوش میں نہ آئے تو وہ دن سامنے آتا ہے جب کہ کاشی، اجودھیا اور دوارکا کی خاطر مسلمان اپنی جانیں دیں گے بجائے نعرۂ تکبیر گاندھی کی جے پکارتے ہوں گے سلف گورنمنٹ کی آخری سیڑھی ہندوستان اُسی وقت طے کرے گا جب کہ ایک کثیر تعداد میں مسلمانوں کی جانیں نذرانہ اجل ہونگی۔ ہندوستان کا فائدہ تو حتمی و یقینی ہے۔ رہا اسلام اور اسلامی خلافت اور مسلمانوں کے مقامات مقدسہ اُن کا خدا حافظ۔" (۳۱)

تاریخ کے اِس اہم اور نازک موقع پر جمعیت علمائے ہند اور خلافت کمیٹی کے اراکین

مسئلہ خلافت اور سلطنتِ عثمانیہ کے تحفظ کے جنوں میں جذبات کی رَو میں بہہ گئے۔ اُنہوں نے اپنے ہیجانی مضامین، زور خطابت اور ولولہ انگیز شاعری کے ذریعے مسلمانوں کے جذبات کو اِس قدر مشتعل کیا کہ اُنہیں اِس بات کا قطعاً ہوش نہ رہا کہ گاندھی اور اُس کی ہندو کانگریس کی یہ وقتی ہمدردیاں انہیں کس کسمپرسی کی منزل پر چھوڑ کر الگ ہوجائیں گی۔ اور اِس طرح گزشتہ چند سالوں میں جو تھوڑی بہت مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی ترقی ہوئی ہے اُسے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ مگر گاندھی کی مسلمانوں کو مشکل گھڑی میں تنہا نہ چھوڑنے اور مسئلہ خلافت میں اُن کے ساتھ ہرطرح آمادۂ رفاقت ہونے کی یقین دہانیوں سے مسلمان دھوکہ کھا گئے۔

حالانکہ برعظیم کی سیاسی تاریخ میں مسلمانانِ ہند کو جگانے اور اپنی صفیں درست کرنے کا یہ ایک بہترین موقع تھا۔ مگر رہبرانِ قوم وقت وحالات کے صحیح ادراک اور درست حکمت عملی اختیار کرنے سے قاصر رہے اور قوم کو خواب آور دوا پلا کر غفلت کی گہری نیند سلا دینے کے مرتکب ہوئے۔ اُنہوں نے تحریک کے مقصد اور نصب العین کو ہی پس پشت نہیں ڈالا بلکہ دین و مذہب کی اہمیت وافادیت کے ساتھ ساتھ قومی وملّی تقاضوں سے بھی صرف نظر کیا۔ سیّد سلیمان اشرف نے رہبرانِ قوم کے اِس جرم عظیم کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

"ایک ایسا موقع بیداری کا مسلمانوں کیلئے آیا تھا کہ رہنمایانِ قوم اگر چاہتے تو مسلمانوں کی آنکھوں سے نیند کا خمار بھی دفع ہوجاتا لیکن ہزار افسوس اِس بدنصیب قوم پر جسے بیداری کے بعد پھر خواب آور دوا پلادی گئی۔ وفد طبیہ کا قسطنطنیہ سے واپس آنا تھا کہ اسلامی جذبات خالص سیاسیاتِ ہند کی طرف پھیر دیئے گئے، میدانِ جنگ میں ایک لمحہ خاموشی کیا ہوئی کہ لیڈروں نے بھی خلافت کی خدمت گزاری کسی آئندہ موقع کیلئے اٹھا کر رکھدی...... نہ کوئی چندہ حرمین شریفین کیلئے جمع کیا گیا، نہ مسلمانوں کے سامنے خلافت کی ضرورت پیش کی گئی، نہ کوئی خالص مذہبی تحریک محض اسلامی نقطہ نظر سے سامنے لائی گئی گویا ساری تحریکیں موسمی تھیں جن کا وجود تغیر موسم کے ساتھ نیست ہوگیا۔ اِس

عرصے میں انجمنیں ہوتی رہیں، محفلوں میں بھی گرماگرمی رہی، لیکن
مذہب وملت کی کسمپرسی علیٰ حالہ رہی، اِس بیکس کی طرف کسی نے ایک
نگاہ بھی نہ ڈالی۔لیڈروں کی اب یہ کوشش تھی کہ مادرِ وطن جس کی
خدمت گزاری کی سعادت سے مدتوں محرومی رہی اُس کے حقوق ادا
کرنے کا وقت آگیا۔رہے مذہب کے حقوق (بشرطیکہ اُن کا وجود تسلیم
بھی کرلیا جائے) پھر دیکھا جائے گا۔ملکی بھائیوں کی غمگساری اور پشت
پناہی کے مقابل دینی بھائیوں کی امداد کا ذکر بھی گناہ ہے لہٰذا اُن سے
اعراض وچشم پوشی ہی چاہیے۔'' (۳۲)

دوسری طرف مسلم رہنماؤں کا یہ فدویانہ طرزِ عمل گاندھی کے مقاصد کیلئے بہت ہی سود مند ثابت ہوا۔وہ مسلمانوں کے جذبہ ایمانی سے خوب آگاہ تھا۔چنانچہ اُس نے مسئلہ خلافت سے مسلمانوں کی مذہبی وجذباتی وابستگی کو اپنے ناپاک مقاصد کیلئے استعمال کیا اور اِن کے قومی وملّی جذبات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔گاندھی ایک طرف سامراجیت کو ہلا دینے والی مسلمانوں کی تحریک کے بل بوتے پر برطانوی حکمرانوں کو آنکھیں دکھا رہا تھا۔تو دوسری طرف اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے انہیں مسلمانوں سے بدظن کرتے ہوئے یہ بھی کہہ رہا تھا کہ:

''میرا مذہب آپ سے خصومت رکھنے سے منع کرتا ہے میں اپنا ہاتھ
آپ پر کبھی نہ چلاؤں گا خواہ میرے پاس اتنی طاقت بھی ہوجائے، میں
خود مصیبت جھیل کر آپ پر فتح پانے کی اُمید رکھتا ہوں، علی برادران بے
شک اپنے ملک وملت کی حمایت میں تلوار اٹھائیں گے اگر اُن سے
ہوسکا تو۔'' (۳۳)

گاندھی نے انگریز حکمرانوں کو ڈرایا دھمکایا اور مسلمانوں سے متنفر کرنے کے ساتھ ساتھ جداگانہ مسلم تشخص وشناخت پر بھی شدید ضربیں لگائیں۔اُس کے اِس منافقانہ طرزِ عمل کو بیان کرتے ہوئے سیّد سلیمان اشرف نے لکھا:

''دیکھئے کس دانائی سے گاندھی صاحب اِس وقت محفوظ گیم کھیل رہے

ہیں اپنی طرف سے انگریزوں کو بہ تمام وکمال مطمئن بھی کرتے جاتے
ہیں اور اُسی کے ساتھ مسلمانوں سے بدظن کرتے ہوئے اور اُنہیں
مہیب وخونخوار شکل میں دکھاتے ہوئے تلوار اُٹھانے پر ترغیب وتحریص
بھی فرمارہے ہیں۔'' (۳۴)

یہ لمحہ فکریہ تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے اختیار کردہ تمام ترغیر شرعی حرکات وسکنات کے باوجود ہندو ذہنیت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی بلکہ گاندھی کے سحر نے فہم وادراک چھین کر اُنہیں عقل وخرد سے اِس قدر بیگانہ کردیا تھا کہ ایک طرف مسلمان زعماء کی جانب سے ہندوؤں کو خوش کرنے کی خاطر گائے کے بجائے بکری کی قربانی کا فتویٰ دیا جارہا تھا (۳۵) تو دوسری طرف خود گاندھی برملا اپنے عقائد ونظریات کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا:

''ہندو مذہب کے نقطۂ نظر سے گائے کی حفاظت بہت ضروری ہے۔
صرف ترکِ موالات ہی اُن کو سوراج حاصل کرنے میں مدد دے سکتا
ہے اور سوراج کے ذریعے وہ گائے کی حفاظت کرسکیں گے۔'' (۳۶)

مگر گاندھی کے اظہارِ عزائم کے باوجود مسلمان لیڈر اور عوام اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہندو پوری طرح معاون ومددگار اور اُن کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ستم ظریفی دیکھئے کہ تحریکِ خلافت کے دوران برعظیم کے دس کروڑ مسلمانوں کا مستقبل ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں دے دیا گیا جو کسی طرح بھی اُن کا ہمدرد وخیرخواہ نہ تھا اور جسے اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصہ قدیم و جدید

پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد نے گاندھی کے اِس اندازِ سیاست اور مسلمانوں کی کم عقلی پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب لکھا:

''۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے نازک دور میں مسٹر گاندھی نے نہ صرف
مسلمانوں کی، مسلم علماء کی بھی قیادت کی، سب نے آنکھیں بند کرکے

اُن کی متابقت کی اور اِس طرف سے غافل ہو گئے کہ جن مقاصد کیلئے گاندھی کوشاں تھے وہ مسلمانوں کے مقاصد سے مختلف تھے۔ مگر یہ بات جوش و جذبے کے ماحول میں سمجھ میں آنے والی نہ تھی اس لیے مسٹر گاندھی نے بڑی دانائی اور حکمت سے جذبات کے دھارے کو اُس سمت موڑ دیا، جو اُن کی منزل کا پتا دیتی تھی۔ انہوں نے حصول مقاصد کیلئے جو ذرائع اختیار کیے وہ مسلمانوں نے نہایت تشکر و امتنان کے ساتھ قبول کیے اور یہ نہ سمجھا کہ یہ ذرائع جہاں مسٹر گاندھی کو اُن کے مقاصد سے قریب تر لے جا رہے ہیں وہاں مسلمانوں کو اُن کے مفادات سے دور تر لے جا رہے ہیں۔'' (۳۷)

مسلمانوں کی بے خبری کا نوحہ

سیّد سلیمان اشرف مسلمانان ہند کی اس کم عقلی پر سخت افسردہ تھے۔ انہوں نے مسلمانان ہند کی اِس بے خبری پر نوحہ کناں ہوتے ہوئے لکھا:

''لا الٰہ الا اللہ، گاندھی نے کس حسن تدبیر سے مسلمانوں کو اپنا اور اپنے مذہب کا غلام بنالیا...... خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کی جگہ گاندھی کو دے دی گئی۔ اب یہ مدعیان اسلام اسی کی کوشش کر رہے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے گاندھی کی محبت و عظمت سے کوئی قلبِ مومن خالی نہ رہنے پائے۔'' (۳۸)

اِس مقام پر یہ تاریخی حقیقت پیش نظر رہے کہ تحریک خلافت سے قبل ہندوستان کی سیاسی بساط پر گاندھی کا کوئی کردار نہ تھا اور بہت کم لوگ اُس کے نام سے واقف تھے۔ لیکن تحریکِ خلافت کا آغاز گاندھی کی سیاسی زندگی کیلئے اس قدر سود مند ثابت ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہندوستان کے سیاسی افق پر نہ صرف چھا گیا بلکہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری جیسے ناموران قوم نے گاندھی کو اپنا رہبر و رہنما بھی تسلیم کر لیا۔ (۳۹) سیّد سلیمان اشرف نے مسلمانوں کی اِس خود سپردگی کو بیان کرتے ہوئے لکھا:

''گاندھی جس کا نام پانچ برس قبل ہندوستان کے کسی مسلمان کے علم میں بھی نہ تھا، خلیفۃ المسلمین کی جگہ آج اُس کے تقدس و عظمت کے فسانے کس کمال عقیدت سے مستورات تک میں کہے جاتے ہیں۔'' (۴۰)

اِن لیڈران قوم کی گاندھی سے عقیدت و محبت کا یہ عالم تھا کہ:

''کوئی (گاندھی کو) امام مہدی علیہ السلام کا مثل کہتا ہے، کوئی یہ کہتا ہے کہ نبوت اگر ختم نہ ہوگئی ہوتی تو گاندھی نبی ہوتا یعنی نبوت کے ماتحت جو سب سے بڑا رتبہ و منصب ہو سکتا ہے وہ گاندھی کا ہے، کوئی اپنے کو پسرو گاندھی کا کہتا ہے اور اسلام کی نجات کا اسی کے ہاتھوں سے یقین رکھتا ہے۔'' (۴۱)

آپ ''النور'' صفحہ ۲۱۷، پر مزید لکھتے ہیں:

''دنیا دیکھ رہی ہے کہ اس وقت گاندھی کی عظمت و محبت لیڈر حضرات کس کس نوعیت سے مسلمانوں کے دل میں پیدا کر رہے ہیں یہ صریح خلاف ورزی حکم الٰہی نہیں تو اور کیا ہے۔''

یہ لیڈران قوم گاندھی کی ہم نوائی اور مدح سرائی میں کس قدر رطب اللسان تھے، قاضی محمد عدیل عباسی کی زبانی سنتے ہیں۔ جو ''تحریک خلافت'' میں لکھتے ہیں کہ جمعیت علمائے ہند کے اِن:

''روشن خیال علماء نے آخر وقت تک کانگریس اور گاندھی جی کی تائید کرتے ہوئے ملک کی آزادی کیلئے دار و رسن کی دعوت دی اور مسلم لیگ کا تادم آخر مقابلہ کیا (وہ) تقسیم پر کبھی راضی نہ ہوئے۔'' (۴۲)

چنانچہ علماء کے اِس غیر اسلامی طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے پروفیسر محمد اسلم نے جمعیت علمائے ہند کو کانگریس کا مذہبی ونگ بھی قرار دیا۔ (۴۳)

قوم اور ہادیانِ قوم کو دعوتِ فکر و عمل

سیّد محمد سلیمان اشرف کے نزدیک لیڈرانِ قوم اور مسلمانانِ ہند کا ایک ہندو کی

متابقت و پیروی کرنا اور اُسے اپنا لیڈر بنانا انتہائی شرمناک اور قابل مذمت عمل تھا۔ چنانچہ آپ نے اِن ہادیانِ قوم کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے لکھا:

''تم نے مسلمانوں کے اِس سیزدہ صد سالہ عظمت کو اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالا ،آج تم نے سات کروڑ مسلمانوں کی دینی غیرت کو یوں ذلیل و خوار کیا کہ دیکھو غیر مسلم قومیں تم پر ہنستی ہیں نہ انگریزوں میں تمہاری ہیبت رہی نہ ہندوؤں پر تمہارا خوف۔تم اور تمہارا دین، تم اور تمہارا مذہب، تم اور تمہاری مذہبی تعلیم ،تم اور تمہارے دینی احکام سب کے سب نگاہ غیر میں ہیچ و فرومایہ (گھٹیا) ثابت ہوئے۔لیکن اِس کی تمہیں کیا پروا، جب کہ تقریباً ایک ملک کا خراج تمہارے گھروں میں پہنچ گیا، جب کہ ہزاروں انسان تمہیں اپنے دوشِ عقیدت پر لیے لیے پھرے، جب کہ ہر روز شاہانہ دستر خوان سے کام و زبان نئی نئی لذتیں لے رہی ہیں تو پھر اِن نعمائے خلد بریں کے مقابلہ میں اسلام کیا ہے اور ایمان کیا۔'' (۴۴)

آپ انہیں احساس دلاتے ہیں اور اسلامی تعلیمات سے صرفِ نظر کرنے پر سرزنش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اے سرمستان بادۂ لیڈری ،ذرا ہوش میں آ کر ہمیں بتاؤ کہ تم سوراج کیلئے اُٹھائے گئے تھے یا خلافت کیلئے تم نے ہندوؤں کو آمادہ کیا تھا۔تم اسلام کے نشر و تبلیغ کا علم لے کر بڑھے تھے یا کفر و شرک کی حکومت قائم کرنے کی غرض سے یہ لشکر آرائی کی گئی تھی۔ اسلام کی حقانیت اور ارکان اسلام کا غیر مسلم کو گرویدہ بنانا تمہارا نصب العین تھا یا خود کفر و شرک کے جال میں پھنس کر آزادی ہند کا ترانہ سنانا مقصود و مطلوب تھا۔'' (۴۵)

آپ اِن لیڈران قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے سوال کرتے ہیں:

''یہ سارے اعمال جو وقوع پذیر ہوئے اور ہو رہے ہیں اِن سے

ہندوؤں کے مطالب و مقاصدِ مذہبی و ملکی کا تکملہ ہو رہا ہے یا اسلام اور اسلامی خلافت کی خدمت انجام پا رہی ہے۔ چوبیس (۲۴) کروڑ ہندوؤں کا قدم اسلامی یا کسی رکنِ دینی کی طرف بڑھا یا سات (۷) کروڑ مسلمانوں نے بڑھ کر سوراج اور مراسم کفر و شرک کو لبیک کہا۔ مسلمان ہندوؤں کے ہوگئے یا ہندو مسلمانوں کے ہو رہے ہیں۔ مسلمانوں کے قلوب آہنی تھے یا مقناطیسی مسلمانوں نے مقناطیس بن کر ہندوؤں کو اپنی طرف کھینچا یا ہندوؤں نے اپنی مقناطیسی کشش سے اُنہیں اپنے میں جذب کرلیا۔اِس کا جواب واقعات سے ہونا چاہیے نہ خطیبانہ عبارت آرائی سے۔'' (۴۶)

ساتھ ہی آپ انہیں اسلامی اور غیر اسلامی سیاست کا فرق سمجھاتے ہوئے ''النور'' صفحہ ۱۵۹، پر لکھتے ہیں:

''ایک سیاست اسلامی ہے اور ایک سیاست یورپ، دونوں میں فرق آسمان و زمین کا ہے۔سیاست اسلامی عین دین و مذہب ہے اور سیاست یورپ سرتا سر کید و حیل۔''

علامہ اقبال مغرب کی سیاست کے اسی تصور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

تو بے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن ،اندروں چنگیز سے تاریک تر

لیکن جب متعدد بار کی تنبیہ اور وعظ و نصیحت کے باوجود ان کے طرزِ عمل میں کسی قسم کی کوئی مثبت تبدیلی کے آثار نہ پائے تو سیّد سلیمان اشرف نے مسلمانان ہند پر ان کے کردار و عمل کی اصلیت آشکارا کرتے ہوئے لکھا:

''اللہ اللہ کفر کے ساتھ کیسی شیفتگی و فریفتگی ہے کہ کذب و افترا کا ارتکاب ایسے سنجیدہ و متین اشخاص کس اطمینان و سکون سے کرتے ہیں ......

مسلمانو! آنکھیں کھولو علمائے سیاسی یہ کہتے ہیں کہ ''خدا نے گاندھی کو مذکر بنا کر بھیجا ہے۔'' ''پسرو گاندھی صاحب کا ہوں۔'' علوم مشرقیہ کا فردِ فرید اِس طرح تحریف کرتا ہے۔ جنٹلمین لیڈر یہ کہتا ہے کہ اگر ''ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے تو خدا کو راضی کرو گے۔'' (۴۷)

آپ مسلمانانِ ہند سے پوچھتے ہیں کہ اپنے ''ایمان سے کہیے یہ جمعیت العلماء ہے یا اُمتِ گاندھی کا حلقہ۔ یہ اسلام اور شارع اسلام ﷺ کی طرف اللہ کے بندوں کو دعوت دے رہی ہے یا گاندھی کی نبوت تسلیم کرا رہی ہے۔ یہ حضرات اسلام کی دردمندی میں انگریزوں سے لڑنا چاہتے ہیں یا دینِ گاندھی کی حمایت میں۔ پھر اگر کسی نے اِن کی بات نہ سنی تو کافر، منافق، یزیدی، ملعون اور جہنمی کیوں کر ہوا۔'' (۴۸)

آپ لکھتے ہیں کہ اگر اِن میں ''اسلام کا درد ہوتا، مسلمانوں کی محبت ہوتی، زوالِ خلافت کا صدمہ ہوتا تو قوت پیدا کرنے کے صحیح ذرائع اختیار کرتے۔ اُسوہ حسنہ جسے حق سبحانہ نے فرمایا ہے، اُس کی پیروی نہایت سرگرمی سے کرتے۔'' (۴۹)

اِس مقام آپ مسلمانانِ ہند کو مخاطب کرتے ہوئے اُنہیں دعوتِ غور وفکر دیتے ہیں اور عاجزانہ التماس کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فرزندانِ اسلام! اِس فقیر بے نوا کی معروضات کو تعصب سے الگ ہوکر ملاحظہ فرمائیے۔ اِن عاجزانہ گزارشوں کو تطبیق واقعات سے دیکھئے اپنے لیڈوروں کی اضطراری حرکات اور کورانہ رفتار پر غور کیجئے، اب نہ مقامات مقدسہ کی حفاظت ہے، نہ ہجرت کیلئے بلند آہنگی، نہ جزیرۃ العرب پر جوش ہے، نہ خلافت پر بزم ماتم۔ اب تو صاف اور کھلے الفاظ میں وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان کو پہلے آزاد کرلو پھر اپنے مطالباتِ مذہبی کا ذکر چھیڑنا۔ خدا کیلئے ذرا انصاف سے کام لو، کیا یہ

مقصدِ کانگریس نہیں، کیا یہ ساری مذہبی تصویریں جو اِس ایک برس میں جلد جلد سامنے لائی گئیں وہ بذاتِ خود مقصود ومطلوب نہ تھیں بلکہ اُن کی نمائش کا مقصد صرف تمہارے جذبات میں ہیجان پیدا کرنا تھا اور اُس ہیجان کو خدمتِ ہندوستان میں صرف کرنا تھا۔ یہ ساری جلوہ آرائیاں جو تقدس کے پیکر میں ہوئیں اُن کی محض یہی غایت تھی کہ تم کسی طرح ہندوؤں کے فدائی ہوجاؤ اور تمہاری مذہبی عصبیت فنا ہوجائے پھر حکومتِ ہند ہاتھوں میں ہندوؤں کے اُس طرح دے دو جیسا کہ ہندوؤں کا دل چاہتا ہے۔''

آگے ہادیانِ قوم کی غلط پالیسیوں کے سبب پہنچنے والے نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ:

''یہ ہیں نتائج ہندو مسلم اتحاد کے اور یہ ہے ثمرہ نان کوآپریشن کا اور یہ ہے جزا سلف گورنمنٹ کیلئے ہندوؤں کے معاون ومددگار ہونے کی۔

سالے کہ خوش ست از بہارش پیداست''

آپ ایک مرتبہ پھر انہیں دعوتِ اصلاحِ احوال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دوستو اب بھی آنکھیں کھولو دیکھو تمہاری اِس موجودہ حالت سے ہندوؤں نے کیسا فائدہ اُٹھایا (ہے)۔'' (۵۰)

آپ مسلمانوں کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے استدعا کرتے ہیں:

''دوستو خدا کے واسطے اپنی جانوں پر رحم کرو، اپنے اعمال قبیحہ اقوال کفریہ اور تحریفِ مسائلِ شرعیہ سے توبہ کرو، ایمان کی حقیقت سمجھو اور اُس کی قدر پہچانو، خدمتِ اسلام کا خدام اسلام سے طریقہ سیکھو، مسٹر گاندھی اور اُن کے ہنود پارٹی کا جام ولا کب تک پیتے رہو گے۔ دنیا چندست آخر کار با خداوندست۔'' (۵۱)

غرض کہ پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے رہبرانِ قوم اور قوم دونوں کو اُن کی بدعملی

اور کوتاہی پر بار بار متنبہ کیا۔ اور وعظ و نصیحت اور تنبیہ و سرزنش کے ذریعے اصلاح احوال کی بھر پور کوشش کی۔ ساتھ غلط حکمتِ عملی کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کو پہنچنے والے دینی، ملّی، سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی نقصانات سے بھی بروقت آگاہ کیا۔

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ

اِسلام میں قیادت کا تصور دنیائے سیاست کی تصورِ قیادت سے الگ، مختلف اور نرالا ہے۔ اسلام صرف پیغمبر اسلام ﷺ کی قیادت میں زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ اسلام میں آپ ﷺ کی قیادت کے علاوہ کسی اور قیادت کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ ایک مومن اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کے احکام کا پابند ہے۔ سیّد سلیمان اشرف نے رہبرانِ قوم کو پرکھنے کیلئے اِسی اصول و پیمانے کو مدنظر رکھا۔ آپ کے نزدیک رہبر وہ ہے جو اللہ اور اللہ کے حبیب ﷺ کے احکامات کا پابند ہو۔ جو دیدہ ور بھی ہو اور رازِ پنہاں سے باخبر بھی ہو۔

چنانچہ آپ نے مسلمانانِ ہند کو رہبرانِ قوم کی اقسام اور اُن کی مثبت و منفی خصوصیات سے آگاہی دیتے ہوئے ''النور'' صفحہ ۴۷، پر لکھا کہ:

> ''رہبروں کی تین اقسام ہیں۔ ایک وہ باکمال رہبر کہ جس کے ذہن میں منزلِ مقصود متعین و مشخص اور کامیابی کی راہ اُسے معلوم ہوتی ہے۔ وہ راستے کی دشواریوں اور خطرات و مہالک سے واقف اور اُن سے بچنے کی تدابیر پر قادر ہوتا ہے۔ ایسا رہبر ہی اپنے پیچھے آنے کو سلامتی کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ دوسرا وہ ناقص رہبر ہے جسے نہ راستہ معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی راستے کے خطرات کا علم ہوتا ہے لیکن اُس کی منزلِ مقصود متعین، تلاشِ راہ کی طلب کامل اور خطرات پر غالب آنے کی قوت اُسے میسر و حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ تیسرا رہبر وہ مدعی باطل کہ جسے نہ منزلِ مقصود کی خبر، نہ راستہ کا علم، نہ دشواریوں پر بصیرت و خبر اور نہ ہی کسی قسم کے دفاع پر قدرت و طاقت ہوتی ہے۔''

سلیمان اشرف قیادت کی اقسام اور اوصاف بیان کرنے کے بعد مسلمانان ہند

کو دعوتِ فیصلہ دیتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> ''اب تم پر فیصلہ ٹھہرا کہ تم ہی کہہ دو خدا لگتی تمہارے لیڈر کس قسمِ رہبر میں شامل و معدود ہیں۔'' (۵۲)

علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ۔

کر بلبل و طاؤس کی تقلید سے توبہ
بلبل فقط آواز ہے، طاؤس فقط رنگ

سیّد سلیمان اشرف کے خیال میں مسلمانوں کی موجودہ قیادت قوم و ملت کی حقیقی ہمدرد و خیر خواہ نہ تھی۔ اشتعال انگیز تحریکیں پیش کرنا اور تباہ کن اُمور کا سامنے لانا لیڈروں کا محبوب مشغلہ اور قوم کو تباہی و ہیجان میں مبتلا کر کے چھوڑ دینا اِن کی لیڈری کے نمایاں جوہر تھے۔ چنانچہ آپ نے اِن نااہل رہبرانِ قوم کا تعارف کچھ اِس طرح سے کرایا:

> ''اِس وقت سطحِ لیڈری پر جن کا وجود سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ دو قسم کے اشخاص ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کی ہستی اور نمود کا مدار اسی لیڈری پر ہے مسلمانوں کے سامنے اشتعال انگیز تحریکیں یکے بعد دیگرے پیش کرتے رہنا اُن کی لیڈری کی جان ہے۔ ایک اَمر تباہ کن کا سامنے لانا اور پھر قبل اِس کے کہ مسلمان اُس تباہی سے باخبر ہوں دوسری تباہی اُن کے سروں پر لا کر ہیجان میں ڈال دینا اُن کی لیڈری کا جوہر ہے۔ اسی کے ساتھ جلبِ مال کا اُصول کسی حال میں نہ بھولنا لیڈری کی روح رواں ہے۔ دوسری قسم کے وہ اشخاص ہیں جن کی گورنمنٹ میں جب زیادہ قدردانی نہ ہوسکی دربار وغیرہ کے مواقع پر معمولی اشخاص کے ذیل میں ڈال دیئے گئے تو پھر مجبور ع
>
> دیکھا کہ وہ ملتا ہی نہیں کعبہ کو ہو آئے

اِس میں ایک سِر یہ بھی تھا کہ شاید حکومت پر ایسی دھمکی پڑ جائے کہ جس سے خائف ہو کر تلافیِ مافات کر دے اسی کے ساتھ اگر دین پر بھی مفت

کرم داشتن کی رسم ادا ہوجائے تو کیا مضائقہ۔غرض نمایاں لیڈر کی حقیقت اِن دوصورتوں سے خالی نہیں رہے۔'' (۵۳)

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، ہجرت اور ترکِ گاؤ ذبیحہ کے قائدین مردِ حق آگاہ نہ تھے۔نہ تووہ دیدہ ور تھے، نہ ہی رازِ پنہاں سے باخبر تھے۔اور نہ ہی وہ غلامانِ مصطفیٰ ﷺ کے راستہ پر گامزن تھے۔یہی وجہ تھی جو تحریکی مقاصد و نظریے سے انحراف اور اہداف وترجیحات کا غلط تعین رہبرانِ قوم کو حصولِ منزل سے بہت دور لے گیا۔نااہلی، کجروی اور کوتاہ فہمی نے ناکامی کا راستہ دکھایا۔دینی تعلیمات سے صرف نظر اور قومی وملّی مسائل کے علاج کیلئے اختیار کردہ نت نئے تجربوں نے اِن کے ذہنوں کو الجھا دیا۔جس نے وحدتِ مقصد کا خاتمہ کرکے کثیر المقصدیت کو جنم دیا۔اور اصل منزل مقصود کا مفہوم مفقود اور اُس کا تعین مُبہم ہوکر رہ گیا۔برعظیم کی قومی وملّی تحریکات رہبرانِ قوم کے اِسی کردار وعمل کی عملی مظاہر ہیں۔

ترکِ موالات سے دارالحرب اور ہجرت، دینی وسیاسی بے بصیرتی کا المیہ

مارچ ۱۹۲۰ء میں انگلستان کے وزیراعظم لائیڈ جارج سے مجلس خلافت کے وفد کی مایوس کن ملاقات (۵۴) اور ۲۰، اگست ۱۹۲۰ء کو ترکی کے ساتھ ذلت آمیز شرائط (۵۵) کے تحت ہونے والے معاہدہ سیورے نے مسلمانانِ ہند کو اور بھی مشتعل کردیا۔گوترکی کی اِس حالت زار پر دنیا بھر کے مسلمان افسردہ تھے۔لیکن ڈیرھ سوسالہ انگریزی غلامی کا تجربہ رکھنے والے مسلمانانِ ہند سب سے زیادہ غم وغصہ کا شکار تھے۔اُن کا خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں متحد ہو کر دنیائے اسلام کو یورپ کے تسلط سے آزاد کرانے کا خواب بکھر چکا تھا۔

اُدھر برعظیم میں تحریکِ خلافت کے زیرسایہ تحریک ترکِ موالات کی نشوونما ہوچکی تھی۔۲۸، مئی ۱۹۲۰ء کو بمبئی میں ہونے والے خلافت کمیٹی کے جلسہ میں طے پایا کہ اب مسلمانوں کے مقاصد کی تکمیل کا واحد ذریعہ حکومت سے ترکِ موالات یاعدم تعاون ہے۔اگرچہ ترکِ موالات کی یہ اسکیم گاندھی نے پیش کی لیکن ابوالکلام آزاد نے اِس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔غلام رسول مہر ''تبرکات آزاد'' (مطبوعہ دہلی ۱۹۶۳ء، صفحہ ۱۶۴) میں لکھتے ہیں کہ

اِس موقع پر ابوالکلام آزاد نے موالات کی حمایت میں علی گڑھ کالج کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا:

''حکومت سے ترکِ موالات اِس طرح فرض ہے جس طرح نماز روزہ اور دوسرے ارکان فرض ہیں۔''

ابوالکلام آزاد نے ترکِ موالات کو ارکان اسلام یعنی نماز روزہ حج زکوٰۃ کی طرح صرف فرض ہی قرار نہیں دیا بلکہ اسے مذہبی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے بھی فرض قرار دیتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا:

''میں بحیثیت ایک مسلمان ہونے کے جسے خدا کے فضل وکرم سے شریعت اسلامی کی کچھ بصیرت دی گئی ہے، کہتا ہوں ایک مسلمان پر حبِ وطن کے لحاظ سے مذہب کے اعتبار سے اخلاق کے لحاظ سے فرض ہے کہ ترکِ موالات کرے۔'' (۵۶)

اِس طرح کے خیالاتِ فاسدہ صرف ابوالکلام آزاد کے ہی نہیں تھے بلکہ اُن تمام لوگوں کا بھی یہی حال تھا جو گاندھی کے زیرسایہ اِن تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔چنانچہ سیّد سلیمان اشرف نے علماء کے اِس کردار وعمل کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا:

''اِن لیڈروں کا منبع فیض سرکارِ گاندھی اور اُن کی ہنود پارٹی ہے۔سلسلہ یوں ہے کہ ایک تحریک مسٹر گاندھی پیش کرتے ہیں، تعلیم یافتہ مسلمان اُسے لبیک کہتے ہیں (اور) علمائے سیاسی کا جبہ وعمامہ اُسے شرعی جامہ پہناتا ہے۔اِن علماء کی یہ مجال نہیں کہ وہ بطور خود کوئی تحریک پیش کرسکیں یا کسی تحریک کے سامنے اٰمنا وصدقنا کے سوا کوئی آواز بلند کرنے کی جرأت بھی کریں۔اِن علماء کا کیا ذکر خود اُس عالم کو لیجئے جسے لیڈروں نے شیخ الہند کا لقب دے کر ایک عجیب وغریب ہستی ثابت کیا ہے اُس کے قلم میں بھی یہ قوت نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو اِن افعالِ خبیثہ کی شناعت ومعصیت بتاسکے۔'' (۵۷)

سیّد سلیمان اشرف دشمنانِ اسلام سے نفرت کرتے تھے۔انہوں نے نہ ہندوؤں کیلئے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھا اور نہ یہود و نصاریٰ کیلئے ۔آپ موالات ہر کافر اور ہر مشرک سے حرام سمجھتے تھے۔اِس موقع پر آپ کا مؤقف بھی وہی تھا جس کا اظہار محدث بریلوی''الحجة المنوتمنة فی آیة الممتحنة''میں پہلے ہی کر چکے تھے۔چنانچہ سیّد سلیمان اشرف نے''غیر مسلم سے موالات ہر حال میں ممنوع ہے'' کہ عنوان سے''النور''میں اپنی بے باکانہ رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

> ''موالات ایک مسلمان دوسرے مسلمان ہی سے کر سکتا ہے خواہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر، کسی حال میں بھی ایک مسلم کسی غیر مسلم شخص یا قوم سے ولا و موالات رکھنے کا مجاز نہیں بنایا گیا حد یہ کہ منافق جو صورتاً مسلمان ہی ہوتا ہے اِس سے محروم کر دیا گیا۔فساق فجار سے بھی ولا منع ہے۔ایک مومن اسی پر مامور ہے کہ وہ موالات ایک مومن ہی سے رکھے۔سوا مومن کے جو بھی ہو وہ موالاتِ مومن سے محروم ہی رہے گا۔ قرآن مجید نے یہی حکم دیا ہے۔سنت رسول نے یہی تفسیر کی ہے۔حاملان علوم دینیہ نے یہی سمجھا ہے۔یہی اپنی تفسیروں میں لکھا ہے۔''(۵۸)

آپ انگریز سے ترکِ موالات اور ہندوؤں سے دوستی و تعلقات روا رکھنے کے حامیوں پر واضح کرتے ہیں:

> ''موالات وداد اور رکون مطلقاً کفار کے ساتھ حرام ہے،خواہ لائڈ جارج ہو یا مسٹر گاندھی۔''(۵۹) آگے اِسی حکم شرعی کو مزید کھول کر بیان کرتے ہوئے صاف صاف الفاظ میں لکھتے ہیں کہ:''مطلقاً کفار و مشرکین سے موالات وداد اور رکون حرام ہے منہی عنہ ہے۔''(۶۰)

درحقیقت تحریکِ ترکِ موالات کے علمبردار علماء کے نظریات قرآن وحدیث کے علاوہ اقوال صحابہ و آئمہ سے بھی متصادم تھے۔چنانچہ سیّد سلیمان اشرف نے''النور''میں خلافت اور ترکِ موالات کے موضوع پر بڑی تحقیقی اور مفصل گفتگو کی۔جس کا ماحصل یہ ہے

کہ مسلمان اپنے مذہب میں ہندوؤں سے اتحاد نہیں کر سکتے ہیں۔موالات ہر کافر و مشرک سے حرام ہے۔مقاماتِ مقدسہ اور خلافتِ اسلامیہ کے مسائل سے اختلاف نہیں۔اختلاف اُن حرکات سے ہے جو منافیٔ دین ہیں۔آپ نے اِس تحریک میں منافیٔ دین اُمور کی نشاندہی بھی کی اور''تمام ابحاث کا خلاصہ یہ ہوا'' کے عنوان کے تحت لکھا:

> ''کافر سے دلی دوستی اور قلبی محبت کفر ہے۔دل میں کافر کی دوستی نہیں لیکن عمل دوستوں کے مانند و مثل یہ حرام ہے۔قلب محبت کفر و کفار سے پاک ہے بلکہ بیزار لیکن کافر کے مذہبی اعمال میں عملاً شرکت کی جائے یہ حرام ہے۔کافر کے دین کی حمایت حرام ہے۔کافر کی ایسی مدد کرنا جس سے دین اسلام کا یا مسلمانوں کا نقصان ہوتا ہو حرام ہے۔کافر سے ایسی مدد لینا جس میں اپنے دین یا اپنے بھائیوں کا نقصان ہوتا ہو حرام ہے۔مدارات فعل جمیل،عمل معروف،برّ و احسان اور عدل و انصاف ہر حال میں جائز ہیں بلکہ بعض کفار کے ساتھ احسن و انسب۔ دنیاوی کاروبار و لین دین ہر کافر حربی و غیر حربی سے جائز کسی وقت بھی حرام نہیں۔اِن احکام میں کفار ہند اور کفار یورپ سب مساوی ہیں بجز اس کے کہ کفار اہل کتاب کا کھانا کھانا اور نکاح میں کتابیہ عورت کا لانا بموجب حکم قرآن پاک مباح و جائز ہے۔اس کے سوا جملہ احکام شرعیہ کفار اہل کتاب و کفار غیر اہل کتاب دونوں کیلئے یکساں ہیں۔''(۶۱)

سیّد سلیمان اشرف نے نصوص صریحہ کی روشنی میں علمائے سیاسی و رہبرانِ خلافت و موالات کے غیر اسلامی طرزِ عمل کی شدید گرفت کرتے ہوئے متنبہ بھی کیا کہ اگر اُنہیں:

> ''دعویٰ ایمان ہے تو وہ کفار و مشرکین کی معیت اُمورِ دینیہ میں ترک کریں اور مذہبِ کفر کی اعانت و تائید سے جو صریح حرام ہے توبہ کریں۔''(۶۲)

مگر افسوس کہ توبہ اور رجوع کی طرف توجہ دینے کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی کا راستہ اختیار کرتے ہوئے گاندھی کی زیرِ سرپرستی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔بعد میں سول

نافرمانی (ترک موالات) بھی پروگرام میں شامل کرلی گئی۔ جس کے پروگرام کا ایک نمایاں حصہ تعلیمی اداروں سے متعلق تھا جس میں یہ اپیل کی گئی تھی کہ حکومت سے تعلیمی اداروں کیلئے مالی امداد نہ لی جائے اور اگر اُن کے اربابِ اختیار نہ مانیں تو طلباء تعلیم ترک کر کے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔

اِس موقع پر علمائے دیوبند کے سرخیل مولوی محمود حسن دیوبندی نے مسلم کالج علی گڑھ اور اسلامیہ کالج لاہور و پشاور جہاں مسلمانوں کیلئے جدید عصری تقاضوں کے مطابق تعلیم کا انتظام تھا، کی مخالفت کو عینِ اسلام قرار دیا۔ جبکہ ابوالکلام آزاد کا کہنا تھا کہ ترک موالات کیلئے ضروری ہے سرکارِ برطانیہ سے جو امداد ملتی ہے بند کی جائے اور یونیورسٹی سے کالج کا الحاق بھی ختم کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو اِن دونوں صورتوں میں موالات کا ارتکاب ہوگا۔

چنانچہ کانگریس نے ۹، ستمبر ۱۹۲۰ء کو ترکِ موالات کا ریزولیوشن پاس کیا جس کے تحت لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اپنے خطابات واعزازات واپس کردیں اور اپنے بچوں کو گورنمنٹ کے کنٹرول اور سرپرستی میں چلنے والے اسکولوں اور کالجوں سے نکال لیں۔ چنانچہ ۱۱، اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی برادران اور مشہور ہندو لیڈر سوامی ستیہ دیو ہری پراجک (جس کا کہنا تھا کہ دھرم کے لحاظ سے یہ عین ضروری ہے کہ قرآن کی تعلیمات اقوام عالم سے نابود کردی جائیں اور اِس کی جگہ راشٹر دھرم کی کی تعلیم مسلمانوں کو دی جائے) گاندھی کے ہمراہ علی گڑھ پہنچے۔ اور ۲۳، اکتوبر ۱۹۲۰ء کو ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولوی عبدالماجد دریا آبادی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری و دیگر قائدین کی زیر سرکردگی مجاہدینِ اسلام کی فوج نے علی گڑھ کالج پر ہلہ بول دیا اور کالج بند کرانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگادیا۔

اِس مقام پر نامور ادیب اور محقق محمد علی چراغ کی کتاب ''اکابرین تحریک پاکستان'' کا مندرجہ ذیل حوالہ بھی پیش نظر رہے۔ جس کے صفحہ ۴۶۱، پر محمد علی چراغ لکھتے ہیں:

''تحریکِ ترکِ موالات کے دوران ضیاء الدین احمد علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے ۔ اِس تحریک کے حوالے سے مولانا محمد علی جوہر

نے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد سے ملاقات کی اور اساتذہ اور طلبہ علی گڑھ یونیورسٹی کو ترکِ موالات اور کانگریس میں شامل ہونے کا مشورہ دیا اور حکومت کی امداد بند کرانے کی رائے دی۔ ''لیکن اِس موقع پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد نے مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے رفقاء کو حضرت مولانا احمد رضا خاں کے فتوے کی ایک کاپی دکھائی اور کہا کہ اِس فتوے کی موجودگی میں ہم یونیورسٹی اور طلبہ واساتذہ کے بارے میں یہ اقدام کیسے کرسکتے ہیں ۔ اگر آپ اِس فتوے کے جواب میں کوئی مدلل بیان پیش کردیں تو ہم آپ کے اشارہ کی تعمیل کیلئے تیار ہیں ورنہ معذور ہیں۔'' لیکن اِس فتوے کا جواب ممکن نہ ہوسکا۔ (یہ واقعہ تاریخ علی گڑھ تحریک، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ستمبر ۱۹۸۱ء میں صفحہ ۲۹۸۔۴۰۴، بھی موجود ہے) اِس طرح ایک مختصر عرصہ کیلئے مسلمانوں کی جذباتی رو کے باعث علی گڑھ یونیورسٹی مقفل رہی لیکن مجموعی طور پر علی گڑھ یونیورسٹی متحدہ قومیت اور ترکِ موالات کے سیلاب کی زد میں آنے سے محفوظ رہی۔''

یہ ترکِ موالات کے لیڈران ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ تعلیمی اداروں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا گیا، پرنس آف ویلز (سلطنت انگلستان کا ولی عہد، جسے بنارس ہندو یونیورسٹی آمد پر پنڈت مدن موہن مالویہ نے ڈاکٹر کی آنریری ڈگری دی اور اِس موقع پر گاندھی کو یونی ورسٹی میں گھسنے نہیں دیا) کی آمد پر احتجاجی جلوس نکالے گئے، جگہ جگہ جلسے کر کے مختلف تجاویز ومطالبات پیش کیے گئے ۔ ولایتی مصنوعات کا مقاطعہ اور ترک موالات کا فیصلہ ہوا۔ مسلمانوں نے تمغے اور خطابات واپس کردیئے، ہڑتالیں ہوئیں اور انتخابات کا بائیکاٹ کیا گیا۔

بظاہر مسلمانوں کے نزدیک اِس تحریک کا مقصد حکومت برطانیہ سے عدم تعاون تھا لیکن ہندو در پردہ مسلمانوں کیلئے ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے تھے جن کی وجہ سے مسلمان تمام چیزوں سے محروم ہوجائیں اور ہر جگہ ہر محکمہ میں صرف اہل ہنود ہی باقی رہ جائیں۔

افسوس تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے لیڈر ہندوؤں کی حکمت عملی اور سازش کو

نہ سمجھ سکے اور جذبات کی رو میں بہہ گئے۔ اُسی زمانے میں گاندھی نے مسلمانوں کو تباہ کرنے کیلئے ایک اور چال چلی، اُس نے جمعیت علمائے ہند اور خلافتی لیڈروں سے ہندوستان کو ''دارالحرب'' قرار دلوا کر مسلمانوں کیلئے ہجرت کا فتویٰ جاری کروادیا۔ گاندھی کی ایما پر ''مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ہجرت کا فتوی جاری کیا۔'' (۶۳) جو ''لو ہجرت آ گئی'' کے عنوان سے ۲۸، اپریل ۱۹۲۰ء کو روزنامہ حریت دہلی میں شائع ہوا۔

مفتیانِ سیاسی کی بصیرت و بصارت کا ماتم

اِس مقام پر بات آگے بڑھانے سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کی فقہی اصطلاحات پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ فقہائے اسلام نے قوانین کے نفاذ کے اعتبار سے حکومتوں اور ممالک کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک ''دارالاسلام'' اور دوسرا ''دارالکفر''۔ دارالاسلام سے مراد وہ ملک ہے جہاں دستوری طور پر اسلامی قوانین اور احکام نافذ ہوں، شعائر اسلامی کا غلبہ ہو اور ملک کے قائدین و حکام مسلمان ہوں۔ جبکہ دارالکفر اُس مملکت کو کہا جاتا ہے جہاں دستور اور حکومت غیر مسلموں کی ہو اور اُس کے قائدین و حکام بھی غیر مسلم ہوں۔

فقہا کے نزدیک وجود امن (حالت امن) اور عدم امن (حالت جنگ) کے اعتبار سے دارالکفر کی بھی دو اقسام ہیں۔ ایک ''دارالحرب'' اور دوسرا ''دارالامن یا دارالعہد''۔ دارالحرب سے مراد ایسا غیر مسلم ملک جس کی حکومت مسلمانوں کے ساتھ برسرپیکار ہو۔ جو اُن کے مال و املاک اور اُن کی جان کو ختم کرنے یا نقصان پہنچانے کے درپے ہو اور جہاں اسلامی دعوت کو ممنوع قرار دیا گیا ہو۔ ایسے ملک کو دارالحرب کہتے ہیں۔

خیال رہے کہ ہر دارالکفر دارالحرب نہیں ہوتا۔ دارالحرب ہونا ایک استثنائی صورت ہے۔ جبکہ ایسے غیر مسلم ممالک جن سے مسلمانوں کے سفارتی تعلقات ہوں۔ تجارتی اور دیگر انواع کے معاہدات ہوں۔ ایک دوسرے ممالک میں آنا جانا ہو اور وہاں مقیم مسلمانوں کی جان مال عزت و آبرو محفوظ ہو اور انہیں اپنے مذہبی شعائر پر عمل کرنے میں آزادی ہو۔ ایسے ممالک دارالحرب نہیں ہوتے۔ جبکہ ایسا ملک جس کی حکومت اور نظام و انصرام غیر مسلموں

کے ہاتھ میں ہو مگر وہ مسلمانوں کے ساتھ امن کا معاہدہ کر چکی ہو اور وہاں مسلمانوں کو شعائر اسلام بجالانے کی پوری آزادی حاصل ہو اُسے دارالامن یا دارالعہد کہتے ہیں۔

اِس تناظر میں جب ہم قائدین جمعیت العلمائے ہند، تحریکِ خلافت، موالات اور ہجرت کے حامیوں کے دینی و شرعی مؤقف کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ لوگ انگریز حکومت کے خلاف، خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک چلا رہے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر ہندوستان کی فقہی حیثیت اگر دارالاسلام کی نہیں تو کم از کم ایک ایسے دارالامن یا دارالعہد کی ضرور تھی۔ جس کا انتظام و انصرام اگرچہ انگریز حاکموں کے ہاتھوں میں تھا مگر مسلمانوں کو اُن تمام شرعی اُمور کے انجام دہی کی مکمل آزادی حاصل تھی جو اسلام نے نافذ کئے ہیں۔ وجۂ نزاع صرف ایک تھی یعنی مسئلہ خلافت۔

جس کے تحفظ و بقاء کا وہ انگریز حکمرانوں سے مطالبہ کر رہے تھے۔ گویا فقہی اعتبار سے وہ ہندوستان کو دارالامن تسلیم کر رہے تھے۔ جس میں مکمل مذہبی آزادی کے ساتھ رہتے ہوئے سلطنتِ عثمانیہ اور خلافت کی حفاظت کیلئے وہ آمادۂ احتجاج تھے۔ مگر اسی احتجاجی تحریک کے دوران جب تحریکِ خلافت سے ترکِ موالات اور ترکِ موالات سے تحریک کا رخ ہجرت کی طرف موڑا جاتا ہے اور ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر برعظیم کے مسلمانوں کو ترک وطن کا راستہ دکھایا جاتا ہے تو اُس وقت ہمیں رہبرانِ تحریک کے سابقہ فقہی مؤقف میں ایک بڑی اور واضح تبدیلی نظر آتی ہے۔ جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ اب ہندوستان کی فقہی کی حیثیت دارالاسلام یا دارالامن سے دارالکفر یا دارالحرب میں بدل چکی ہے۔ اور جہاں سے ہر حالت میں مسلمانوں کیلئے ہجرت لازم ہوگئی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے وہ کیا اسباب وعوامل تھے جو یکدم ہندوستان کی فقہی حیثیت کو دارالاسلام یا ادارالامن سے دارالکفر یا دارالحرب میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اچانک ایسا کون سا انقلاب آجاتا ہے جو آناً فاناً خطہ کے نظام زندگی اور دینی حیثیت کو اِس حد تک متاثر کر دیتا ہے کہ شرعی و فقہی اصول و پیمانے ہی تبدیل ہوجاتے ہیں اور یک لخت دارالکفر یا دارالحرب پر لازم آنے والے تمام شرعی و فقہی تقاضے پورے ہوجاتے ہیں۔ بہتر جواب اور

وضاحت تو قائدین خلافت و ہجرت یا مفتیانِ وقت ہی دے سکتے تھے۔ یا پھر حامیانِ تحریک ہی بتا سکتے ہیں کہ دینی و فقہی اُصولوں کے مطابق یہ فیصلہ کس حد تک صحیح یا غلط ہے۔ لیکن بادی النظر میں ہمیں اِس فیصلے کے پس پردہ اسباب وعوامل میں دنیاوی وسیاسی مقاصد کے حصول کے اثرات زیادہ واضح اور نمایاں محسوس ہوتے ہیں۔ جس کی خاطر قائدین خلافت و ہجرت نے دینی و فقہی اصطلاحات کو بطور حربہ استعمال کرتے ہوئے برعظیم کے سادہ لوح مسلمانوں کے دینی وملی جذبوں سے کھلواڑ کیا اور اُنہیں ہجرت کی ترغیب دے کر ذلت ورسوائی اور تباہی وبربادی کے راستوں پر دھکیل دیا۔

یہ تحریکِ ہجرت اور خلافت کے قائدین کی مذہبی وسیاسی بصیرت کا وہ عجیب مقام ہے جس نے برعظیم کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان سے دوچار کیا۔ چنانچہ اِن ناعاقبت اندیش مفتیانِ سیاسی کی بصیرت و بصارت کا ماتم کرتے ہوئے ڈاکٹر جہانگیر تمیمی خوب نے لکھا:

> ''چند عاقبت نا اندیش بشمول مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ داغ دیا۔ اِن مفتیوں نے کہا کہ ہندوستان اب دارالحرب بن گیا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر یہاں سے ہجرت فرض ہوگئی ہے۔ اِن مفتیوں نے مسلمانوں کو قریبی مسلم ملک افغانستان جانے کا مشورہ دیا۔ جس سے مسلمانوں کے بجائے ہندوؤں کو فائدہ پہنچا۔ یہ عجیب بات ہے کہ فتوے صادر کرنے والے مفتیوں کے سرخیل مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے خود ہجرت نہیں کی۔ جب لوگوں نے اُن سے استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ ''اگر ہجرت کر جاتے تو یہاں لوگوں کو ہجرت پر آمادہ کون کرتا؟ اس لیے اُن کا یہاں رہنا ناگزیر تھا۔ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ اِس تبصرہ اور تاثر میں مسلم ملت کے سوختہ سامان بعض علمائے ہند کی مذہبی حیثیت کے باوصف اُن کی سیاسی بصیرت کا المیہ ہی

> ہے کہ برعظیم پاک وہند کی مسلم ملت پر اُن کی سیاسی بصیرت کیا بصارت تک اپنی عجزِ فہم کا ماتم خود کررہی ہے۔'' (۶۴)

ایک اعترافِ حقیقت

اِس موقع پر محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں نے اعلیٰ سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانانِ ہند کو ہجرت اور عدم تعاون سے باز رکھنے کی بھرپور سعی کی۔ پروفیسر محمد اسلم نے بھی ہجرت کے فتویٰ کو ایک نامعقول فتویٰ قرار دیا اور محدث بریلوی کے موقف کی سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا:

> ''تحریکِ ہجرت کے دوران میں ہجرت کا فتویٰ بڑا نامعقول تھا۔ ہندو تو یہی چاہتے تھے کہ مسلمان اِس ملک کو ہندوؤں کے حوالے کرکے عرب چلے جائیں۔ میں سچا پکا دیوبندی ہونے کے باوجود کھلے دل کے ساتھ اِس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ اِس موقع پر مولانا احمد رضا خاں نے بڑی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا اور مسلمانوں کو ہجرت اور عدم تعاون سے باز رکھا۔ اُنہوں نے (پروفیسر) حاکم علی پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کے استفسار پر بڑے واشگاف الفاظ میں اُن کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا تھا کہ ترکِ موالات اور عدم تعاون کے باوجود انگریزوں سے مدارس کیلئے سرکاری گرانٹ لینے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ انگریز یہ رقم انگلستان سے لاکر ہمارے سکولوں اور کالجوں کو نہیں دیتے، بلکہ ہم سے ہی وصول کردہ ٹیکسوں میں سے گرانٹ دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ ہماری ہی رقم ہے جو ہمیں دی جارہی ہے۔ یہ اُن کا ہم پر کوئی احسان نہیں ہے۔ یہ ہمارا حق ہے جو ہمیں مل رہا ہے۔'' (۶۵)

تباہ کن فتویٰ ہجرت اور سیّد سلیمان اشرف

علمائے سیاسی کی جانب سے ہجرت کا فتویٰ مسلمانانِ ہند کیلئے انتہائی تباہ کن نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ جس کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور اقتصادی اثرات کو موضوع بحث بناتے

ہوئے سیّد سلیمان اشرف نے لکھا:

''ایک نفیرِ عام کو ہجرت کی پکار دی گئی۔ اِس بانگ بے ہنگام نے سرحدی علاقے اور خطہ سندھ میں بہت زیادہ اثر کیا، ہزاروں گھر تباہ ہوگئے، ہزاروں عورتیں بے سرپرست رہ گئیں، ہزاروں بچے سایۂ پدری سے محروم کردیئے گئے، گاؤں کے گاؤں مسلمانوں نے آگ لگا کر خاکستر کردیئے، لاکھوں کی جائیدادیں کوڑیوں کے مول ہندوؤں کے ہاتھوں بیچ دی گئیں۔ تقریباً ایک لاکھ مسلمان اپنے دیار و وطن املاک و جائیداد سے دست بردار ہوکر نکل کھڑے ہوئے...... کیا ستم ہے، ہم جب ایک مختصر سفر جائے اقامت سے کرتے ہیں تو اپنے سفر کی غایۃ، قیام کی مدت، ہمراہیوں کا انتخاب اور دیگر ضروریات و حالات کا پہلے انتظام سوچ لیتے ہیں لیکن یہ کیا قیامت ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ایک نفیرِ عام کو ہجرت کی پکار دی گئی اور اِس اہم تحریک کی کامیاب و بامراد ہونے کیلئے جس ترتیب و تنظیم اور ہدایت و تعلیم کی حاجت تھی اُس سے خود تحریک کرنے والوں کا دماغ بھی خالی تھا جو صدمہ اِس عظیم الشان تحریک کو تغافل شعاری اور ناواقفیتِ مذہبی نے اس وقت پہنچایا ہے نہیں معلوم اِس کا ذمہ دار کون ہے اور اِس کا کفارہ کس کی گردن پر ہے۔ جہاد اور ہجرت اِن دونوں اہم و اعظم مسئلوں کو جس طرح اِس دور کے علمائے سیاسی نے تباہ کیا ہے تاریخ اسلام اِس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ مسلمانانِ ہند کا جو نقصان اِس مدلّس و کاذب فتوے نویسی سے ہوا، دیکھئے اُس کی اصلاح کیوں کر ہوتی ہے اور کتنا زمانہ چاہتی ہے۔'' (۶۶)

خلافت کمیٹی تباہی و بربادی کی ذمہ دار

اُنہی دنوں روزنامہ ''پیسہ'' اخبار، لاہور نے خلافت کمیٹی کے ذمہ داران کو مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور ہزاروں قیمتی جانوں کے زیاں کا ذمہ دار قرار دیا اور ۶ اپریل ۱۹۲۱ء کی

اشاعت میں ''معاملہ ہجرت میں صریح ناکامی'' کے عنوان سے اپنے اداریئے میں لکھا:

''خلافت کمیٹی کے علمبرداروں نے سب سے پہلے ہجرت کا ڈنکہ بجایا، ہزاروں سادہ لوح لیکن ایمان کے پکے مسلمانوں نے اپنی جائیدادیں فروخت کیں، عورتوں کو طلاق دی، چھوٹے چھوٹے بچوں کو بلکتا چھوڑا، بہتوں کی جانیں پشاور اور کابل کی سڑک پر تلف ہوگئیں۔ بعض منزل مقصود پر پہنچ کر جاں بحق ہوئے، بعض واپسی پر راہ میں تباہ ہوئے، اکثر کا روپیہ پیسہ لوٹا گیا، جو بچ کر واپس آئے اُن میں سے اکثر گداگری کرنے پر مجبور ہوئے۔ اِس طرح خلافت کمیٹی نے ہزاروں کلمہ گو مسلمانوں کی شہادت اور بربادی کا ثواب وصول کیا۔

لیا عقل و دیں سے نہ کچھ کام انہوں نے
کیا دین برحق کو بدنام انہوں نے (۶۷)

کابل چلو، کابل چلو کا شور و غلغلہ

مسلمانانِ ہند کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ ہجرت کا اقدام کسی منظم حکمت عملی اور تنظیم کے تحت شروع نہیں کیا گیا۔ کانگریسی علما کی جذباتی تقاریر نے مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کیے۔ اُنہوں نے ہندوستان کو دارالکفر قرار دیا اور مسلمانانِ ہند کو ہجرت کی فرضیت اور وجوب کا یقین تو دلایا لیکن اپنے لیے اِس کے استحباب پر یقین نہ رکھا اور کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ راہِ ہجرت اختیار کرتا۔ اور مشاہدہ کرتا کہ افغانستان ہجرت سیاسی، سماجی، معاشی اور اقتصادی طور مہاجرین کیلئے کتنی سودمند ہے۔ چنانچہ اِس طرزِ عمل اور دورخی کی گرفت کرتے ہوئے محدث بریلوی نے لکھا:

''ہجرت کا غل مچایا اور اپنے آپ ایک نہ سرکا، جو اُبھارنے میں آگئے، اُن مصیبت زدوں پر جو گزری، گزری، یہ سب اپنے جورو بچوں میں چین سے رہے، پتر الگا نہ پھٹکوری۔'' (۶۸)

ہجرت کے حامیوں نے جذبات کی رو میں ڈوب کر حالات و واقعات اور نزاکت

وقت سے بے نیاز ہوکر ہجرت کا نعرہ تو لگا دیا لیکن یہ سوچنے اور سمجھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ آخر اِن مہاجرین کا انجام کیا ہوگا۔ قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں کہ اُس وقت:

''ہجرت کی تحریک نے ایسا اثر پیدا کیا کہ ترکِ موالات کی تحریک بھی اِس کے مقابلے میں ماند پڑگئی۔'' (۶۹)

اُس وقت لوگوں میں ہجرت کا جوش اِس قدر غالب تھا کہ انہوں نے پکنے پر آئی ہوئی کھڑی فصلیں اِس اندیشہ کے تحت جلادیں کہ کہیں انگریز سرکار ہماری فصلوں کو کاٹ کر فائدہ نہ اٹھالے، مگر ایک دن پیچھے رہ جانا گوارا نہ کیا۔

تاریخ کے اِس اہم اور نازک موقع پر علمائے حق بالخصوص محدث بریلوی ''مولانا احمد رضا خاں نے ہجرت کے خلاف فتویٰ دیا اور مسلمانانِ ہند کو اِس سیاسی غلطی سے بچانے کی کوشش کی۔'' (۷۰) آپ اپنے فتویٰ میں فرماتے ہیں:

''دارالاسلام سے ہجرت عامہ کا حکم ہرگز شرع مطہر نہیں فرماتی۔ نہ عادتاً وہ ممکن نہ کچھ مفید کہ سب مسلمان اپنی جائدادیں یونہی نصاریٰ کیلئے چھوڑ جائیں یا کوڑیوں کے مول ہندوؤں کو دی جائیں اور خود کروڑوں ننگے بھوکے اور ملک کے مسلمانوں پر ڈھٹی دیں ان کی عافیت بھی تنگ کریں یا بھوکے مرجائیں اور اپنی مساجد ومزاراتِ اولیاء پامالی کفار ومشرکین کیلئے چھوڑ جائیں۔'' (۷۱)

دراصل محدث بریلوی کی دینی و سیاسی بصیرت نے محسوس کرلیا تھا کہ رہنمائے خلافت وترکِ موالات وہجرت کے اختیار کردہ طریقہ کار کے نتائج مسلمانانِ ہند کے حق میں مذہبی، سیاسی اور اقتصادی طور پر سخت نقصان دہ ثابت ہونگے۔ چنانچہ آپ نے دینی وملّی نقطہ نظر سے اُن کی شدید مخالفت کی۔ بعد کے حالات نے ثابت کردیا کہ محدث بریلوی کا موقف درست تھا۔

تحریکِ ترکِ موالات اور ہجرت سے مسلمانوں کو سراسر نقصان پہنچا اور ملکی سیاست پر ہندوؤں کی گرفت مضبوط ہوئی۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل ''اقبال اور جدید دنیائے

اسلام'' صفحہ ۲۰۸، پر اِس حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تحریکِ خلافت کے ذریعے مسلمانوں نے اپنے جوش وخروش اور ایثار و قربانی کے جذبے سے ثابت کردیا کہ باوجود یہ کہ وہ آبادی میں کم ہیں اور معاشی و سیاسی حیثیت سے نیم جاں بنادیئے گئے ہیں لیکن انگریزوں کے خلاف جنگ لڑنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ اِس تحریک میں اُنہوں نے بحیثیت مجموعی نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اُن کی قربانیاں اُن کی آبادی کے تناسب سے زیادہ تھیں ...... (اُنہوں نے) حکومتِ برطانیہ کی بنیادوں کو متزلزل کردیا۔ مسلمانوں نے اِس تحریک میں نتائج سے بے نیازی اور مصائب وآلام سے انتہائی بے پروائی کا مثالی ثبوت دیا۔ (مگر اپنے اِس تمام تر ایثار وقربانیوں کے باوجود انہیں شدید سیاسی، سماجی اور اقتصادی نقصان اٹھانا پڑا جبکہ) کانگریس کو اِس تحریک سے زیادہ فائدہ پہنچا اور اُس کی حیثیت میں اس تحریک کی حمایت کی وجہ سے زبردست اضافہ ہوا۔''

یہی وہ خطرات تھے جس سے محدث بریلوی مسلمانانِ ہند کو بچانا چاہتے تھے۔ مگر افسوس کہ اُس وقت کسی نے بھی محدث بریلوی کے بروقت انتباہ پر کان نہ دھرا اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں نے اِن لیڈروں کے بہکاوے میں آکر اپنی قیمتی زمینیں، جائدادیں، مکانات اور تجارتی مراکز ہندوؤں کے ہاتھوں کوڑیوں کے مول بیچ دیں اور

برباد ہوں پرواہ نہیں — ناشاد ہوں پرواہ نہیں
اے دوستو جو کچھ بھی ہو — کابل چلو کابل چلو

کے ترانے گاتے افغانستان کی جانب عازمِ ہجرت ہوئے۔

تحریک کا افسوسناک انجام واختتام

ابھی یہ تحریک اپنے عروج پر ہی تھی کہ تحریک کے ڈکٹیٹر گاندھی نے ''چوری چورا'' (۷۲) کے واقعہ کو بنیاد بنا کر سب کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اور تحریک کو اُس وقت ختم کرنے کا

اعلان کردیا جب وہ کامیابی کی منزل سے قریب تھی۔ یوں خلافت کمیٹی کے قیام سے معطلی کے اعلان تک دو سال کے قلیل عرصے میں شاطر وعیار ہندو نے تحریکِ خلافت، ترک موالات، سول نافرمانی اور تحریکِ ہجرت کو اپنے مذموم مقاصد کیلئے استعمال کیا اور سادہ لوح مسلمانوں کی بے وقوفی سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

دوسری جانب اِن تحاریک کے نتیجے میں کانگریس ایک مضبوط سیاسی جماعت بن کر ابھری جبکہ مسلمان لیڈروں کی ناعاقبت اندیشی اُنہیں سیاسی، سماجی، معاشی اور دینی تباہی کے دھانے پر لے گئی۔ اُن کی دولت، مرتبہ و مقام، عزت و ناموس، تعلیم و تعلیمی ادارے حتیٰ کہ مذہبی شعار سب ہی کچھ لٹ گیا۔ مگر اِس ہنگامہ خیز دور میں بھی چند مردان حق جن میں بالخصوص محدث بریلوی کے خلیفہ پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری موجود تھے۔

جن کے نزدیک ہندوستان پر دارالحرب قرار دینے کے دینی وشرعی اصول لاگو نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا ہندوستان دارالحرب نہیں بلکہ دارالسلام تھا۔ جہاں سے مسلمانوں کو ہجرت کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ اِن مردانِ حق نے اپنے دینی وملیّ مؤقف کا برملا اظہار کیا اور تحریکِ ہجرت سمیت ہر اُس تحریک سے نہ صرف خود دور رہے جو برعظیم کے مسلمانوں کیلئے سیاسی سماجی اور اقتصادی طور پر نقصان دہ تھی، عامۃ الناس کو بھی اِن کے مضر اثرات سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل ''اُن کے (اِس) رویہ میں انگریزوں سے وفاداری کا کوئی دخل نہیں تھا۔'' (۷۳)

بلکہ یہ اِن کی مومنانہ فہم وفراست اور دینی بصیرت وادراک ہی تھا جس سے کام لیتے ہوئے اِن حضرات علماء نے بروقت مسلمان رہبروں اور عوام کو ہندوؤں کے ناپاک عزائم اور اسلام ومسلمان دشمن سازشوں سے آگاہ کرنے کا فریضہ بااحسن وخوبی ادا کیا۔ علامہ اقبال ایسے ہی صاحبِ نظر مردِ مومن کیلئے فرماتے ہیں ؂

مجھے راز دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو سامنے آنکھوں کے نظر آتا ہے

بریلی سے بلند ہوتی صدائے حق

اس دور میں بریلی سے ایک آواز ابھرتی ہے...... ''یارو دیکھو کس روش پر چل نکلے ہو...... کچھ اندازہ تو کرو کہ دین اسلام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی تمنائیں رکھنے والے کیا خلافت کو برپا کریں گے؟...... تاریخ کے عمل سے سبق سیکھو...... ہندو مسلم اتحاد سے ہاتھ اٹھاؤ...... اپنے تشخص کو پہچانو...... دامنِ مصطفیٰ ﷺ کو تھامو...... یہی تمہارا حوالہ ہے...... تم اسی سے ہو...... یہ نہیں، تو تم بھی نہیں......'' (۷۴)

اِس موقع پر محدث بریلوی نے مجاہدانہ طرز عمل اپناتے ہوئے قوم اور رہبرانِ قوم کو ہندوؤں کے منافقانہ کردار کی یاددہانی کراتے ہوئے لکھا:

''کیا وہ ہم سے دین پر نہ لڑے؟ کیا قربانی گاؤ پر اُن کے سخت ظالمانہ فساد پرانے پڑ گئے؟...... کیا کٹار پور و آرہ اور کہاں کہاں کے ناپاک و ہولناک مظالم جو ابھی تازے ہیں دلوں سے محو ہوگئے؟ بے گناہ مسلمان نہایت سختی سے ذبح کیے گئے۔ مٹی کا تیل ڈال کر جلائے گئے۔ ناپاکوں نے پاک مسجدیں ڈھائیں۔ قرآن کریم کے اوراق پھاڑے، جلائے اور ایسی ہی وہ باتیں جن کا نام لینے سے کلیجہ منہ کو آئے۔'' (۷۵)

سخت بیماری اور زندگی کے آخری ایام میں بھی محدث بریلوی نے اُس دور کی ہر غیر شرعی حرکت اور شعارِ اسلامی کے خلاف عمل پر سخت گرفت کی اور ''انفس الفکر فی قربان البقر، اعلام الا علام بان ہندوستان دارالاسلام، تدبیر فلاح و نجات و اصلاح. دوام العیش فی الائمۃ من قریش، المحجۃ الموتمنۃ فی آیۃ الممتحنۃ، الطاری الداری لھفوات عبدالباری'' وغیرہ میں نہایت ہی درد اور دل سوزی کے ساتھ اپنے جرات مندانہ مؤقف کا اظہار کیا۔

محدث بریلوی نے اپنی کتب ورسائل اور ایمان افروز فتاویٰ جات میں ہنود کی خوشنودی کیلئے ترکِ گاؤکشی کے عمل سے منع فرمایا۔ آپ نے وضاحت کے ساتھ کہہ دیا کہ ''ترکِ موالات کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ (بھی) غیر شرعی ہے۔'' (۷۶) محدث بریلوی

ہندوستان کو دارالاسلام قرار دیتے ہیں۔لیکن آپ ملک پر انگریز کے غاصبانہ قبضے کے سخت خلاف تھے۔اور سمجھتے تھے کہ اسلام مسلمانوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ بقدرِ استطاعت اپنے ملک کی آزادی کوشش کریں، نہ کہ یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ محدث بریلوی جانتے تھے کہ ہندو تحریکِ خلافت کے پردے میں سوراج کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے تحریک ِخلافت کے نتیجہ میں ہونے والے ہندو مسلم اتحاد کی خرابیوں کو ایک ایک کر کے گنوایا اور بتایا کہ اسلام کے نام پر چلائی جانے والی یہ تحریک کس طرح ہندو تہذیب و تمدن کو فروغ دے رہی ہے اور اسلام کو تباہ و برباد کر رہی ہے۔

محدث بریلوی ترکِ موالات کو مسلمانانِ ہند کے اخلاقی ،معاشرتی ،تمدنی اور اقتصادی مفادات کیلئے سخت نقصان دہ سمجھتے تھے۔اُن کے نزدیک موالات مطلقاً ہر کافر، مشرک حتیٰ کہ ذمی مطیع اسلام اور یہاں تک غیر مسلم باپ، بیٹے ، بھائی یا قریبی عزیز سے بھی حرام تھی۔وہ ایسی موالات کو سوراج کیلئے راہ ہموار کرنا خیال کرتے تھے اور ہر کافر، مشرک، یہود و نصاریٰ، آتش و ستارہ پرست کو اسلام اور مسلمان دشمن گردانتے تھے۔اُن کے نزدیک گاندھی کی قیادت مسلمانانِ ہند کیلئے سخت مہلک اور زہر قاتل تھی۔

محدث بریلوی وحدتِ ملتِ اسلامیہ کے داعی تھے۔اُنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی زہر آلود فضا میں اسلامی تشخص و شناخت کی جداگانہ علامت ''مسلم قومیت'' کا چراغ روشن رکھا اور مسلمانانِ ہند کے دلوں میں عشق و محبت رسول ﷺ کی شمع فیروزاں کی۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر ہے کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

سیّد سلیمان اشرف فکرِ محدث بریلوی کے وارث و امین

اُس دور میں سیّد محمد سلیمان اشرف محدث بریلوی کی سوچ و فکر اور افکار و نظریات کے وارث اور امین بن کر سامنے آئے۔آپ نے محدث بریلوی کے اُسی فکر و نظریہ کی آبیاری کی جس کی بنیاد و اساس اسلام اور صاحب اسلام ﷺ پر ہے۔سیّد سلیمان اشرف کی پوری زندگی وحدتِ ملّی، شعارِ اسلامی کے تحفظ و دفاع،اسلامیانِ ہند کے سیاسی، سماجی، تہذیبی،

معاشی اور اقتصادی استحکام، تعلیمی شعور کی زبوں حالی و بحالی کی تجاویز و آراء اور دو قومی نظریہ کے تحفظ و احیاء کی جدوجہد سے عبارت ہے۔سیّد سلیمان اشرف نے متحدہ قومیت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں اسلامی نظریہ ''مسلم قومیت'' کا چراغ روشن کیا اور دو قومی نظریہ کا وہ تصور اجاگر کیا جو بعد میں تحریک پاکستان کی مرکزی اساس و بنیاد قرار پایا۔

وحدتِ ملی کے داعی و ترجمان

سیّد سلیمان اشرف محدث بریلوی کی طرح وحدتِ ملّی کے داعی و ترجمان تھے۔ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ دنیا میں کسی بھی قوم کی کامیابی و کامرانی اُس کے افراد کے باہمی اتحاد و اتفاق میں مضمر ہے۔آپ کے نزدیک عالم اسلام کے متحد اور مجتمع ہونے سے ایسی اجتماعیت تشکیل پاتی ہے کہ جس پر نگاہ ڈالتے ہی دشمن وحشت زدہ ہو جاتا ہے اور وہ کبھی بھی اُس کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔درحقیقت اتحاد و اتفاق کسی بھی قوم کی ترقی اور اعلیٰ اہداف کے حصول نیز سربلندی اور کامیابی میں معجزانہ کردار ادا کرتا ہے۔ اسلام نے اِس اجتماعیت کو وحدتِ ملّی سے تعبیر کیا، جسے پروفیسر سیّد سلیمان اشرف ملتِ اسلامیہ کیلئے بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔ اور اسلام اور عالم اسلام کے تحفظ و دوام کا ضامن قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وحدتِ ملّی کے تین بنیادی اصولوں کو بیان کرتے ہوئے ''النور'' میں لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں کے تحفظ و بقاء اور اسلام کے محفوظ و مامون رہنے کیلئے تین اصولوں کا ہونا ضروری ہے۔پہلا مسلمانوں کا کوئی مرکز ہو۔دوسرا مرکزی مقام کا امیر ہو اور تیسرا مرکزی مقام پر ایسی قوت ہمیشہ موجود رہے کہ کوئی بداندیش (اسلام دشمن) نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ کر سکے۔(۷۷)

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک اِس اسلامی وحدت کا مرکزی مقام ''مکہ مکرمہ'' اور امیر اور امیرِ مرکز'' ذات رسالتمآب ﷺ'' ہے۔جس کو مرکز و منبع مانتے ہوئے مسلمانوں کی فلاح و نجات کا دارومدار عملی وابستگی اور اُن کی غلامی اختیار کرنے میں ہے۔(۷۸)

چنانچہ آپ مسلمانوں کی حالتِ زار اور سلطنتِ عثمانیہ کی تباہی و بربادی کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام ، عالم اسلام اور شعارِ اسلام کے تحفظ و دفاع کیلئے ایک مضبوط دفاعی قوت کے

حصول کو ضروری خیال کرتے ہیں اور عالم اسلام کے مسلمانوں کو اِس کی ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جنگِ یورپ نے جبکہ اسلام کی قوتِ دفاعی کو فنا کر دیا تو اب مسلمانوں پر یہ فرض ہو گیا کہ اُس قوت کو وہ پیدا کریں ...... یہ ایسا فرض نہیں جو کسی خاص خطہ پر بسنے والے مسلمانوں ہی کا فرض ہو۔ یورپ نے خود سلطنتِ عثمانیہ کو پارہ پارہ کر کے یہ تحریک عالم اسلام میں پیدا کر دی ہے کہ جو مسلمان جہاں کہیں بھی ہے، اپنے اس فرض کے ادائیگی کیلئے آمادہ ہو جائے۔'' (۷۹)

اتباع رسول ﷺ تمام سیاسی سماجی اور معاشی مسائل کا حل

آپ کے نزدیک مسلمانوں کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی مسائل کا حل اتباع رسول ﷺ میں مضمر ہے۔ چنانچہ آپ اُمتِ مسلمہ کو اتباع رسول ﷺ کی طرف راغب کرتے ہیں اور انہیں ترغیب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''زندگی کا ہر شعبہ اور حیاتِ انسانی کا ہر لمحہ جو اِس عالمِ امکان میں وقوع پزیر ہو سکتا ہے، اُن سب کے طریقِ عمل کا صحیح نمونہ پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات میں موجود ہے۔ اُمت کی سعادت اِس میں ہے کہ اپنے واقعاتِ زندگی میں اسی حیاتِ طیبہ کی تقلید واتباع کریں۔ (۸۰)

پھر آپ ہدایت اور غلامی سے خلاصی کیلئے دعا گو ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولیٰ تعالیٰ خاتم النبیین ﷺ کی اُمت کو ہدایت عطا فرمائے کہ وہ اپنے پیغمبر کی اتباع کا شرف حاصل کرے اور غلامیِ کفار سے نجات پائے۔'' (۸۱)

اعلیٰ تعلیم قومی ترقی واستحکام کی ضامن

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک مسلمان قوم کی ترقی واستحکام اور سیاسی اثر ونفوذ کیلئے اعلیٰ تعلیم کا حصول لازمی ہے۔ آپ نے مسلمانوں میں تعلیمی شعور کی زبوں حالی اور پسماندگی کو

بیان کرتے ہوئے لکھا:

''سارے ہندوستان میں مسلمانوں کے صرف تین کالج ہیں، علی گڑھ، لاہور اور پشاور۔ اِس وقت ہندوستان میں مجموعی تعداد کالجوں کی ایک سو پچیس (۱۲۵) ہے۔ تین (۳) مسلمانوں کے ایک سو بائیس (۱۲۲) ہندوؤں کے...... ہندو طلبہ کی تعداد اکتالیس ہزار پانچ سو باسٹھ (۴۱۵۶۲) ہے۔ کہا جاتا ہے ہندو چوبیس (۲۴) کروڑ اور مسلمان سات (۷) کروڑ ہیں...... جس قوم کی تعلیمی حالت یہ ہو کہ سات کروڑ میں صرف چار ہزار (۴۰۰۰) مشغول تعلیم ہوں، اُس قوم کا یہ ادّعا اور ہنگامہ کہ اب ہمیں تعلیم کی حاجت نہیں، اگر خبط وسودا نہیں تو اور کیا ہے۔'' (۸۲)

آپ تعلیم کی ضرورت واہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قوم کا علمی شغف جس پر دار ومدار فضیلتِ انسانی ہے۔ قوم کے مراسم و دستور جس پر اقتصاد وتمدن کی بنیاد ہے اور سب سے بڑھ کر قوم کی دماغی زندگی جس سے حوصلہ میں وسعت، خیالات میں بلندی، ضمیر میں روشنی پیدا ہوتی ہے، اِن سب کا سرچشمہ اہل علم کا گروہ ہوتا ہے۔'' (۸۳)

آپ لکھتے ہیں: ''یہ مسئلہ محتاجِ بیان نہیں کہ مقاصدِ علوم تین ہیں۔ تہذیب، اخلاق، تزکیہ نفس اور تربیتِ دماغ، بلا خوف وتردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ علوم کے ہر سہ مقاصد کا بدرجۂ تمام وکمال تکمیلہ علوم اسلامیہ سے ہوتا ہے۔'' (۸۴) لیکن آج ''علوم عربیہ کے جاننے والے اِس وقت جس حال میں ہیں، اُمور دنیاوی اور پولیٹکس حالیہ میں اُن کے دماغ کی بلندی، حوصلہ وہمت کا علو، قوتِ فکریہ کی صحت جس درجہ پر ہے وہ محتاج بیان نہیں۔'' (۸۵)

سیّد سلیمان اشرف عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے جدید عصری تعلیم کے حصول کو ضروری خیال کرتے ہیں اور مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں:

''ایسی تعلیم گاہیں جن کی سند و تصدیق مصدقہ و مسلمہ ہوں اور ایسے
اسانید جن سے ملازمت کا استحقاق ہو اِس وقت تک ضروری ہیں جب
تک حکومت باقی ہے۔''(۸۶)

آپ سمجھے تھے کہ جس گروہ میں تعلیم یافتہ افراد زیادہ ہوتے ہیں حکومت اور اقتدار میں اُس کا حصہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ آپ جدید تعلیم کے مخالفین سے سوال کرتے ہیں:

''یہ فرمائیے کہ تعلیم انگریزی ہندوستانیوں کے احساس تاثر اور تقویت کا
واسطہ ہے یا فریق محارب کیلئے اجیر اور غلام وغیرہ بننے کا ذریعہ و واسطہ،
مسلمان اپنی ہستی قائم و باقی رکھنے کی غرض سے پڑھتے ہیں یا انگریزوں
کی معاونت وامداد کیلئے تعلیم پاتے ہیں۔''(۸۷)

پھر آپ حقیقی معیار تعلیم کو قومی ترقی کا نصب العین قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ موقع ایک لمحہ تغافل کا بھی متحمل نہیں، ضرورت ہے کہ جلد سے جلد
تر باہمی مشورے سے تعلیم گاہوں کا ایک صحیح نصب العین قرار دیا
جائے۔(۸۸)

چنانچہ آپ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسلمانان ہند کو یہ موقع ضائع نہ کرنا چاہیے، اگر اِس وقت بھی اُنہوں نے
اپنی تعلیم گاہوں کا صحیح نصب العین قرار نہ دیا تو پھر آئندہ کیلئے ذلت وخواری
سے رستگاری کی کوئی سبیل نہیں...... (لہٰذا) نہایت نیاز مندانہ التماس ہے
کہ (تعلیم اور) تعلیم گاہوں کی طرف سے غفلت نہ کیجئے۔''(۸۹)

تصورِ رہبانیت اور اسلامی نظریۂ حیات

سیّد سلیمان اشرف مسلمانِ ہند اور لیڈرانِ قوم کو سلامتی و بقاء کا راستہ دکھاتے ہوئے اسلام کا حقیقی نظریہ حیات بھی پیش کرتے ہیں اور اُنہیں رہبانیت کے باطل تصور سے آشنائے حقیقت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کس قدر نادانی اور کیسی بدنصیبی ہے، جو اسلام کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے

کہ وہ صرف چند ایسے اعمال و ارکان بتاتا ہے، جن سے قوت وہمیہ
بڑھ کر انسان کے سارے قوائے دماغیہ پر مستولی ہوجاتی ہے، اُس کے
جذبات فنا ہوجاتے ہیں اور وہم کی ہمہ گیری و استیلا آخر اُسے ایک
راہب ولا یعقل بنا دیتی ہے۔'' پھر اِس تصور کی نفی کرتے ہوئے آگے
لکھتے ہیں: ''دوستو!، ومن اصدق من اللہ قیلا ، اللہ سے زیادہ سچا کون
ہوسکتا ہے دیکھو جب کہ وہ تمہارے دین کو ہر پہلو سے کامل، اُس کی
تعلیم کو ہر طرح کی رحمت و برکت کا ضامن اور پیغمبر ﷺ کی زندگی کو
تمہارے لیے نمونہ فرما رہا ہے تو پھر تمہارا ایسا خیال محض نا آشنائے
حقیقت ہونے کی دلیل ہے۔''(۹۰)

تیرے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالم پیری

صاحبِ بصیرت اور نباضِ وقت رہنماء

ایک صاحبِ بصیرت اور نباضِ وقت رہنماء کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ماضی حال اور مستقبل پر نگاہ رکھتا ہے۔ وہ ماضی کی روشنی میں حال کو بہتر بنانے اور مستقبل میں پیش آنے والے خطرات سے قوم کو آگاہ ہی نہیں کرتا، لائحہ عمل بھی فراہم کرتا ہے۔ برِعظیم میں ہندو اور مسلمان دو الگ مذاہب کے پیرو اور دو الگ تہذیبوں کے علمبردار تھے۔ اپنے اصولِ حیات معاشی مفادات نیز سیاسی عزائم اور قومی تصورات کے لحاظ سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے یکسر الگ اور جدا تھے اور اِس بات کا کوئی سوال اور امکان نہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے ماتحت رہ کر اپنے نظام زندگی کو قائم کرسکیں گے۔

پروفیسر سلیمان اشرف نے اِن خطرات کو محسوس کیا۔ آپ کی نگاہِ دوربیں دیکھ رہی تھی کہ انگریز بہت جلد اقتدار کی شاہِ کلید ہندوؤں کو سونپ کر یہاں سے روانہ ہونے والا ہے۔ اور مسلمان ایک کی غلامی سے نکل کر دوسرے کی غلامی میں جانے والے ہیں۔ چنانچہ آپ نے قوم اور لیڈرانِ قوم کو اِن درپیش خطرات سے آگاہی دیتے ہوئے لکھا:

"وہ ساعت دور نہیں جب کہ انگریز ہندوؤں کو اُن کا منہ مانگا سوراج
دے کر خود اپنے ملک و وطن کو چلے جائیں،اُس وقت ہندوؤں کی
اطاعت وفرمانبرداری اضطراری و بے اختیاری ہوگی،جس کی آستانہ
سوراج پر نہ کوئی قیمت ہوگی نہ کسی طرح کی قدردانی۔"(۹۱) اِس لیے بہتر
یہی ہے کہ خوابِ غفلت سے نکلو ...... کہ ...... "ضعف کو قوت سمجھنے میں
مسلمانوں کی تباہی ہے۔غفلت کو تیاری سمجھنا دشمن کے ہاتھوں میں گرفتار
ہونا ہے۔"(۹۲) ...... اُٹھو اور جاگو ...... کہ...... "حکومت انگریز کی ہو یا
ہندوؤں کی اسلام واہل اسلام کیلئے اِس میں کوئی فلاح نہیں ہے۔"(۹۳)

سیّد سلیمان اشرف کا تجزیہ کس حد تک درست تھا اِس کا اندازہ ہندو نفسیات اور انڈین نیشنل کانگریس کے اندازِ سیاست سے واضح ہوجاتا ہے۔ پوری تحریک آزادی میں ہندوؤں اور کانگریس کی جدوجہد کا یہی مقصد اور محور رہا کہ ملک آزاد ہوجائے،انگریز یہاں سے چلے جائیں،اکثریت کے جمہوری اصولوں کے نام پر اقتدار ہمیشہ کیلئے ہندو کے ہاتھ لگ جائے اور وہ اپنی واضح اکثریت کی بناء پر ہمیشہ مسلمانوں پر حکمرانی کرتے رہیں۔ چنانچہ آپ نے متحدہ قومیت (ایک قومی نظریے) کے حامی نیشنلسٹ علماء اور مسلمانوں کو اِس خطرے کا احساس دلاتے ہوئے لکھا:

"ایک دشمن سے نجات پانے کی تدبیر میں رستگاری سے قبل دوسرے
دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوجانا نہ عقل کا فتویٰ ہے نہ تعمیل شریعتِ الٰہی
ہے۔"(۹۴) ...... اِس خام خیالی سے باہر نکلو کہ ہندو تمہارے ہمدرد،
دوست،معاون اور مددگار ہیں ...... لہٰذا صرف "مومنوں کے سوا کسی کو
اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ۔"(۹۵)

اور اپنے اتحاد و یکجہتی اور جداگانہ تشخص "مسلم قومیت" کو اختیار کرتے ہوئے اپنے تحفظ وبقاء کی فکر کرو کہ ؎

وطن کی فکر ناداں مصیبت آنے والی ہے

تیری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

"النور" دوقومی نظریے پر ایک مستند تاریخی دستاویز

یوں تو سیّد سلیمان اشرف کی تمام ہی تصانیف قومی وملّی وحدت،شعارِ اسلامی کے تحفظ ودفاع اور مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی و بحالی کی تجاویز و آراء سے مزین ہیں۔لیکن "الرّشاد اور النور" کو یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ اِس کے مندرجات مسلمانانِ ہند کے سیاسی،سماجی،تہذیبی اور معاشی استحکام کے ساتھ دوقومی نظریہ کے تحفظ واحیاء کے بھی آئینہ دار ہیں۔آپ کی یہ دونوں کتابیں اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ آپ کی تمام تر جدوجہد اور کوششوں وکاوشوں کا مرکز ومحور مسلمانانِ ہند کے جداگانہ تشخص وشناخت کا تحفظ اور قومی وملّی وحدت کی بقا واحیاء سے عبارت ہے۔سیّد سلیمان اشرف نے اپنی کتب کے ذریعے متحدہ قومیت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں اسلامی نظریہ "مسلم قومیت" کا چراغ روشن کیا اور دوقومی نظریہ کا حقیقی تصور اجاگر کیا۔

آپ کی ہمیشہ اوّلین ترجیح اور زاویہ نگاہ یہ رہا کہ تحریکِ خلافت،ترکِ موالات اور ہجرت جیسی تحاریک کے اثرات بد سے مسلمانانِ ہند کو بچایا جائے اور اُن میں اپنے قومی وملّی مفادات کے تحفظ کا شعور بیدار کیا جائے۔چنانچہ اِس ضمن میں سیّد سلیمان اشرف نے "الرشاد" اور النور" کے ذریعے اُنہیں نہ صرف موجودہ حالات سے آگاہی دی بلکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں روشن مستقبل کا دیرپا اور پائیدار حل بھی فراہم کیا۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ "الرّشاد اور النور" کا ایک ایک لفظ جراتِ اظہار کی مشعلیں ہی روشن نہیں کرتا بلکہ آپ کے زندہ جذبوں کی وہ پکار ہے جو مسلمانوں میں قومی امنگوں کو اجاگر کر کے اجتماعی طرز احساس کو بھی بیدار کرتا ہے۔

معروف اسکالر کیپٹن خالد درانی جو سیاسیات،معاشیات،تاریخ، تاریخ اسلام ، اسلامی مطالعہ، فارسی، اردو، بین الاقوامی اُمور پر ماسٹرز ڈگریاں رکھنے کے علاوہ ایل،ایل بی،ایم ایڈ اور ایم بی اے بھی ہیں۔پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف کی کتاب "النور" کے بارے میں لکھتے ہیں:

Tow Nation Theory and Tehreek e Khilafat has been the focus of this Book. The learned Professor has had deep insight and has driven home to the reader what miseries the points under debate have brought to the fate of millions of Indian Muslims(۹۶)

"یہ کتاب دوقومی نظریہ اور تحریکِ خلافت کے گرد گھومتی ہے۔ اِس موضوع پر فاضل پروفیسر کی نظر گہری ہے۔ وہ کروڑوں مسلمانوں کی خستہ حالی کا سبب بننے والے اُمور کی نشاندہی قاری پر بڑے موثر پیرائے میں کرتے ہیں۔" حقیقت یہ کہ آپ کی اِس تصنیف نے اسلامیانِ برصغیر پاک و ہند کی آنکھیں کھول دیں۔

پروفیسر فرخ صابری صاحب (السبیل، ص: ۴۶۔۴۵، ادارہ پاکستان شناسی) "النور" کو دوقومی نظریہ کی ایک مستند دستاویز قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

"اِس کتاب میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کے دوران کانگریسی لیڈروں کے دجل کا شکار ہوجانے والے (ملّی) رہنماؤں کا ذکر ہے۔ سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک یہ مسلم قائدین کوتاہ بینی کے شکار ہوچکے تھے۔ اِس کتاب "النور" نے اسلامیان برصغیر پاک و ہند کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ کتاب دوقومی نظریہ پر ایک مستند تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے...... آج پون صدی بعد کا قاری اِس کتاب میں مذکور مسائل اور مباحث کی نزاکت نہ جانے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ "النور" کی اشاعتِ جدید اُس دور کی مستند تاریخ ضرور سامنے لاتی ہے۔"

اسلامی نظریہ قومیت کا تحفظ و دفاع

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے نہ صرف تحریراً بلکہ تقریراً بھی مسلمانانِ ہند کی دینی و سیاسی رہنمائی کا فریضہ بطریق احسن انجام دیا۔ آپ نے تحریکِ خلافت، موالات اور ہجرت کے طوفانی و ہیجانی دور میں متوقع خطرات اور نقصانات سے بروقت آگاہی دی اور مسلمانان

ہند کو اُس انجام سے بچانے کی سعی کی، جس سے گاندھی کی گہری سیاست اُنہیں دوچار کرنا چاہتی تھی۔ علامہ اقبال کا یہ شعر آپ کے اِس جذبے کا بہترین عکاس ہے۔

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے
عکس اُس کا مرے آئینہ ادراک میں ہے

غیر منقسم ہندوستان کے اُس پرآشوب دور میں جب کہ "متحدہ ہندوستان" اور "ہندو مسلم متحدہ قومیت" کے نعرے بلند ہورہے تھے، کے خلاف سیّد سلیمان اشرف نے "جماعت رضائے مصطفےٰ" (جس کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں محدث بریلوی نے رکھی تھی۔ بحوالہ "تاریخ جماعت رضائے مصطفےٰ، از، شہاب الدین رضوی، ص:۵۵، فرید بک اسٹال، نومبر ۲۰۰۰ء) کے پلیٹ فارم سے بڑی جرات و ہمت کے ساتھ ۲۴، مارچ ۱۹۲۱ء کو ابوالکلام آزاد کی زیرصدارت بریلی میں ہونے والے جلسہ عام میں، اپنے بیباکانہ موقف کا اظہار فرمایا اور اُن کو مشرکینِ ہند کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط و اتحاد کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے اسلامی نظریہ قومیت "مسلم قومیت" کا بھرپور دفاع کرکے لاجواب کردیا۔ ذیل میں اِس اہم واقعہ کی تفصیلات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

دوقومی نظریہ کی نظریاتی جنگ کا اہم باب، مناظرۂ بریلی

تحریکِ ترکِ موالات کے ہیجانی دور میں جمیعت العلمائے ہند کے مقتدر رہنماؤں نے مولوی ابوالکلام آزاد کی صدارت میں ۲۴، تا ۲۶، مارچ ۱۹۲۱ء کو بریلی میں ایک جلسہ عام منعقد کرنے کا پروگرام بنایا۔ جس کیلئے غیر معمولی پروپیگنڈہ کیا گیا اور اشتعال انگیز عبارات پر مشتمل اشتہارات شائع کئے گئے۔ (۹۷) بظاہر اِس جلسہ کی غرض و غایت میں حفاظتِ اماکن مقدسہ، تحفظ خلافتِ اسلامیہ اور نصاریٰ سے ترکِ موالات کا نام لیا گیا، مگر درحقیقت اِس جلسے کا اصل مقصد متحدہ قومیت کا پرچار تھا۔ اِن اشتہارات کے نفس مضمون جو کہ رمز وکنایہ سے گزر کر صریحاً مناظرے اور مجادلے کی دعوت پر مبنی تھے، سے صاف ظاہر ہورہا تھا کہ جمیعت العلمائے ہند جلسے کے مخالفین یعنی دوقومی نظریہ کے حامیوں پر حجت تمام کرنا چاہتی ہے اور بزعم خویش اسلامی ملّی امتیاز اور دوقومی نظریہ کے تحفظ و حمایت میں اٹھنے والی آواز کو اُس کے

مرکز بریلی میں جاکر دبانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

چنانچہ دوقومی نظریہ کے علمبرداروں کیلئے ضروری ہوگیا تھا کہ اِس پروپیگنڈے کا مقابلہ کیا جائے ۔لیکن کسی جوابی کاروائی سے قبل علمائے اہلسنّت نے افہام وتفہیم کی فضا پیدا کرکے اختلافات کو دور کرنا مقدم جانا۔اُن کے نزدیک تعمیر فکر کے مقابلے میں تطہیر فکر زیادہ اہم تھی، چنانچہ طے کیا گیا کہ عوام الناس کیلئے مسائل حاضرہ میں ایک متفقہ لائحہ عمل متعین کیا جائے اور اُنہیں اُن غلطیوں سے بچایا جائے جو غلط طرزِ فکر کا نتیجہ تھیں۔

مگر افسوس کہ متعدد بار کی مراسلت اور باہم گفت وشنید کے باوجود منتظمین جلسہ کی جانب سے مثبت راہِ عمل اختیار کرنے اور جماعت رضائے مصطفیٰ کے صدر شعبہ مقاصد علمیہ مولانا امجد علی اعظمی کی جانب سے اٹھائے گئے ستر سوالات کے جوابات دینے کے بجائے نہ صرف مناظرانہ فضا کو برقرار رکھا گیا ، بلکہ عوام الناس کو برگشتہ وگمراہ کرنے کیلئے ۲۳، مارچ ۱۹۲۱ء کو ابوالکلام آزاد کی طرف سے محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں قدس سرہٗ (جو اُن دنوں بستر علالت پر زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے) کو لکھے گئے ایک خط میں دعوتِ مناظرہ دیتے ہوئے کہا گیا:

’’مسئلہ تحفظ صیانتِ خلافتِ اسلامیہ ،ترکِ موالات و اعانت اعدائے محاربین اسلام وغیرہ کی نسبت جناب کے اختلافات مشہور ہیں، چونکہ جمعیت العلما کا جلسہ یہاں منعقد ہورہا ہے اور یہی مسائل اِس میں زیر نظروبیان ہیں۔اِس لیے میں جناب کو توجہ دلاتا ہوں کہ رفع اختلافات اور مذاکرہ ونظر کا یہ مناسب وبہتر موقع پیدا ہوگیا ہے۔ جناب جلسہ میں تشریف لائیں اور اِن مسائل کی نسبت بطریق اصحاب علم وفن گفتگو فرمائیں۔‘‘ (۹۸)

حالانکہ اِس سے قبل جماعت رضائے مصطفیٰ کے نامزد وفد کے ساتھ جمعیت علمائے ہند کے اکابر کی زبانی گفتگو ہوچکی تھی اور تحریری بیانات کا تبادلہ بھی ہو چکا تھا۔مگر ابوالکلام آزاد نے موضوع مناظرہ ’’اِتمام حجت تامہ‘‘ کو تو ہاتھ نہ لگایا اور نہ ہی جماعت رضائے مصطفیٰ کی

تحریروں اور مطبوعہ اشتہارات کا جواب دیا، جبکہ طالبانِ مناظرہ اور اصل فریق وہ تھے۔اِس کے برخلاف ابوالکلام آزاد نے محدث بریلوی کو طلب مناظرہ کیلئے خط لکھ دیا۔ جبکہ محدث بریلوی اِس مناظرہ میں نہ تو سائل تھے اور نہ ہی طالبِ مناظرہ۔ درحقیقت آزاد کا یہ طرزِ عمل دیگر اکابر جمعیت کی طرح مناظرہ سے فرار کا ایک حیلہ تھا۔

دوسری طرف آزاد کی جانب لکھے گئے خط اور جمعیت العلمائے ہند کی استقبالیہ کمیٹی کی جانب شائع ہونے والے تازہ اشتہار میں تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے اپنے ہی سابقہ دعوؤں سے پہلوتہی کی گئی۔ کیونکہ جمعیت العلمائے ہند کے اجلاس بریلی کے انعقاد سے قبل شائع ہونے والے متعدد اشتہارات میں جلسہ ہذا کا مقصد مخالفین ترکِ موالات اور موالاتِ نصاریٰ کے حامیوں پر اتمام حجت بتایا گیا تھا ۔مگر مولانا آزاد کے خط میں محل نزاع تحفظ مقاماتِ مقدسہ اور صیانتِ سلطنتِ اسلامیہ وغیرہ قرار پائے۔

جبکہ محدث بریلوی اُمور مذکورہ کے علاوہ ترکِ موالات و ہندومسلم اتحاد وغیرہ پر آٹھ سال قبل قرآن وسنت کی روشنی میں اپنا ٹھوس وجامع موٴقف پیش کرچکے تھے۔ اِس لحاظ سے یہ دراصل ابوالکلام آزاد اور جمعیت العلمائے ہند کی جانب سے اصل معاملے کو پس پشت ڈال کر راہِ فرار اختیار کرنے کی ایک دیدہ ودانستہ کوشش تھی۔

اِس تناظر میں جماعت رضائے مصطفیٰ کے نامزد وفد کی جانب سے ابوالکلام آزاد کو جلسہ میں حاضر ہوکر براہِ راست اپنا موقف پیش کرنے کے مطالبہ کا ایک اور خط لکھا گیا۔ دوسری جانب پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے بھی ناظم اعلیٰ جمعیت العلمائے ہند مولانا عبدالماجد بدایونی اور ناظم استقبالیہ کمیٹی مولوی عبدالودود کو ذاتی حیثیت میں مراسلے ارسال کئے ۔افسوس کہ ابوالکلام آزاد نے تو جماعت رضائے مصطفیٰ کے وفد کے خط کا کوئی جواب نہیں دیا، البتہ مولوی عبدالودود کی جانب سے سیّد سلیمان اشرف کو یہ مایوس کن جواب موصول ہوا:

’’ہر کس وناکس سے نزاع ومخاصمہ کرنا خدام ملت کے نزدیک بے نتیجہ اور بے سود ہے۔‘‘ (۹۹)

جس پر پروفیسر سیّد سلیمان اشرف نے ۲۴، مارچ کی صبح جوابی خط ارسال کرتے

ہوئے لکھا:

''جلسہ جمعیت العلما کا منعقدہ بریلی کا رقعہ دعوت فقیر کے پاس بھیجا (گیا ہے)۔فقیر نے شرکت سے قبل اَمر مابہ النزاع کا تصفیہ چاہا، آنجناب اِس بے بضاعت کو ''ناکس'' قرار دے کر گفتگو سے اعراض فرماتے ہیں،امام اہلسنّت مجدد ماتہ حاضرہ سے طالب مناظرہ ہوتے ہیں،انصاف شرط ہے کہ رقعہ دعوت فقیر کے پاس بلا واسطہ بھیجا جائے اور گفتگو کی جب نوبت آئے اُسے ''کس وناکس'' کہا جائے۔اُس کے احقاق حق کو نزاع ومخاصمہ قرار دیا جائے ،کیا یہی شیوہ ٔخدام ملت ہے۔

آخر میں نہایت ادب سے گزارش ہے کہ براہ کرم قبل نماز جمعہ فقیر کو اپنے جلسے میں بحیثیت سائل حاضر ہونے کی اجازت عطا فرمائیں۔''(۱۰۰)

مگر حسب سابق وہی ٹال مٹول، حیلے بہانے اور لمبی خاموشی کے جب مسلسل حربے استعمال کئے گئے تو اراکین جماعت رضائے مصطفٰے مولانا حامد رضا خاں، مولانا امجد علی اعظمی، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا ظفرالدین بہاری، مولانا حسنین رضا خاں، مولانا برہان الحق جبلپوری اور سیّد سلیمان اشرف عوام اہلسنّت کی کثیر تعداد کے ہمراہ متنازعہ فیہ اُمور کے تصفیہ اور اسلامیانِ ہند کو درپیش موجودہ مسائل و آئندہ کے متفقہ لائحہ عمل طے کرنے کی خاطر جلسہ گاہ پہنچے۔

عوامی مطالبے اور پنڈال کی بدلتی ہوئی صورتحال نے منتظمین جلسہ کو مجبور کر دیا کہ وہ وفد کو اپنا موقف بیان کرنے کا موقع دیں۔چنانچہ ابوالکلام آزاد نے جماعت رضائے مصطفٰے کے وفد کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف سیّد سلیمان اشرف کو تقریر کیلئے پینتیس (۳۵) منٹ کا وقت دیا۔وہ بھی اِس لیے کہ اُن کے نام جمعیت العلمائے ہند کی جانب سے اجلاس میں تقریر کا دعوتی پیغام بھیجا جا چکا تھا اور اب اُن کے پاس سیّد صاحب کو وقت دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔(۱۰۱)

اِس موقع پر سیّد سلیمان اشرف نے جماعت رضائے مصطفٰے کی طرف سے مناظر

اور سائل دونوں کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے درپیش مسائل حاضرہ،تحفظِ سلطنت اسلامیہ، صیانتِ مقامات مقدسہ اور ترکِ موالات جیسے اُمور پر نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ مابہ الاتفاق اور مابہ الاختلاف کو بیان فرمایا۔اور جماعت رضائے مصطفٰے، بریلی کی جانب سے اہل سنت و جماعت کے دینی وسیاسی موقف کی وضاحت اور معاندین اہل سنت کے نظریات و معمولات کا بھرے مجمع میں پردہ فاش کرتے ہوئے ابوالکلام آزاد جیسے زور آور خطیب کو ایسا حیران و ششدر کر دیا کہ آزاد کے معتمد خصوصی اور اڑتیس برس کے رفیق مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی ''ذکر آزاد'' میں تمام تر کذب بیانی کے باوجود یہ تسلیم کرتے نظر آئے:

''اِس میں شک نہیں کہ سیّد سلیمان اشرف بڑے فصیح و بلیغ مقرر تھے۔ موصوف کی تقریر نے جو بہت لمبی تھی، کانفرنس کو ہلا ڈالا۔''(۱۰۲)

مولوی عبدالماجد دریا آبادی نے اِس صورتحال کا نقشہ بیان کرتے ہوئے لکھا:

''مخالفین کی طرف میدانِ خطابت کا ایک پہلوان ،شہ زور اور پیل تن اکھاڑے میں اتارا گیا۔کشتی پر کشتی مارے ہوئے ،داؤں پیچ کی استادی میں نام پائے ہوئے اور اُس (سیّد سلیمان اشرف) نے تقریر یہ مارا ،وہ مارا کے انداز میں شروع کی۔جلسہ پر ایک نشہ کی سی کیفیت طاری تھی اور خلافت والوں کی زبان پر وظیفے یا حفیظُ کے جاری تھے۔(۱۰۳)

اور وہ مجسمہ حیرت بنے بے بسی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

سیّد سلیمان اشرف نے دوٹوک انداز میں اپنا اور جماعت رضائے مصطفٰے کا موقف پیش کرتے ہوئے ترکِ موالات و ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں پر واضح کر دیا:

''جہاں مذہبی حدود آئیں، مسلمان الگ اور ہندو الگ (قوم ہیں) ہم اپنے مذہب میں ہندوؤں سے اتحاد نہیں کر سکتے۔غرض مقامات مقدسہ و خلافتِ اسلامیہ کے مسائل میں ہمیں اختلاف نہیں۔ ہندوستان کے مفاد کی کوشش کیجئے ، اِس سے ہمیں اختلاف نہیں۔ اختلاف اُن حرکات سے ہے جو آپ لوگ منافی و مخالفِ دین کر رہے ہیں......اگر آپ لوگ

اپنی تمام منافیٔ دین حرکات چھوڑ دیں گے، اُن سے اپنی بیزاری ظاہر کردیں گے تو ہم خدمت و حفاظتِ مقاماتِ مقدسہ و خلافتِ اسلامیہ میں آپ کے ساتھ ہیں۔'' (۱۰۴)

حاضرین جلسہ گواہ ہیں کہ مناظرہ بریلی میں سیّد سلیمان اشرف نے اسلامیانِ ہند کی رہنمائی کا نہ صرف حق ادا کیا بلکہ ابوالکلام آزاد و دیگر کانگریسی علماء کی غیر شرعی حرکات کا مواخذہ کرکے اُنہیں بے بس ولاجواب بھی کردیا۔ محدث بریلوی ہمیشہ فرمایا کرتے تھے:

''سیّد سلیمان اشرف صاحب جس وقت مباحثہ میں تنقیحات قائم کرتے ہیں اُسی وقت حریف کو شکست دے دیتے ہیں۔'' (۱۰۵)

اِس مناظرے کی روداد بیان کرتے ہوئے مولانا سیّد نعیم الدین مرادآبادی لکھتے ہیں کہ:

''مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب نے اِس خوبی سے تقریر فرمائی کہ اپنے اعتراضات بھی پیش کردیئے اور اُن کی غلطیاں بھی دکھلائیں اور مجمع میں کوئی بے چینی بھی پیدا نہ ہوئی، بلکہ مجمع قبول کے کانوں سے حضرت مولانا کی تقریر سنتا رہا۔ بار بار اللہ اکبر کے نعرے اور تحسین و آفریں کی صدائیں سننے میں آرہی تھیں...... مولانا کی تقریر کے بعد مولوی ابوالکلام آزاد نے ایک مختصر سی تقریر کی۔ جس میں حضرت مولانا سیّد سلیمان اشرف صاحب کے ساتھ اپنے سابقہ تعلقات دوستی و محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا کے تشریف لانے اور تقریر فرمانے پر بہت اظہار مسرت کیا...... مولوی ابوالکلام نے حضرت مولانا سلیمان اشرف صاحب کے بہت سے اعتراضات کا تو جواب بھی نہیں دیا اور جن کی نسبت کچھ لب کشائی کی، اُن کو تسلیم کیا، کسی کسی بات میں غیر ذمہ دار شخصوں کی آڑ بھی پکڑی۔ مگر مجمع نے مولوی ابوالکلام کی (جوابی) تقریر سے اُن کے عجز و اعتراف قصور کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔'' (۱۰۶)

اور یوں ''پورا میدان مولانا سلیمان اشرف صاحب کے ہاتھ رہا۔'' (۱۰۷)

اِس طرح قومی و ملّی اور اسلامی تشخص و شناخت کے محافظ اور حامی علمائے اہلسنّت و جماعت کو اِس معرکہ میں شاندار فتح حاصل ہوئی۔ واضح رہے کہ مناظرہ بریلی نہ صرف ہماری مذہبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے بلکہ ہمارے ملّی تشخص کے تحفظ و امتیاز اور دوقومی نظریہ کی نظریاتی جنگ کا ایک اہم باب بھی ہے۔

دوقومی نظریے کے اصل نظریاتی محافظ

۱۹۱۹ء سے ۲۶۔۱۹۲۵ء تک کا دور تحریکِ خلافت، ترکِ موالات، ہجرت، ترکِ گاؤ کشی اور فتنہ ارتداد جیسے طوفانوں کا زمانہ ہے۔ یہی وہ دور ہے، جس میں برِعظیم کی ملت اسلامیہ اور ہندوؤں کے درمیان ''مسلم قومیت'' اور ''متحدہ قومیت'' کی نظریاتی جنگ لڑی گئی۔ اِس نظریاتی جنگ میں محدث بریلوی، مولانا حامد رضا خان، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا عبدالعلیم صدیقی، سیّد محمد محدث کچھوچھوی، مولانا عبدالحامد بدایونی، پیر جماعت علی شاہ، خواجہ قمر الدین سیالوی، مفتی شائستہ گل، پیر عبدالرحیم پیر آف بھرچونڈی شریف، پیر آف مانکی شریف اور پیر آف زکوڑی شریف وغیرہ اور بالخصوص سیّد سلیمان اشرف نے اپنا سارا وزن ''دوقومی نظریے'' کے پلڑے میں ڈالے رکھا اور کمال بصیرت سے کام لیتے ہوئے مسلم قومیت کے اسلامی تشخص کا بھرپور تحفظ و دفاع کیا۔ اِس نظریاتی جنگ اور اِن حضرات قدسیہ کی مساعیٔ جمیلہ کی داستان بیان کرتے ہوئے ممتاز قانون داں خالد لطیف گابا نے اپنی کتاب ''مجبور آوازوں'' میں لکھا:

''دوقومی نظریہ جس پر بڑے بڑے بحث و مباحثے ہوتے رہے ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ یا آل انڈیا مسلم کانفرنس یا دیوبند (۱۰۸) یا جامعہ ملیہ کی تخلیق نہیں تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اِس نظریے کے مصنف نہ تو محمد علی جناح تھے اور نہ علامہ اقبال۔ دوقومی نظریہ تو ۱۹۲۰ء میں ایک مشہور اور مسلمہ نظریہ بن چکا تھا۔ اُس وقت جناح صاحب کانگریس کے رہنماء اور بقول سروجنی نائیڈو ''ہندو مسلم اتحاد'' کے سفیر تھے۔'' (۱۰۹)

جناب خالد لطیف گابا کا مندرجہ بالا اقتباس اِس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ دوقومی نظریے کے اصل محرک اور محافظ کون لوگ ہیں۔آج اِس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اللہ کریم نے علمائے اہلسنّت و جماعت کو یہ سعادت بخشی کہ وہ روزِ اوّل سے ہی دو قومی نظریہ کے موئید و حامی اور اِس کے تحفظ و احیاء کیلئے ہر گھڑی آمادۂ پیکار رہے۔اور انہوں نے کبھی کانگریسی فلسفے و قیادت کو قبول نہیں کیا۔کیوں کہ

''انہیں اِس بات کا یقین تھا کہ اِس طرح مسلمان آہستہ آہستہ اپنی جداگانہ شخصیت کو ضائع کردیں گے اور وہ ہندوؤں کے خیالات اور طور طریقے قبول کرلیں گے۔'' (۱۱۰)

اِس مقام پر ڈاکٹر جہانگیر تمیمی کی گواہی تاریخ کا وہ سچا اور کھرا سچ ہے جسے ہمارے تعلیمی نصاب اور نوجوان نسل سے دور رکھنے کی دیدہ و دانستہ کوشش کی گئی ہے۔زوال سے اقبال تک، میں ڈاکٹر جہانگیر تمیمی لکھتے ہیں:

''مسلمانانِ برعظیم کی عظیم اکثریت اہلسنّت والجماعت کے حامل بریلوی مکتبہ فکر کا بہ حیثیت مجموعی رویہ ہندو اکثریت کے گرداب میں دھنسنے اور پھنسنے کے یکسر خلاف رہا۔اِس ضمن میں تحریکِ خلافت سے لے کر تحریکِ پاکستان تک اُن کا رویہ ملتِ اسلامیہ کے ساتھ ساتھ اور پاس پاس رہا۔اور شاید ہی کوئی بریلوی عالم اِس قابل ہو کہ جس کا تذکرہ بطور کانگریس نواز کیا جاسکے۔بلکہ مشائخ اور اہل اللہ نے تحریکِ پاکستان میں خانقاہوں سے نکل کر حضرت قائد اعظم کا ساتھ دیا۔یہاں تک کہ بنارس اور اجمیر شریف میں ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء جیسے فیصلہ کن سالوں میں کانفرنسوں کے ذریعے پاکستان اور نظریہ پاکستان کے ساتھ قائد اعظم کی اطاعت میں مسلمانوں کی جنگِ آزادی اور آزاد وطن کیلئے ہم نوائی کی۔'' (۱۱۱)

اور انہوں نے جس سیاسی بصیرت اور دوراندیشی کا مظاہرہ کیا،اُس کا اُن کے

معاصرین سیاست اور قوم پرست علماء میں فقدان نظر آتا ہے۔

سیّد سلیمان اشرف اور دوقومی نظریہ

سیّد سلیمان اشرف وحدتِ ملی اور دوقومی نظریہ کے داعی و ترجمان تھے۔آپ نے متحدہ قومیت کے نظریہ کے خلاف اُس وقت آواز اٹھائی جب علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ بھی اُس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر اور ہندو مسلم اتحاد کیلئے کوشاں تھے۔اقبالؒ ترانہ ہندی اور نیا شوالہ جیسی نظمیں لکھ کر نقش دوئی مٹانے کی کوششوں میں مصروف تھے تو قائد اعظم محمد علی جناح ''ہندو مسلم اتحاد کے سفیر'' کے لقب سے جانے اور پہچانے جارہے تھے۔

اُس وقت سیّد سلیمان اشرف اپنی خداداد بصیرت کی بناء پر عصری حادثات کا درک کرتے ہیں اور حالات وواقعات کے تناظر میں مسلمانوں کی بقاء کا راستہ متعین کرتے ہوئے علمی قدم اٹھاتے ہیں۔آپ مسلمانوں میں جداگانہ قومیت کا احساس جگاتے ہیں اور دوقومی نظریہ کا تصور واضح کرتے ہیں۔یہ دوقومی نظریہ کے حق میں اُٹھنے والی وہ پہلی آواز ہے جو آپ نے ۱۹۱۱ء میں اپنی کتاب ''البلاغ'' کے ذریعے بلند کی۔اور مسلمانانِ ہند کو اُن کی جداگانہ قومیت کا احساس دلاتے ہوئے لکھا:

''ہماری قومیت کی حالت تمام دیگر اقوام سے جدا اور سب سے زیادہ محبوب و دلکش ہے۔نگاہ اٹھاؤ اور اکناف عالم پر غور کرو تو کہیں ہم وطنی ایک کو دوسرے کا ہم قوم بناتی ہے،کہیں اتحاد و زبان،کہیں یک رنگی شکل وصورت۔پھر باوجود ہم قوم ہونے کے تم دیگر اقوام میں متمول کو غیر متمول سے اعلیٰ کو ادنیٰ سے ایسا برتاؤ کرتے ہوئے پاؤ گے جس سے ہم قومی کو ننگ و عار آتا ہوگا۔لیکن ہم مسلمانوں کی قومیت مذہب اور صرف مذہب سے ہے۔ہماری قومیت کی بقاء اسلام و ایمان سے قائم ودائم ہے۔جس قدر قوتِ ایمانی وجذباتِ اسلامی ہم میں مضبوط ہوں گے اُسی قدر ہماری قومیت ٹھوس و مستحکم ہوگی اور جتنا اِس میں اضمحلال پیدا ہوگا اتنا ہی ہماری قومیت سست و ناتواں رہے گی۔'' (۱۱۲)

مطالعہ سیرت بتاتا ہے کہ رسولِ کامل ﷺ نے مسلمانوں کو شرعی قوانین واحکام کا پابند بنانے سے پہلے اُن کے درمیان وحدت ومساوات پیدا کرنے پر زور دیا اور کوہِ صفا سے جو اعلان کامیابی وکامرانی نشر فرمایا اُس میں تمام لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''یاایّھا النّاسُ قُولُوا لاَ الٰہَ الاّ اللّٰہُ تُفلِحُوا '' یعنی اے لوگو! لاالٰہ الا اللہ کہو کامیاب رہوگے۔ دین اسلام میں لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ قومی وحدت کا وہ بنیادی اصول ہے جس میں اُمت کی کامیابی وکامرانی کا راز مضمر رہا۔ جب تک اُمت مسلمہ اِس کلمہ پر متحد اور جمع رہی کامیابی و کامرانی نے اُس کے قدم چومے۔ یہ اِسی نعرے کی گونج تھی جس نے قیامِ پاکستان کو دنیا کے نقشے پر عملی شکل عطا کی۔

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک مسلمانوں کے قومی وملّی زوال کی سب سے بڑی وجہ اِس اُصول سے دوری اور انحراف تھا۔ چنانچہ ۲۹، دسمبر ۱۹۱۴ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اٹھائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ راولپنڈی کے ساتویں سیشن سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے بڑی خوبصورتی سے برِعظیم کے مسلمانوں کے قومی امراض کی تشخیص کی اور اتحاد و کامیابی کا وہ اُصول بیان کیا جو اِس کلمہ میں پوشیدہ ہے۔ آپ نے اپنے خطاب میں قوم کو لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر متحد ومنظم ہونے اور اپنی جداگانہ قومی وحدت اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''دیکھئے قوم سرتاسر مریض ہے بیماریوں نے کوئی حصہ جسم کا چھوڑ نہیں رکھا ہے۔ اب اِس وقت علاج کونسے مرض کا کیا جائے جس سے تمام بیماریاں خود بخود زائل ہوجائیں۔ آیا اُسے جہالت کے مرض سے علوم عقلیہ پڑھ کر شفا ہو۔ یا تمدن کی مفرحات دی جائیں یا سلطنت کا جواہر مہرہ اُسے استعمال کرایا جائے۔ غرض یہ کہ کیا کیا جائے جس سے یہ مریض نہ صرف صحیح وتندرست ہوجائے بلکہ دوسرے مریضوں کیلئے اُس کا وجود اکسیر اعظم بن جائے۔ تو اِس کا صحیح وسچا جواب وہی پہلی تعلیم رسول ﷺ کی ہوگی جو سب سے پہلے آپ نے اپنی قوم کو فرمائی۔ وہی حقیقی

علاج تھا اُس قومِ مریض کا اور وہی سچی شاہراہ تھی ترقی کی اور وہی کلید تھی خزائن تمدن کی۔ کیا تم سے وہ اوّلین تعلیم مخفی و مجہول ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ کہہ اُٹھو لاَ الٰہَ الّا اللّٰہُ مُحَمّدٌ رَسُولُ اللّٰہِ صلّی اللّٰہِ عَلَیہِ وسلّم یہی تھا سراپا مرض قوم کا علاج کہ اَیّھَا النّاسُ قُولُوا لَا الٰہَ الّا اللّٰہُ''(۱۱۳)

''الرّشاد'' ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اِس میں بھی آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے باطل فلسفہ کے مقابلے میں دوقومی نظریہ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا:

''مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز کا فرق اٹھا دینا اپنی ہستی پر اپنے ہاتھوں تیر چلانا ہے...... اتحاد کی کوشش قومیت کا نیست ونابود کرنا ہے، اشتراک وامتیاز کی سرحدوں کو نمایاں رکھنا اپنی قومی ہستی کو قائم وباقی رکھنا ہے۔''(۱۱۴)

خیال رہے کہ دین اسلام کسی بھی غیر مسلم قوم سے ایسے میل ملاپ اور تعلقات جس میں اسلامی اقدار اور روایات اور جداگانہ مسلم تشخص وشناخت کی نفی ہوتی ہو منع کرتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں آپ اِسی اسلامی تشخص اور مسلمانوں کی علیحدہ قومی وحدت کی وضاحت کرتے ہوئے ''النور'' میں یوں لکھتے ہیں:

''مذہبِ اسلام نے اپنے متبعین کو یہ ہدایت فرمائی کہ تمہارا غیر مسلم قوم سے کسی حال میں بھی ایسا میل جول نہ ہونا چاہیے جس سے فرقِ اسلام و غیر اسلام مٹ جائے، ایسا تعلق خواہ تمہارے معاملات (یعنی اعمال وجوارع) کا پایا جائے یا معتقدات (یعنی تصدیقات قلبیہ) کا شریعت کے نزدیک جرم عظیم ہے۔''(۱۱۵)

آگے اِس کی تشریح اور مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلام نے اپنے متبعین کو کفار سے بیگانگی کا حکم اِس تاکید ومبالغہ سے دیا ہے تاکہ معاشرتی اُمور میں بھی یہ ہدایت کی گئی تھی کہ کفار کی تقلید اِس میں بھی نہ ہونے پائے، وضع لباس، شکل وصورت، ماکل ومشارب

> وسلام وتحیۃ تعزیۃ وتہنیت غرض جملہ شعبہائے حیات مسلم تقلید کافر سے
> مصئون ومحفوظ رہے۔''(۱۱۶)

آپ حکم شرعی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شریعت محمدی ﷺ نے اپنے پیروی کرنے والوں کو ایک غیر مسلم قوم
> سے صداقت و روداد پیدا کرنے سے منع کیا، وہ دل جس میں اللہ اور
> اُس کے رسول برحق کی محبت ہو اُس میں ایسے اشخاص یا اقوام کی کہاں
> سمائی ہوسکتی ہے جو اللہ اور اُس کے رسول کے دشمن ہوں۔''(۱۱۷)

آج تعلیم کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ تعلیم نہ صرف انسان کو مہذب بناتی اور اُس کے اخلاق و کردار کو سنوارتی ہے بلکہ زندگی کے دشوار گزار اور پر پیچ راستوں پر چلنے کیلئے اُس کے اندر حوصلہ اور جرات بھی پیدا کرتی ہے۔ یہ انسان کو احساسِ سود وزیاں عطا کرتی ہے اور کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے کا وہ شعور بخشتی ہے جو غلامی سے آزادی کی راہ دکھاتا ہے اور جذبہ آزادی کو مہمیز کرتا ہے۔

سیّد سلیمان اشرف دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم کے حصول کو بھی مسلمانوں میں قومی شعور کی بیداری اور حصول آزادی کیلئے ضروری خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نصابِ تعلیماتِ اسلامیہ کیلئے تجاویز دیتے ہوئے آپ نے اِس کی اہمیت وافادیت پر ہی زور نہیں دیا بلکہ اِسے قومی وحدت کی بقاء وتحفظ کی لازمی ضرورت قرار دیتے ہوئے ''السبیل'' میں لکھا:

> ''کاش اب بھی مسلمان بیدار ومتنبہ ہوں..... تو اُن کی قومیت کچھ دنوں
> تک اور بھی بقاء کا فیض پاسکے گی۔ ورنہ جب یہ آفتاب غروب ہوجائے
> گا تو پھر تاریک شب کی سیاہی مسلمانان ہند کی قومیت پر ایسی چھا جائے
> گی کہ چراغ وشمع کا تو کیا ذکر برقی روشنیاں بھی اُن کے خدوخال اور
> شکل وصورت کو عیاں نہ کرسکیں گی۔''(۱۱۸)

سیّد سلیمان اشرف کے دل ودماغ میں دوقومی نظریہ کا تصور بالکل واضح اور راسخ

تھا۔ آپ اُس وقت بھی اِس تصور کی آبیاری کررہے تھے جس وقت ہندومسلم اتحاد کے فکر وفلسفہ نے بڑے بڑے نامی گرامی سیاسی لیڈروں، علماء اور عوام کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۴ء تک شائع ہونے والی کتب ''البلاغ، الخطاب، الرّشاد، النور اور السبیل'' کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ آپ مسلمانان ہند میں جداگانہ مسلم قومیت کا احساس جگاتے رہے اور دوقومی نظریہ کا تصور اجاگر کرتے رہے۔

پروفیسر شیخ محمد رفیق، سید مسعود حیدر بخاری اور پروفیسر نثار احمد چوہدری کی تالیف ''تاریخ پاکستان'' کا درج ذیل حوالہ سیّد سلیمان اشرف کی ان کوششوں اور کاوشوں کا گواہ ہے جس میں یہ مولفین لکھتے ہیں:

> ''مولانا سلیمان اشرف جو مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے خلیفہ اور علی
> گڑھ میں دینیات کے پروفیسر تھے۔ اُس زمانے میں بھی ہندومسلم اتحاد
> کو غلط قرار دیتے تھے جب تحریک خلافت کی وجہ سے مسلمان قائدین
> نے گاندھی کو اپنا لیڈر بنالیا تھا۔ وہ کفر واسلام کے اتحاد کو خواہ وہ انگریز
> کے ساتھ ہو یا ہندو کے ساتھ خارج از امکان قرار دیتے تھے۔''(۱۱۹)

مندرجہ بالا شواہد کو سامنے رکھتے ہوئے اس تاریخی حقیقت سے صرف نظر ممکن نہیں کہ سیّد سلیمان اشرف نے بروقت اور برملا اپنے موقف کا اظہار کیا اور اس راہ میں کسی مخالفت اور الزام تراشی کی پرواہ نہ کی۔ سیّد سلیمان ندوی کے بقول ''علی گڑھ کی سیاسی آندھیاں بھی اُن کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں۔''(۱۲۰) آپ کے شاگرد اور مشہور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی اُس زمانے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کلمہ حق کہنے کی پاداش میں:

> ''مرحوم (سیّد سلیمان اشرف) مطعون ہورہے تھے، لیکن نہ چہرے پر
> کوئی اثر تھا اور نہ معمولات میں کوئی فرق..... سیلاب گزرگیا۔ جو کچھ
> ہونے والا تھا وہ بھی ہوا۔ لیکن مرحوم نے اُس عہد سراسیمگی میں جو کچھ
> لکھ دیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت وہی تھی۔ اُس کا ایک ایک حرف
> صحیح تھا۔ آج تک اُس کی سچائی اپنی جگہ قائم ہے۔ سارے علماء سیلاب

کی زد میں آچکے تھے۔صرف مرحوم اپنی جگہ قائم تھے۔'' (۱۲۱)

اور اُس وقت بھی اظہار حق کر رہے تھے جب دانشوروں کی عقلیں ماؤف و ششدر تھیں۔لیڈران قوم کی بصیرت و بصارت زائل ہو چکی تھی۔علمائے سیاسی کی زبانیں خاموش اور گنگ تھیں۔کسی کو لب کشائی کی ہمت و جرات نہ تھی۔مگر سیّد سلیمان اشرف تن تنہا اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ اِس لیے ادا کر رہے تھے کہ

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

کوئی رکاوٹ، کوئی مخالفت اور کسی قسم کی توہین و تضحیک آپ کے عزم، حوصلے، استقامت اور ارادوں کو متزلزل نہ کر سکی۔گو مخالفین نے آپ کے خلاف اخبارات میں مضامین لکھے، گالیاں دیں، فتوے لگائے۔مگر سیّد سلیمان اشرف نے استقامت اور سچائی کے ساتھ نامساعد حالات کا مقابلہ کیا اور اپنے ناقدین اور مخالفین پر واضح کر دیا کہ:

''آج اخبار و جرائد تمہارے ہاتھوں میں ہیں جسے چاہو گالیاں دو، کافر کہو، حق کو باطل اور باطل کو حق کہو اور چھاپ کر شائع کرو، اِس وقت تمہاری بات بن آئی ہے، مخلوق اندھی ہوگئی ہے، لیکن ایک وقت آئے گا اور ساری حقیقت عریاں ہو جائے گی۔'' (۱۲۲)

لیکن حقیقت اُس وقت تک عیاں نہیں ہوتی جب تک وہ کہ ٹھوس حقائق، دلائل، تنقید اور تجربے کی کسوٹی پر پورا نہ اترے۔تاریخ کی کسوٹی پر سچ ثابت ہونے والے نظریات ہی نسل انسانی کی نجات کا ذریعہ بنتے ہیں۔سیّد سلیمان اشرف نے جو کچھ کہا وقت نے ثابت کیا کہ وہی حق اور سچ ہے۔اُسی میں مسلمانوں کی بقاء و نجات کا راز پوشیدہ ہے۔آپ کا کہا ہوا ایک ایک لفظ وقت کی کسوٹی پر درست ثابت ہوا۔پھر بعد کے حالات نے جب آپ کے فرمودات کی حقانیت و سچائی صفحۂ وقت پر مسلم کر دی تو تحدیثِ نعمت کے طور پر آپ نے یوں ارشاد فرمایا کہ:

''جس وقت ساری زبانیں گنگ تھیں مجھ گنہگار کی زبان کلمہ حق کہہ رہی

تھی، جس وقت سارے اقلام خشک تھے مجھ بے بضاعت کا قلم مصروفِ تحریر تھا، جس وقت سارے پاؤں مفلوج تھے مجھ ضعیف کا پاؤں منزل رساں تھا...... یہ تو اللہ کا فضل تھا...... مولیٰ تبارک و تعالیٰ کا ہزار احسان اور اُس کے کرم خاص کا ہزار ہزار شکر کہ جس چیز کو آج آپ قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں فقیر کو دس برس قبل قوم کے سامنے پیش کرنے کی ہدایت فرمائی گئی...... الحمد للہ...... منزل مقصد تک یہ بے بضاعت پہنچا اور استقامت کے لطائف سے سعادت اندوز ہوا۔'' (۱۲۳)

کسی نے خوب کہا ہے کہ ''سچ کا اپنا لمحہ ہوتا ہے، وقت کے بعد سچ بولنا بیکار ہے۔ صرف جیئں نہیں زندوں کی طرح جیئں، جہاں تک ہو سکے جیئں، مر کر بھی جیئں'' پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف کی پوری زندگی اِس کی مصداق ہے۔دور اندیشی، عقابی روح، اصابتِ فکر، جرات و عزیمت، حق گوئی و بے باکی، بصیرت و فراستِ ایمانی، بلند نگاہی اور عالی حوصلگی اُن کے خمیر میں پیوست تھیں۔آپ نے بروقت قومی و ملّی مسائل کا حل اور امراض کی تشخیص و علاج تجویز کیا۔مردانہ وار حالات کا مقابلہ کیا۔اولوالعزمی اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھتے رہے اور ایک مردِ آہن کا کردار ادا کرتے ہوئے دو قومی نظریے کے فروغ و احیاء کیلئے وہ مدبرانہ دور بینی کا مظاہرہ کیا جو کسی آہنی اعصاب رکھنے والے انسان ہی کا کام تھا۔اقبالؒ نے ایسے ہی صاحبِ بصیرت مردِ مومن کیلئے کہا ہے۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا

دو قومی نظریہ وقت کے بدلتے تناظر میں

ڈاکٹر جہانگیر تمیمی ''زوال سے اقبال تک'' میں لکھتے ہیں کہ آج اگر ہم دو قومی نظریے کو تقسیم ہند سے پہلے اور بعد کے بدلتے حالات واقعات کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ قومیں دین سے بنتی ہیں نہ کہ سرزمین سے۔اِس جہاں تاب حقیقت کا علمبردار اسلام ہے۔یہ محض اصول ہی نہیں اِس میں سنتِ رسول اللہ ﷺ کا حتمی اظہار

وعمل بھی شامل ہے۔ کتاب وسنت کو ہی ماخذ اسلام مانا جاتا ہے۔ خدا کے آخری پیغام قرآن اور خدا کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ کی سنت ہر لحاظ سے حتمی اور ختمی حیثیت کی مہر ہے۔ اس سے سرمو انحراف کی نہ کوئی گنجائش ہے، نہ اجازت ہے۔ دین کے دائرہ کا اقرار واعلان ہی کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے بعد کفر اسلام کی لکیر کھینچ دی گئی ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی مرضی کے تابع رہنے کو مومن کہتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے ایک ہی جملے میں دین کی حیثیت اور حضور ﷺ کی خاتمیت کا تصور کاملیت یکجا کر دیا ہے، جس میں قوم بنانے کی حتمی بنیاد حضور ختمی مرتبت ﷺ کا پیغام عمل ہے، اور جس میں نمونہ کامل موجود ہے۔ فرمایا:

''اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا۔ لیکن بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم ﷺ کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔'' (۱۲۴)

یہی سبب ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضور ﷺ کی بعثت اور اعلانِ نبوت کے ساتھ ہی یہ ''دو قومی نظریہ'' اپنی ملت کی تشکیل اور عمل میں آنا شروع ہوگیا۔ قریش قبیلہ، عربی زبان، رشتے میں چچا ابولہب اور ابوجہل دونوں مسلمانوں کے مردود ہیں۔ جبکہ حبشہ کے حضرت بلال ؓ فارس کے حضرت سلیمان فارسی ؓ اور روم کے حضرت صہیب رومی ؓ ملتِ اسلامیہ کے روشن ستارے ہیں اور رسول خدا ﷺ کے پیارے ہیں۔ یہاں تک ہجرت کا عمل بھی سنت رسول ﷺ کی گواہی بن کر ترکِ وطن پر دین کو ترجیح دینے کا دوسرا نام ہے۔ مغرب کے نسلی نیشنلزم کے جدید تصورات یا دھرتی پوجا کا بھدا تصور، پیوند خاک ہونے کی حالت ہے، جبکہ اعلیٰ ادراک اور آفاقی شعور میں تو وسعتِ قلب ونظر کا یہ عالم ہوجاتا ہے کہ مسلمان کا شعور ملک وملت یہ کہہ اٹھتا ہے کہ

''ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست''

حقیقت یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ یا مسلم قومیت کا دینی شعور تا قیامت جس ذاتِ اطہر ﷺ کے گرد طواف جاں کرتا رہے گا، وہ ذات رسول ﷺ ہے۔ وہ حتمی اور کامل نمونہ حیات

ہیں۔ نبوت کے الٰہی ادارے کا فیضان آپ ہی کی ذات اطہر ﷺ پر جاکر تکمیل پذیر ہوا ہے۔ ''لقد کان فی رسول الله اسوۃ حسنة'' اور حضور سرکار خاتم النبیین ﷺ تمہارے درمیان بہترین نمونہ ہیں۔

فی الجملہ یہ کہ قوم درحقیقت رسول اکرم ﷺ کے نام پر ایک ساتھ دل دھڑکنے کا نام ہے۔ جن کے دل ایک ساتھ دھڑکیں وہ ایک قوم ہیں۔ یہی ''دو قومی نظریہ'' ہے، یہی ملت ہے اگر اِسے اُمت بھی کہہ لیں تو بات مکمل ہوجاتی ہے۔

مملکتِ مدینہ کی بنیاد ونہاد یہی ربطِ مسلسل ہے۔ جس نے آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کو منظم ومتحد اور مکمل قوم بنا ڈالا۔ یہی وہ معرکہ دین ووطن ہے جو برعظیم پاک وہند میں ۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۰ء کے سیاسی عشروں میں برپا ہوا تو اکابرینِ اہلسنّت وجماعت، محدثِ بریلوی و مولانا نعیم الدین مرادآبادی اور بالخصوص پروفیسر سیّد سلیمان اشرف بہاری نے مومنانہ فراست سے کام لیتے ہوئے مسلمانانِ ہند اور لیڈرانِ قوم کو متنبہ فرمایا:

''اِس طرح مسلمان آہستہ آہستہ اپنی جداگانہ شخصیت کو ضائع کردیں گے اور وہ ہندوؤں کے خیالات اور طور طریقے قبول کرلیں گے۔'' (۱۲۵)

بالفاظ دیگر مشرکوں اور کافروں کے ساتھ مل کر ایک قوم نہیں بنائی جاسکتی۔ اسی بات کو علامہ اقبال اِن الفاظ کا روپ دیتے ہوئے فرماتے ہیں ''ہندوستانی قومیت کا اقرار اُمت کے جداگانہ وجود کا انکار ہے۔'' (۱۲۶) یعنی

اپنی ملت پہ قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی ﷺ

برعظیم پاک وہند میں مسلمان کم وبیش ایک ہزار برس تک حکمران رہے اور یہیں رچ بس گئے، مگر مقامی ہندو قوم نے مسلمانوں سے اپنا روایتی فاصلہ برقرار رکھا اور نتیجتاً ہندو قوم اِس خطے میں اکثریت ہی رہی مسلمانوں میں مدغم نہ ہوئی، انگریزی اقتدار کا زمانہ اِس قوم کیلئے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا، کیونکہ انگریزوں نے مسلمانوں کو بطور حریف اور ہندوؤں کو بطور حلیف ساتھ ملاکر ہندوستان پر اپنے عرصہ اقتدار کو دوام دینے کی بھرپور سعی کی، مسلمانوں

کو معاشی، معاشرتی اور سرکاری سطح پر پیچھے دھکیل کر پوری منصوبہ بندی سے ہندو قوم کو آگے بڑھایا۔ اور

"جب اِس خطے میں برطانیہ کا دم واپسیں شروع ہوا، تو ہندو قوم انڈین نیشنل کانگریس کے ترنگے تلے یورپ کے جمہوری اُصولوں کی بناء پر پورا ہندوستان اپنے نام کرانے کیلئے انگریزوں سے پہلے تعاون، پھر عدم تعاون، کبھی مزاحمت، کبھی مذاکرات، کبھی سول نافرمانی، کبھی ہڑتال کبھی بھوک ہڑتال، کبھی عدم تشدد، کبھی تشدد، کبھی مزاکرات میں شرکت کبھی مذاکرات سے انکار، غرضیکہ ہر حربہ اور ہتھکنڈہ استعمال کیا گیا۔ تا کہ پورے کا پورا ہندوستان کانگریس کے ہاتھ لگ جائے، کبھی ہندوستان چھوڑ دو، کبھی ہندو فوج کے نیتاجی سوبھاش چندر بوس بذریعہ بندوق انگریزوں سے اقتدار چھیننے کے درپے رہے۔" (۱۲۷)

مگر ایک مسئلہ اور معاملہ ایسا تھا جو ہندو قیادت کیلئے بے بسی کی تصویر بن گیا کہ برعظیم کی مسلم قوم کو کیونکر ساتھ لے کر پورے کا پورا ہندوستان ہندو اکثریت کے زیر تسلط اور زیر دام آجائے۔ اسی مرحلہ پر وہ تاریخی تعصب بھی بے نقاب ہو گیا، جب تحریکِ خلافت میں ہندو مسلم اتحاد کے وقتی مظاہرے میں گاندھی کی شمولیت نے اپنا رنگ جمایا۔

یہیں سے کانگریس کے تھکے ہارے لیڈروں کو مسلم عوام، علماء اور متحرک اور فعال کارکنوں کو اپنے ساتھ ملانے کی راہ سوجھی۔ اور یہیں سے قوم پرست نیشنلسٹ سرحد کے خدائی خدمت گار، یوپی میں جمعیت علمائے ہند اور اُس کے رضا کار بلکہ پنجاب اور دہلی کی حد تک مجلس احرار بھی شریک فتنہ "متحدہ قومیت" ہو گئے اور انڈین نیشنل کانگریس کی ہمراہی ہی نہیں براہ راست قیادت میں متحدہ قومیت کا دام ہمرنگ زمین لیے تحریکِ پاکستان کے خلاف روایتی مذہبی ملاؤں کا ایک برسر منبر گروہ جبہ و دستار کی فضیلت کا خراج وصول کرنے برعظیم کے سادہ لوح مسلمانوں پر پل پڑا۔

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے

اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

اِن روایتی مذہبی رہنماؤں میں اپنے وقت کے بڑے بڑے زعماء، فضلاء اور علماء شامل ہیں۔ مولوی ابوالکلام آزاد جیسا روشن دماغ ادیب و انشاء پرداز شخص کانگریس کا ہم نوا ہو کر متحدہ قومیت کی تشریح و تفسیر ہی نہیں مکمل تصویر بن جاتا ہے۔ بقول مشہور مورخ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی:

"مسلمانوں کے قومی مفاد کو جس بے حسی بلکہ سنگدلی سے قربان کرنے کا شرف حضرت امام الہند (ابوالکلام آزاد) کے حصے میں آیا وہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا۔" (۱۲۸)

اُن کی ذات اور اُن کی جماعت کے ہاتھوں برعظیم پاک و ہند کی مسلم ملت کا سوختہ برطانوی گرداب اور ہندو عتاب کا بیک وقت شکار ہی نہیں ہوا، بلکہ مسلم ملت کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ شریعت مآب رہنماؤں کی ایک موثر کھیپ گاندھی کے چرنوں میں اُن سمیت متحدہ قومیت کا فلسفہ اٹھائے، شریعت کو ہندو اکثریت سے ہم آہنگ بنا کر خطے کے کروڑوں مسلمانوں کے دکھی دلوں کی آواز پاکستان کو ناممکن بنانے پر جت جاتی ہے۔ یوں مفسر قرآن سے امامِ ہند تک اور پھر صدر کانگریس سے وزیر تعلیم ہند تک کا سفر مولوی ابوالکلام آزاد کی عبقریت کو ہی نگل جاتا ہے۔ اور انہیں "تجھے کیا خبر کہ کیا ہے تو نہ رہ نورد نہ راہی" کی عملی تصویر بنا دیتا ہے۔

یہیں سے مولوی حسین احمد مدنی جو ایک طبقہ فکر میں مذہبی اتھارٹی کے طور پر محترم جانے جاتے ہیں، اپنی سیاسی فکر اور فلسفہ کے لحاظ سے ہندو مسلم بھائی بھائی کا نعرہ ہی نہیں لگاتے بلکہ جغرافیہ کی قوم "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" کے نقیب بن کر بھی سامنے آتے ہیں۔ اِس مرحلہ تاریخ پر حضرت اقبالؒ اس فکری صورتحال کو یوں واضح کرتے ہیں۔

عجم ہنوز نہ داند رموز دین ورنہ
زدیوبند حسین احمد این چہ ابوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است

المیہ یہ ہے کہ تاریخ میں ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، عنایت اللہ مشرقی (۱۸۸۸ء۔۱۹۶۳ء)، عطا اللہ شاہ بخاری، مظہر علی اظہر اور چوہدری افضل حق وغیرہ کے کہے ہوئے الفاظوں کی بازگشت آج بھی موجود ہے۔ (۱۲۹) یہ وہ لوگ تھے جو دو قومی نظریے کے مخالف اور متحدہ قومیت کے دام ہم رنگ زمین تھے۔

لیکن برِعظیم کی ملتِ اسلامیہ نے ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی اور دیگر متحدہ قومیت کے علمبرداروں کی خواہشات کو ہی ناکام نہیں بنایا بلکہ ان پر واضح کر دیا کہ " خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ" برعظیم کی تقسیم اور ۱۵، اگست ۱۹۴۷ء کی صبح طلوع ہونے والا سورج اُس سورج سے مختلف تھا جس کے طلوع ہونے کی انہیں برسہا برس سے توقع تھی اور جس کیلئے انہوں نے اپنی زندگی کی ساری توانائیاں جھونک دی تھیں۔

اب اُن کے قدموں سے زمین نکل چکی تھی اور ان کی حالت اُس شخص کی مانند تھی جس کی کشتی طوفان نے تباہ کر دی ہو اور جسے بھنور سے نکلنے کا راستہ دکھائی نہ دیتا ہو۔ دوسری جانب وجود میں آنے والا نیا ہندوستان اب ایک منقسم ہندوستان تھا۔ تقسیم نے صورتحال یکسر بدل کر رکھ دی تھی۔ جس کی وجہ سے:

> "منقسم ہندوستان میں اِن متحدہ قومیت کے علمبرداروں کے سامنے تین بڑے راستے تھے۔ اوّلاً، متحدہ قومیت کے جس راستے پر وہ اب تک گامزن تھے اور ملک کی سیاست میں غیر مسلموں کے اشتراکِ عمل سے جو کردار ادا کرنا چاہتے تھے اسی سابقہ رویے پر گامزن رہیں۔ ثانیاً، صورتحال کے یکسر بدل جانے سے اب جب کہ سیاسی رویئے کی فرسودگی پوری طرح واضح ہو چکی ہے اِس رویے کو یکسر ٹھکرا کر ایک نئے روپ کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ثالثاً، متحدہ قومیت کا انکار یا اقرار کیے بغیر اب نئی صورتحال کے پیشِ نظر کتاب و سنت کی رہنمائی میں ایک نیا لائحہ عمل ترتیب دیا جائے۔ لیکن ایسا کرنے میں بھی انہیں اپنی ناکامی

> کا اعتراف اور سابقہ سیاسی رویے سے اپنی برأت کا اظہار کرنا پڑتا۔ پھر تقسیم کے بعد مسلمانوں کی جان و مال کو جو سخت خطرہ لاحق ہو گیا اور ہر طرف بڑے پیمانے پر قتل عام کا بازار سجایا جاتا رہا، اِس نے اِن قائدین کو کسی نئی ابتداء کے بجائے ایک ایسے عمل پر مجبور کر دیا جس کا ماحصل صرف اور صرف یہ تھا کہ اِس ملک (بھارت) میں زندگی کی امان پانے کیلئے کچھ جواز فراہم ہو جائے۔" (۱۳۰)

اِس لیے کہ ۱۵، اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی مسلمانانِ ہند کیلئے متحدہ قومیت کی جنم بھومی کے بجائے شمشان بھومی بن چکی تھی۔

چنانچہ اب اِن کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح پاکستان بننے سے ہندوستانی مسلمانوں کے دامن پر جو داغ لگا ہے اُسے کسی حد تک دھویا جائے اور خود کو وطن پرست ثابت کیا جائے۔ یہی وجہ تھی کہ متحدہ قومیت کے تلخ نتائج سامنے آجانے کے باوجود ابوالکلام آزاد، حسین احمد مدنی اور اُن کے رفقا کیلئے کسی نئے راستے کی نشاندہی اور تعین کا کام اِس لیے مشکل کام رہا کہ اِس میں اپنے سابقہ نظریات سے دست برداری کی ذلت اور اُن نفوس قدسیہ کی سچائی وعظمت کا اعتراف چھپا تھا۔ جو انہیں ہندو عقیدت و دوستی میں مسلم ملت کو پہنچنے والے سیاسی، سماجی اور مذہبی نقصانِ عظیم سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔

چنانچہ ابتدائی دنوں میں یہ سیاسی قیادت "ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی منزل کیا ہوگی؟ ملک میں اُن کیلئے کون سا سیاسی نظام اختیار کیا جائے گا؟ اور یہ کہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے مستقبل کو کیسے محفوظ و مامون رکھا جائے گا؟ جیسے بنیادی سوالات سے دامن بچائے رہی۔ لکھنو کنونشن ۱۹۴۷ء جسے نئے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مسلمانوں کے پہلے سیاسی اجتماع کی حیثیت حاصل ہے، وہاں اِس کے علاوہ اور کچھ نہ ہوا کہ جمعیت العلمائے ہند کو دینی اور ثقافتی مسائل میں رہنمائی تک محدود کرتے ہوئے اُس کی سیاسی حیثیت کو تحلیل کر دیا گیا، اور چیخ چیخ کر اِس بات کا اعلان کیا گیا کہ مسلمان اِس ملک کے وفادار ہیں۔ لہٰذا اپنی وفاداری اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی خدمات کے طفیل انہیں بھی زندہ رہنے

کا حق دیا جائے۔

چنانچہ سیکولرازم اور جمہوریت کے سب سے بڑے داعی بھارت میں یہ حق آج بھی سوالیہ نشان ہے۔آزادی کے ستر (۷۰) برس بعد بھی بھارت کے ۱۵ کروڑ سے زائد مسلمان ''ہمیں بھی زندہ رہنے دو'' حق کی تگ ودو میں مصروف ہیں۔وہ آئین کی گارنٹیاں، دستور کی ضمانتیں اور تحفظات کی یقین دہانیاں لیے ایک سہمی ہوئی اقلیتی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اُن کی اقتصادی حالت بدتر ہے۔اعلیٰ تعلیم کا حصول مشکل ہے۔

بھارت میں مسلمانوں کی شرح خواندگی سب سے کم یعنی ۱۸ فیصد ہے۔وہ اپنی مرضی سے زمین و جائیداد کی خرید وفرخت نہیں سکتے۔ بھارتی معاشرے، سرکاری اداروں اور حکومت کی نظر میں اُن کی وطن پرستی اور وفاداری کو شکوک وشبہات کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور انہیں مہان دیش بھارت میں وقتاً فوقتاً قتل عام کا بھی سامنا ہوتا رہتا ہے۔

بھارت میں مسلمان تنگ نظر ہندو اکثریت کے ہاتھوں آئے دن تشدد کی زد میں رہتے ہیں۔یہاں اب تک لگ بھگ چالیس ہزار مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں۔گزشتہ ستر (۷۰) برس کے دوران خون آشام بھارت میں مسلم اقلیت پر دانشوروں کے زاویئے آج بھی جس اَمر کی نشاندہی کرتے ہیں اُس سے ہندو ذہنیت:

> ''ظاہری لباس و اطوار اور زبان کی تبدیلی کے باوجود بباطن ہندو کی ہندو ہی رہی'' کا عکس دیکھنے میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔(۱۳۱)

آج بھارت میں مسلمانوں کی دگرگوں حالت دراصل ایک قومی نظریہ'' متحدہ قومیت'' کا ہی معروضی عکس ہے۔جس کے پیچھے ملت گریز اور متحدہ قومیت کی اختیار کردہ وہ راہ عمل تھی جس کا درپردہ مقصد جمہوری اکثریت کے نام پر مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے ہندو قوم کا غلام بنانے کا انتظام تھا۔بدقسمتی سے اِس کارخیر میں متحدہ قومیت کے حامی زعماء، فضلا اور وہ علما شریک کار تھے:

> ''جنھوں نے مسلم مفادات وتحفظ کے وسائل کی تدبیر کرتے ہوئے انگریزوں کو برعظیم سے نکالنے کی سعی کرنے کے بجائے'' (۱۳۲)

اپنا سارا وزن دوقومی نظریے کی مخالفت میں متحدہ قومیت کے پلڑے میں ڈالے رکھا۔یہ برعظیم کے مسلمانوں کی قومی جدوجہد سے انحراف اور دوقومی نظریہ کی آفاقی حیثیت سے انکار تھا۔آج بھی متحدہ قومیت کے حامی اکابرین کی اِس فکری کجی،کوتاہ بینی اور خطائے اجتہادی کا تاوان بھارت کے مسلمان ادا کررہے ہیں۔جبکہ تقسیم کے بعد خود اِن افراد نے اپنے قول وفعل اور عمل ثابت کیا کہ متحدہ قومیت کے راستے کا انتخاب دراصل اُن کی زندگی کی سب سے بڑی فاش غلطی تھی۔(۱۳۳)

اَمر واقعہ یہ ہے کہ اِن افراد کا طرزِ عمل دوقومی نظریہ کی آفاقی حیثیت و اہمیت کو اجاگر ہی نہیں کرتا بلکہ اُن اکابرینِ ملت کے موقف کو بھی درست ثابت کرتا ہے جنھوں نے تحریکِ خلافت،ہجرت،موالات،ترکِ گاؤکشی اور شدھی وسنگھٹن جیسی اسلام ومسلمان دشمن تحاریک کے دوران بھی قومی وملی غیرت وحمیت کو زندہ رکھا اور مومنانہ بصیرت کے چراغ روشن کرکے برعظیم کی ملتِ اسلامیہ کو درِ مصطفیٰ ﷺ کی گدائی کی راہ دکھلائی۔

دوقومی نظریہ اور مسلم قومیت کے جس مطالبے کو ہندوؤں اور بعض نیشنلسٹ رہنماؤں نے اپنے نشانے پر رکھا۔آج وقت نے ثابت کردیا کہ محدث بریلوی، اُن کے خلفا بالخصوص سیّدسلیمان اشرف بہاری کے بعد مفکر پاکستان علامہ اقبال و بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کا موقف برعظیم کے مسلمانوں کیلئے دینی وسیاسی بصیرت کا حامل تھا اور ہے۔

اِن نفوسِ قدسیہ نے بیسویں صدی میں زوال آشنا ملت اسلامیہ ہند کی بقاء اور عیار ہندو اور مکار انگریز کے چنگل سے آزاد کرانے کیلئے مسلمانانِ ہند کو اسلام اور صاحب اسلام ﷺ کے اِس حقیقی پیغام کہ ''خودکو نبی کرم ﷺ کی بارگاہ بے کس پناہ میں لے جاؤ،دین دراصل آپ ﷺ کی ذاتِ اطہر کا نام ہے۔'' سے آشنا کیا''۔

با مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اُوست
اگر با او نہ رسیدی، تمام بولہبی است

سیاسی بصیرت وآگہی

سیّدسلیمان اشرف برعظیم کے اُن ممتاز علمائے ذی وقار میں سے ہیں جنھیں قدرت

نے سیاسی بصیرت وبصارت دونوں سے نوازا تھا۔آپ کا دل ملتِ بیضاء کی فکری بیداری اور اُس کے روشن مستقبل کیلئے آشنائے درد تھا۔ سیّد صاحب کے نزدیک اسلام محض رسوم و عبادات اور عقائد کا نام نہیں بلکہ ایک فعال، سرگرم اور متحرک نظریہ حیات سے عبارت ہے۔ جس میں حریت، آزادی، بے نیازی، زور حیدری اور فقر بوذر کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور جو ہر ظلم و جبر، محکومی اور غلامی کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے۔

سیّد سلیمان اشرف نے برعظیم میں اٹھنے والی تحریکِ خلافت، ترکِ موالات و ہجرت، ترکِ گاؤکشی اور سنگٹھن وشدھی جیسی اسلام اور مسلمان دشمن تحاریک کے اثرات ومضمرات سے برعظیم کے مسلمانوں کو بروقت نہ صرف آگاہ کیا بلکہ اپنی سیاسی بصیرت وآگہی سے مستقبل کا لائحہ عمل بھی متعین فرمایا۔اور اِس ضمن میں اپنے کرب وآگہی کی داستان ''البلاغ، الخطاب، الرّشاد، النور، اور السبیل''، جیسی معرکۃ الآلعراء تصانیف کی صورت میں اردو زبان اور اسلامی ادب کے سانچے میں پیش کی۔ چنانچہ اِس حوالے سے ڈاکٹر عبدالباری لکھتے ہیں:

''اُن کی سیاسی آگہی سے متعلق کاوشوں کے ثمرات خصوصیت سے اُن کی تین مطبوعہ کتابوں ''النور، البلاغ اور الرشاد'' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اِس راہ میں اُن کی فکری موشگافیوں کے مختلف گوشوں سے آراء کا اختلاف ہوسکتا ہے لیکن یہ کہے بغیر چارۂ کار نہیں کہ اگر علمائے ہند کے سیاسی رجحانات اور اُن کی کارکردگی کی تاریخ مدنظر رکھی جائے تو مولانا سلیمان اشرف بھی ایک بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ ہمیں اُن کی کاوشوں کے آئینے میں کچھ ایسے پہلو بھی نظر آسکتے ہیں جس سے وطنی آزادی اور ملّی بیداری کے ضمن میں علمائے ہند کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کا کوئی نیا گوشہ بھی منظر عام پر آسکتا ہے۔ دوسرے ہم اُن کی فکری فہمائشوں کی روشنی میں آج کے اور مستقبل قریب کے ملّی مسائل کی عقدہ کشائی میں بھی مدد حاصل کرسکتے ہیں۔ تحریک آزادی کے باب میں مولانا سلیمان اشرف کی قدر وقیمت دو حیثیتوں سے اور بھی بڑھ

جاتی ہے ایک طرف تو وہ مولانا فضل حق خیر آبادی کی تحریک آزادی کے سرفروشوں سے بہرہ مند ہوتے نظر آتے ہیں کیونکہ اُنہوں نے مولانا ہدایت رسول خاں جون پوری سے براہِ راست کسبِ فیض کیا تھا جو مولانا خیر آبادی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ دوسری طرف آپ کا تعلق دبستان علی گڑھ اور تحریکِ سر سیّد سے یوں جڑا رہا کہ آپ نے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر اور ناظم کی حیثیت سے تقریباً تیس (۳۰) سال علی گڑھ میں گزارے تھے۔'' (۱۳۴)

قوم کی فکری بیداری کا درد سیّد سلیمان اشرف کے دلِ دردمند میں کس طرح جاں گزیں تھا اِس کا اندازہ خود مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ۱۹۲۰ء کا زمانہ ہے اور تحریکِ خلافت کی باتیں چل پڑی ہیں۔ دیکھئے سیّد صاحب کس طرح ملت کو بیداری کا درس دیتے ہیں اور کیسی بصیرت افروز باتیں کرتے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں:

''کارخانۂ عالم ایک تعلیم گاہ ہے اور حوادثِ یومیہ کا درس قانون قدرت کا زبردست مدرس، ہر آن ہمیں دیا کرتا ہے، جس نے صحیفۂ ہستی کا مطالعہ کیا اور سمجھا وہ کامیاب ہوا۔ اور جس نے اِس سے کچھ بھی چشم پوشی کی اُس نے ناکامی کی ایسی ٹھوکر کھائی کہ قصر نیستی میں گر کر پھر نہ سنبھلا۔ یہ جابر زبردست مدرس کبھی اِس کا خیال نہیں کرتا کہ گرا کون اور سنبھلا کون۔ اِس کا درس ہمیشہ اُسی سرگرمی سے جاری رہتا ہے اور غافل سست، کاہل، تعیش پسند اور عاقبت نا اندیش جماعت فنا ہوتی جاتی ہے اور عاقل چُست محنتی مآل بیں طبقہ وجود میں آکر بقا کا لطف اٹھاتا ہے یہ ایک ایسا بدیہی مسئلہ ہے جس میں نہ کسی برہان کی حاجت نہ دلیل کی ضرورت۔ مشاہدات یومیہ اِس پر شاہد عادل ہیں۔ آؤ تھوڑی دیر کیلئے اِس درس گاہ میں ہم جماعتِ اسلامیہ کو دیکھیں کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ آیا اُس استاد کے سبق سے بیداری اختیار کرتی ہے یا ایک خوش گوار فسانہ

سمجھ کر اپنی نیند کا ذریعہ جانتی ہے۔ آہ! افسوس! یہاں تو عجیب وحشت ناک سماں ہے۔ دیکھو دیکھو شرق سے تا غرب تمام جماعتِ اسلامیہ اِس طرح پاؤں پھیلائے بے خبر سو رہی ہے کہ موت کی صدا بھی انہیں بیدار نہیں کرتی۔ انّا للّٰہ ثم انّا للّٰہ۔ مرتے مرجاتے ہیں مگر انہیں خبر نہیں۔ فنا ہوتے جاتے ہیں مگر آگاہی نہیں، نیست کیے جارہے ہیں مگر احساس و شعور نہیں۔ تمہیں حیرت ہوگی کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے، یہ تو اپنے استاد کے بڑے محبوب تلامذہ تھے، آج اِن پر یہ چشم عتاب کیوں ہے۔؟ اِن کا وجود تو تخلیق عالم کا نتیجہ وحاصل تھا! اُن کی ہستی دیگر اقوام کیلئے برہان و نمونہ تھی اِن سے مدرسہ عالم کی زینت اور دنیا کی رونق تھی! پھر یہ کیوں تباہ کیے جارہے ہیں۔؟ اِن کا نام کیوں محو ہورہا ہے۔؟ اِس کا سچا و صحیح جواب یہ پاؤ گے کہ ایک مدت سے سبق سیکھنا اور استاد کی باتوں پر کان لگانا انہوں نے چھوڑ دیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا جو ہورہا ہے......

جب سے مسلمانوں میں خودی پیدا ہوئی اور شاہانہ رنگ آیا، تقویٰ جو تمام محاسنِ اخلاق کی روح ہے گم ہوگیا۔ اُسی وقت سے بے توجہی بھی ہوگئی اِدھر زمانے سے سبق لینا انہوں نے کم کیا اُدھر استاد نے آہستہ آہستہ اُنہیں مراتب عالیہ سے گرانا شروع کردیا۔ گو ایک مدت تک اُن کی پستی بھی دوسروں کی بلندی سے بلند رہی مگر تابہ کے۔؟'' (۱۳۵)

پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کے افکار ونظریات کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ ملتِ اسلامیہ کی مرحلہ وار بیداری اور آزادی کے قائل تھے اور اِس کیلئے علم وعمل کے ساتھ مالی استحکام اور اعلیٰ اخلاق وکردار کو ضروری خیال کرتے تھے۔ آپ کا کہنا تھا:

''جس قوم کے پاس نہ دولت ہو، نہ اچھے اخلاق نہ علم ہو، نہ تدین، ایسی گری ہوئی مردہ قوم کے سامنے وہ پیش کرنا جو کسی زندہ قوم کیلئے سزاوار تھا خیر خواہی نہیں بلکہ بدخواہی ہے۔'' (۱۳۶)

جب ملکی سطح پر تحریکِ آزادی کا مسئلہ جنگِ آزادی کے مرحلوں سے بہت قریب آگیا اور مسلم لیگ وکانگریس کے حلقہ اثر کی باتیں سامنے آئیں تو لامحالہ آپ کے نزدیک اِس صورتحال کے نتائج کا لحاظ کرنا ضروری ہوگیا۔ آزادیٔ وطن کیلئے کون سا سیاسی موقف اپنایا جائے اور مستقبل کے آزاد ملک میں مسلمانوں کی عزت و وقار کی بحالی کیلئے کون سا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔؟

یہ دو ایسے سوالات تھے جس کا سیاسی سوجھ بوجھ کے ساتھ حل پیش کرنا از حد ضروری تھا۔ چنانچہ سیّد سلیمان اشرف نے اِن دونوں سوالوں کا حل اپنے مخصوص زاویۂ فکر کی روشنی میں پیش کیا۔ اِس سلسلے میں انہوں نے مسلمانوں کے کانگریسی اور لیگی زعماء سے ہٹ کر اور کلیۃً اخلاص پر مبنی مسلمانوں کے ملّی تشخص کی باتیں کیں اور ہندو اور مسلم قومیت کے واضح نقوش وخطوط متعین کرتے ہوئے لکھا:

''ایسے سارے معاملات جن کا ہند کی صلاح وفلاح سے تعلق ہے اُس میں دونوں کو متفق اللسان وہم زبان ہونا چاہیے، مدافعت آفات میں دونوں قوموں کے بازو بلا امتیاز قومیت ہمدردانہ ومساویانہ معاضدت سے ساعی ہوں۔ لیکن خصوصیات مذہب میں ایک کا دوسرے سے بالکل علیحدہ اور بے تعلق رہنا ہی اولیٰ ہے...... مذہبی اُمور میں ہنود مسلم کے مشیر اور شریک نہ ہوں، نہ ہنود کے مذہب میں مسلمان دخل دیں۔ اگر اِس میں بھی کوئی اتحاد کی کوشش ہوئی تو وہی نتیجہ سامنے آئے گا جو وکیل کی نسخہ نویسی سے مریض کو اٹھانا پڑا۔'' (۱۳۷)

آگے لکھتے ہیں ''فدایانِ وطن، مسلم اور ہنود کے اتفاق کا مقصد تو یہ تھا کہ اغراض سیاسی وملکی میں دونوں قومیں یک زبان ہوکر مطالبہ پیش کریں اور دونوں ہاتھ ایک بن کر انتظامات میں شریک ہوں۔ اِس اتفاق کا یہ مطلب تو ہرگز نہ تھا اور نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان، مسلمان نہ رہیں۔'' (۱۳۸)

سیّد سلیمان اشرف کے نزدیک قومی ترقی و خوشحالی اور ایک روشن مستقبل کا راز حصول تعلیم میں مضمر ہے چنانچہ آپ مسلمانان ہند کو اِس کی اہمیت و افادیت سے آگاہی دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسے دردمند مسلمان جنھیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ مسلمانوں کو من حیثِ قوم مسلم اُسی وقت ترقی نصیب ہوگی جب کہ اُن میں حقیقی معیارِ تعلیم کا اجراء ہوگا ...... (لہٰذا) ضرورت ہے کہ جلد سے جلد تر باہمی مشورے سے تعلیم گاہوں کا ایک صحیح نصب العین قرار دیا جائے۔'' (۱۳۹)

سیّد محمد سلیمان اشرف کے مندرجہ بالا افکار و نظریات سے اُن کے سیاسی شعور اور فکر و آگہی کی بالغ نظری کا پتا چلتا ہے۔ آپ کے یہ سیاسی افکار آج بھی ملک میں پیش آمدہ حالات کے پس منظر میں یقیناً اپنی اہمیت و افادیت رکھتے ہیں اور ہمارے لیے رہنمائی کے اسباب فراہم کرتے ہیں۔

وہی ہے تیرے زمانے کا امام برحق

سیّد سلیمان اشرف علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر ایک بلند پایہ مفکر، مفسر، فقیہ، ماہر تعلیم، فلسفی اور دانشور بھی تھے۔ کمال تو یہ ہے کہ وہ اُن تمام خوبیوں کے جامع تھے جو انفرادی طور پر دوسرے لوگوں میں شانِ افتخار اور اولوالعزمی کا سبب بنا کرتی ہیں۔ آپ اُن علمائے حق میں سے ہیں، جن کی جدوجہد نے برعظیم میں جذبہِ اسلامی اور تشخص ملی کو برقرار رکھا۔

یہ اُن کا اور دیگر علما و مشائخ اہلسنّت و جماعت کا عزم صمیم تھا جو بعد میں پاکستان کی تمہید ثابت ہوا۔ جب ہم تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور ترکِ گاؤ کشی وغیرہ میں پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف کے کردار و عمل کا جائزہ لیتے ہیں تو حضرتِ اقبالؒ کے اِن اشعار کا مفہوم واضح ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

وہی ہے تیرے زمانے کا امامِ برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
دے کر احساسِ زیاں تیرا لہو گرمادے

فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

سیّد محمد سلیمان اشرف زندگی بھر مسلمانانِ ہند اور عالم اسلام کے تحفظ و بقاء کیلئے آواز بلند کرتے رہے۔ وحدتِ ملی کا درس دیتے رہے اور جداگانہ قومیت کا احساس جگا کر مسلمانانِ ہند میں دو قومی نظریہ کے تصور کو اجاگر کرتے رہے۔ آپ نے محدث بریلوی کے بعد اُن کی اُسی فکر و نظریہ کو زندہ رکھا جس کی بنیاد و اساس دین اسلام فراہم کرتا ہے۔ آپ نے دین کی ترویج و اشاعت کیلئے اپنی پوری زندگی وقف کردی۔ اور ہمیشہ اُسی موقف کا اعادہ کیا جو زندگی بھر محدث بریلوی مولانا احمد رضا خاں کا رہا۔

سیّد سلیمان اشرف نے پژمردہ قلوب میں عشقِ نبوی ﷺ کے چراغ جلائے، شعائرِ اسلام کے تحفظ و بقاء کی خاطر علمی و قلمی جہاد کیا، اُمت مسلمہ کے عقائد و نظریات کو استحکام عطا کیا، خدا اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اور اسلام کے مسلمہ عقائد پر ہونے والے حملوں کا بھرپور دفاع کیا اور دلائل و شواہد کی روشنی میں احقاقِ حق و ابطال باطل کا فریضہ سرانجام دیا۔ بقول احمد جاوید، ریذیڈنٹ ایڈیٹر، روزنامہ انقلاب ممبئی، انڈیا:

''وہ جب تک جیئے قوم و ملت کے درد میں بے چین رہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے زوال نے اُن کو کبھی چین سے سونے نہیں دیا۔ کتابیں لکھیں، تقریریں کیں، دور دراز کا سفر کیا اور زبان و قلم کی ساری توانائیاں لگادیں۔ جو کچھ اُن کی چشمِ بصیرت نے دیکھا لوگوں کو دکھانے کی جدوجہد اپنی آخری سانسوں تک کرتے رہے۔'' (۱۴۰)

آپ نے ساری زندگی اشاعتِ دین و مذہب میں گزاری، بدمذہبوں اور گمراہوں کا ردِ بلیغ کیا، کئی شاہکار کتابیں تصنیف کیں۔ اور تحریر و تقریر اور وعظ و نصیحت بلکہ اپنے کردار و عمل، معمولات و تعلیمات کے ذریعہ مذہب اسلام کی بیش بہا خدمات انجام دیں اور ہمیشہ فکر اُمت میں لگے رہے۔ سیّد سلیمان اشرف کی حیاتِ مبارکہ کا ہر ہر گوشہ مذہبِ حق کی ترویج و تبلیغ اور قوم و ملت کی صلاح و فلاح سے عبارت ہے۔

یہ ہماری قومی و ملّی تاریخ وہ کربناک سچ ہے کہ ایک طرف تو یہ مخلص اور دردمند دل

رکھنے والے قومی وملّی مدبر و رہنما تھے جو دینی و سیاسی بصیرت اور تجربے کی بناء پر یہ رائے قائم کر چکے تھے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمان مستقبل میں بحیثیت ایک قوم تبھی زندہ رہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے دین کو اپنا راہنما بنالیں اور اپنی تہذیب وثقافت کے تحفظ وبقاء کی جدوجہد کریں۔تو دوسری طرف مذہب کے لبادوں میں ملبوس بڑے بڑے شیخ الہند اور شیخ الحدیث گاندھی کی نقاب پوش سیاست کے نقیب بنے متحدہ قومیت کے نظریے کو قرآن وحدیث سے ثابت کررہے تھے۔

اِن نیشنلسٹ علماء میں جمعیت العلمائے ہند اور مجلس احرار کے بڑے بڑے زعماء شامل تھے۔یہ سب ہی کانگریس کے مؤقف کے براہ راست یا بالواسطہ طور پر حامی تھے۔جو پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں متحدہ قومیت کا ڈھونگ پھیلا رہے تھے۔جب کہ ملت اسلامیہ ہند بڑے نازک دور سے گزر رہی تھی۔اور ایک طبقہ نے اپنی غیر ایمانی فکر کے باعث حالات سے سمجھوتہ کر رکھا تھا اور قوم کو کانگریس کا میٹھا زہر پلا کر سلا دینا چاہتا تھا۔

سیّد سلیمان اشرف نے اُس ہیجانی دور میں مسلمانانِ ہند کو گاندھی اور گاندھی نوازوں کی منافقانہ سیاست اور گاندھی کی مہاتمائیت کا طلسم توڑ کر سیاسی خودکشی سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ساتھ ہی مسلمانوں کے دلوں میں گاندھی کی محبت وعقیدت پیدا کرنے والے لیڈروں کا تعاقب بھی کیا۔آپ نے اپنی تحاریر وتقاریر سے اُس نازک اور پُرفتن دور میں اسلامیانِ ہند کی راہنمائی کا فریضہ ہی سرانجام نہیں دیا بلکہ بلاخوف لومۃ لائم مشرکین ہند کے ساتھ مسلمانوں کے اختلاط واتحاد کے خطرناک نتائج سے بھی آگاہ کیا اور علماء کو اُن کی دینی وملّی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر اپنی بالغ نظری، علمی ثقاہت اور سیاسی بصیرت کا بھی بین ثبوت دیا۔

سیّد سلیمان اشرف نے اُمت کو اُس وقت خلافتِ اسلامیہ کی حفاظت وصیانت کیلئے جگانے کی کوشش کی اور سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے اسباب اور اُس شکست وریخت کے عوامل کا جائزہ لے کر اُس کو بچانے کا لائحہ عمل پیش کیا جب کسی اور نے ایسی کوئی پہل نہ کی تھی۔لیکن آپ کے ساتھ ظلم یہ ہوا کہ جب یہ سلطنت آخری سانسیں لے رہی تھی اور اِس کو

بچانے کی آڑ میں پُرفریب سیاست کی گرم بازاری دین وشریعت کی دھجیاں اڑا رہی تھی، سیّد صاحب ہی وہ فردِ واحد تھے جو اپنی جرات اظہار کی بناء پر مخالفین کا ہدف ملامت بنے ہوئے تھے۔چونکہ آپ مسلمانوں کے علیحدہ ملّی تشخص کو متحدہ قومیت میں مدغم کرنے کیلئے کسی طور تیار نہ تھے اور مسلمانوں کے دینی اُمور میں کسی مشرک کی امامت وقیادت کے سخت ناقد تھے۔اِس لیے اُن کے ساتھ یہ ظلم بھی روا رکھا گیا کہ انہیں مسلمانانِ ہند کے اجتماعی مفادات کا مخالف اور دشمن گردانا گیا۔

جس وقت ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانانِ ہند کو ملک چھوڑنے کی ترغیب دی گئی تو جن علماء ومفکرین نے اِس عمل کی دین وشریعت اور عقل ومنطق کی روشنی میں سب سے زیادہ مخالفت کی، اِس کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خطرناک سازش قرار دیا اور مسلمانوں کو اِس فکری غلطی پر سب سے بڑھ کہ تنبیہہ کی، پروفیسر سیّد سلیمان اشرف اُن میں سب سے نمایاں اور آگے نظر آتے ہیں۔آپ پورے استقلال کے ساتھ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے اور یہ باور کرانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا کہ اِس عمل میں مسلمانانِ ہند کا صرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔

آپ نے ہندو مسلم اتحاد کے حامیوں کی لغزشوں پر سخت گرفت کی، قومی وملّی وحدت کو اجاگر کیا اور مسلمانوں میں مسلم قومیت کے جداگانہ تصور کی آبیاری کر کے تحریک پاکستان کی راہ ہموار کی۔ساتھ ہی سیّد سلیمان اشرف نے اسلام کے اعلیٰ وارفع نظام کی ہیئتِ ترکیبی پر بھی روشنی ڈالی اور دلائل وبراہین سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانانِ ہند کے تمام مسائل کا حل صرف اور صرف اسلامی زندگی اختیار کرنے میں ہے۔

سیّد سلیمان اشرف کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے اسلام کو ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا اور قطعیت کے ساتھ بتایا کہ اسلام کے اندر اقتدارِ اعلیٰ کا تصور کیا ہے، حکومت کی نوعیت کیا ہے، حکمرانوں اور شہریوں کے حقوق وفرائض کیا ہیں اور غیر مسلموں سے اتحاد ومشاورت کی جدید شکلیں کیا کیا ہوسکتی ہیں۔سیّد سلیمان اشرف کا یہ تجدیدی کام بھی کسی اعتبار سے کم نہیں کہ اُنہوں نے اسلامی تاریخ کو مسلمانوں کی تاریخ سے

مہمیز کیا۔

انہوں نے تاریخ کی روشنی میں واضح کیا کہ اسلامی تہذیب کو روبہ زوال کن کن عوامل نے کیا، کیا کیا فتنے اُٹھے اور کہاں کہاں لغزشیں ہوئیں۔ پروفیسر سلیمان اشرف کا تمام تر لٹریچر انسانی قلب و ذہن کی تربیت، تہذیبِ نفس، اخلاقی بیداری، نظم و ضبط و کردار اور شخصیت کی تشکیل و تعمیر کی دعوتِ فکر دیتا ہے اور اِس میں جہد مسلسل کے ذریعے قوم میں ایک فکری و ذہنی انقلاب لانے کا عزم اور پیغام نمایاں ہے۔ آپ فرد کی قوتِ فکر و عمل اور مسلسل جدوجہد کے قائل اور مایوسی کو کفر گردانتے ہیں۔

سیّد سلیمان اشرف کا اصل مقصدِ حیات اسلام کی سربلندی اور احیاء تھا۔ جس کی خاطر انہوں نے تن، من، دھن سے جہد مسلسل کی۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک تحریک اور اسلام کے بہترین سپاہی تھے جس کا واحد نصب العین اللہ اور رسول ﷺ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہوتا ہے۔ سیّد سلیمان اشرف امامِ زمانہ تھے۔ اُن کے علم و فضل سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، مگر اُن کی سب سے نمایاں خوبی اُن کا اخلاص و اخلاق و ایثار تھا۔

سیّد سلیمان اشرف اپنے دور کے ایک بالغ نظر، روشن خیال، معتدل مزاج اور مکالمے پر یقین رکھنے والے انسان تھے۔ انہوں نے اُس دور میں تحریکِ خلافت، ترکِ موالات اور ہندو مسلم اتحاد کے نتائج کے بارے میں جو کچھ فرمایا وہ حرف بحرف درست ثابت ہوا اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ سیّد سلیمان اشرف صاحب کو حق تعالیٰ نے جس بصیرت و بصارت سے نوازا تھا اُس دور کے لیڈرانِ خلافت و جمعیت علمائے ہند اِس سے محروم تھے۔

آج اِن تحاریک کو گزرے ایک صدی ہونے کے باوجود اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیّد سلیمان اشرف نے برعظیم کی سیاست کو بڑے پیمانے پر متاثر کیا۔ گو اُس شور میں جو مذہب بیزاری اور نئی اسلام پسندی کی آڑ میں اٹھا رکھا گیا اُن کی آواز پر کم ہی توجہ دی گئی۔ لیکن آپ نے اُس طوفان اور شور و غل کے سامنے اعتدال اور اصلاح کی جو شمعیں روشن کیں، جو راہیں دکھائیں اور جس تواتر و تسلسل کے ساتھ کام جاری رکھا، اُس کو ''البلاغ''

(۱۹۱۱ء)، ''الخطاب'' (۱۹۱۵ء)، ''الرشاد'' (۱۹۲۰ء) اور ''النور'' (۱۹۲۱ء) اور ''السبیل'' (۱۹۲۴ء)) کی روشنی میں زیادہ بہتر ڈھنگ سے دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ کتابیں اُس پُرآشوب دور کی تاریخ ہی نہیں اُن المیوں کا حل بھی ہے۔ جس میں قوم اور رہبرانِ قوم کل بھی مبتلا تھے اور آج بھی ہیں۔

سیّد سلیمان اشرف کی کتابیں ''الرشاد'' اور ''النور'' دونوں اِس اعتبار سے منفرد ہیں کہ یہ کتابیں تحریکِ خلافت، موالات اور ہجرت کے دور کی وہ منفرد تصانیف ہیں جو اُس طوفان بلاخیز کے مقابل بروقت کلمہ حق کی زوردار صدا ثابت ہوئیں۔ پروفیسر صاحب کی اِن تصانیف کی بدولت نہ صرف ہمارا دینی و ملّی تصلب قائم رہا بلکہ اِن تصانیف نے مسلمانانِ ہند میں اسلامی تشخص اجاگر کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اِس طرح سیّد سلیمان اشرف نے مسلمانوں میں جو اسلامی جذبہ پیدا کیا اُس نے آگے چل کر تحریک اسلامی کو قوت بخشی اور وہ اِس قابل ہوئی کہ غیر اسلامی اور لادینی تحریکوں کو مقابلہ کرسکے۔

اِس حقیقت سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ سیّد سلیمان اشرف نے مذہب و ملت کیلئے پوری زندگی قلمی جہاد کیا، جب جب مذہبِ حق کو اُس کی رہنماء و آفاقی مبنی بر حقیقت تعلیمات کو چیلنج کیا گیا، دین حق کے اُصولوں و آئین میں دراندازی کی سعی ناکام کی گئی، اسلام کے مسلمہ عقائد و نظریات پر شب خوں مارا گیا اور فکری دیوالیہ پن کا مظاہرہ کیا گیا سیّد سلیمان اشرف میدان عمل میں آئے، چیلنجز کا بھرپور جواب دیا، دفاع کیا، لائحہ عمل متعین کیا، مذہبی خرد برد اور دسیسہ کاریوں میں ملوث اسلام اور مسلمان دشمن عناصر کا سدباب کیا۔ اور ایک بلند قامت، بطلِ جلیل، مردِ آہن کی حیثیت سے اِن حملوں کو ناکام بنا کر ملتِ اسلامیہ کو افتراق و انتشار کے طوفان سے بچانے کی سعی کی۔

آپ کی یہ تمام خدمات اور کارنامے شہرت و ناموری کیلئے نہیں بلکہ رضائے الٰہی اور خوشنودی حبیبِ خدا کیلئے ہیں۔ آپ کے علمی و فکری کارہائے نمایاں اور دینی و ملّی خدمات جلیلہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ آج اگر آپ اُن کی تصنیفات کی روشنی میں اُس دور کی اِن تحریکات کا بالاستیعاب مطالعہ کریں تو آپ برعظیم پاک و ہند میں سیّد محمد سلیمان اشرف کو

اُن روشن ضمیر ممتاز علماء کی صف میں پائیں گے، جنھیں اللہ تعالیٰ نے دینی و سیاسی بصیرت و بصارت سے نوازا تھا اور جن کا دل ملتِ بیضا کی فکری بیداری اور اُس کے روشن مستقبل کیلئے آشنائے درد تھا۔

اِس تناظر میں بلا مبالغہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ سیّد سلیمان اشرف اپنے عہد کے ایک دیدہ ور مدبر رہنما تھے۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ایمان وایقان کی شمعیں روشن کیں اور مسلمانوں میں جذبۂ حریت وآزادی پیدا کیا۔ انہوں نے مضبوط دلائل کے ساتھ مغربی اور ہندوانہ تہذیب کا سحر ہی نہیں توڑا بلکہ اُس میں مدغم ہونے کے نقصانات وتباہ کاریوں پر سے پردہ بھی اُٹھایا۔ اُن کی ایک عظمت یہ بھی ہے کہ وہ دنیا کی تاریخ، تہذیب، سیاست، معیشت اور سماجی ومعاشی کروٹوں پر اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ گہری نگاہ رکھتے تھے۔

بلاشبہ پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہے۔ مگر ابھی اُن کی حیاتِ مستعار کے کئی اہم گوشے اُس تب وتاب کے ساتھ منظرِ عام پر نہیں آسکے، جس کے وہ مستحق تھے۔ گو اُن کے جذبوں کی صداقت، رائے کی اصابت اور ذہن وفکر کی رسائی کے سب قائل رہے۔ کسی نے کبھی اُن کی نیت پر انگلی نہیں اٹھائی، مگر اُن کے ساتھ نہ تو اُن کے معاصرین نے انصاف کیا، اور نہ آج تک محققین ومورخین کو توفیق ہوئی کہ وہ اُن کو سمجھنے کی ایماندارانہ کوشش کرتے۔

زیرِ نظر کتاب نظرِ سلیمان شناسی کے باب میں ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔ جس سے ملتِ اسلامیہ کے اِس فراموش کردہ عظیم، مگر مظلوم مفکر کی زندگی کے چند پہلو سامنے آتے ہیں، مگر اُن کی زندگی کے بہت سے گوشے ابھی بھی ایسے ہیں جن پر مزید تحقیق وجستجو کی ضرورت ہے۔ کیا یہ پرلے درجہ کی بے حسی اور احسان ناشناسی نہیں کہ پون صدی کا عرصہ گزر جانے کے باوجود پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری کی زندگی اور اُن کی حیات و خدمات اور کارناموں پر کوئی خاطر خواہ یا مبسوط کام نہ ہوسکا۔

لہٰذا ضرورت اِس اَمر کی ہے کہ ہماری جامعات بالخصوص مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جس

کو تعلیم دشمنی کے طوفان سے بچانے میں آپ نے مرکزی کردار ادا کیا اور جس میں اپنی زندگی کے تیس برس علم وعرفاں کی روشنی بانٹنے میں گزارے، آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے نئی نسل کو روشناس کرانے کیلئے مختلف زاویوں سے تحقیقی کام کی ابتداء کرے۔ اسی طرح علماء و طلباء، محققین اور مصنفین کو بھی چاہیے کہ وہ سلیمان شناشی کے نئے پہلو اور نئے زوایے تلاش کرکے پروفیسر سیّد سلیمان اشرف بہاری کی زندگی اور اُن کی حیات وخدمات اور کارہائے نمایاں کو نئی نسل کے سامنے لائیں۔

حواشی و حوالہ جات

(۱) میم کمال اوکے، تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)، قائد اعظم اکادمی کراچی، اگست ۱۹۹۱ء، ص:۴۰

(۲) ایضاً ص:۳۸

(۳) محمد مصطفےٰ رضا خاں، الطاری الداری لہفوات عبدالباری، حصہ اوّل، جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی، ۱۳۳۹ھ، ص:۳۶۔۱۳۵۔اور ۴۲۔۴۱

(۴) راجا رشید محمود، تحریک خلافت ۱۹۲۰ء، مکتبہ عالیہ اردو بازار لاہور، اشاعت دوم ۹۸۸ء، ص:۵۷

(۵) میم کمال اوکے، تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)، قائد اعظم اکادمی کراچی، اگست ۱۹۹۱ء، ص:۴۷

(۶) ایضاً ص:۵۴۔۵۳

(۷) شان محمد، انڈین مسلم، جلد ششم، ص:۷۳۔۷۰، مشمولہ تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء) قائد اعظم اکادمی کراچی، اگست ۱۹۹۱ء، ص:۸۴

(۸) سیّد قاسم محمود، اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام، الفیصل، اردو بازار لاہور، مارچ ۲۰۱۲ء، ص:۳۲۸

(۹) پروفیسر سیّد سلیمان اشرف لکھتے ہیں کہ ''۱۷، نومبر ۱۹۱۹ء بمقام دہلی خلافت کمیٹی کا سنگ بنیاد پڑتا ہے۔ اِس موقع پر ہندو بھی ایک کافی تعداد میں بحیثیت نمائندہ شریک ہوئے جن میں خصوصیت کے ساتھ مسٹر گاندھی کا نام قابل ذکر ہے۔ جنھوں نے اِس خالص مذہبی جلسہ کی ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی تھی اور علمائے سیاسی نے آپ کے تشکر و امتنان میں وہ سب کچھ ارشاد فرمایا جس کا جذبہ عقیدت اور جوش اتباع و تقلید مقتضی تھا۔ (سیدمحمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۱۱) ممتاز محقق سیّد نور محمد قادری کے مطابق خلافت کمیٹی کی بنیاد ۲۲، ستمبر ۱۹۱۹ء کو رکھی گئی۔ (دیکھیے مقدمہ ''النور'' ادارہ پاکستان شناسی لاہور، اگست ۲۰۰۸ء ص:۶) جناب سیّد قاسم محمود کی بھی یہی رائے ہے کہ لکھنو کی مسلم کانفرنس جو ۲۲، ستمبر ۱۹۱۹ء کو سر ابراہیم ہارون جعفر کی زیر صدارت منعقد ہوئی میں '' آل انڈیا سینٹر خلافت کمیٹی'' قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ (اسلام کی احیائی

تحریکیں اور عالم اسلام، ص:۳۲۸) سردار علی صابری بھی اپنے مضمون ''مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محلی'' میں لکھتے ہیں کہ لکھنو کی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں بمبئی کی خلافت کمیٹی کو ہندوستان کی مرکزی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ عظیم اور غیر فانی کارنامہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے انجام دیا۔ (روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۹، جنوری ۱۹۷۱ء، ص۳) جبکہ میم کمال اوکے کی کتاب ''تحریک خلافت'' صفحہ ۸۵، کے مطابق ۲۰، مارچ ۱۹۱۹ء کو بمبئی کے ایک بڑے اجتماع میں خلافت کمیٹی تشکیل دی گئی۔ پروفیسر محمد اسلم کا خیال ہے کہ ۲۰، مئی ۱۹۱۹ء کو بمبئی میں پندرہ ہزار مسلمانوں کے نمائندہ اجتماع میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ (تحریک پاکستان، ریاض برادرز لاہور، ص:۲۰۱) جبکہ قاضی محمد عدیل عباسی اپنی کتاب ''تحریک خلافت'' کے صفحہ ۴۵، پر خلافت کمیٹی کا بانی مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو قرار دیتے ہوئے تسلیم کرتے ہیں کہ تمام تر کوشش کے باوجود وہ درست تاریخ کے تعین میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ خیال رہے کہ خلافت کمیٹی کے قیام کی درست تاریخ پر محققین میں پائے جانے والے اختلاف رائے کے باوجود اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ خلافت کمیٹی کی بنیاد لکھنو میں رکھی گئی اور یہ کہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس کے بانی ہیں (۱۰) ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری، بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں، قندیل، لاہور، جون ۲۰۰۹ء، ص:۳۹۳

(۱۱) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۱۸۔۱۷

(۱۲) ایضاً ص:۱۵۔۱۴

(۱۳) ایضاً ص:۷

(۱۴) ایضاً ص:۷۔۶

(۱۵) میم کمال اوکے، تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)، قائد اعظم اکادمی کراچی، اگست ۱۹۹۱ء، ص:۸۷۔۸۵

(۱۶) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۲۹

(۱۷) ایضاً ص:۳۴

(۱۸) ص:۳۳۔۳۲

(۱۹) شیخ عطا اللہ، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، ص:۱۸۸

(۲۰) پروفیسر احمد سعید، حصول پاکستان، لاہور ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۷۲ء، ص:۱۲۳

۱۹۲۴ء میں تحریک خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد کا یہ وقتی اہتمام بھی دم توڑ گیا بلکہ اِس کی کوکھ سے شدھی اور سنگھٹن اسلام اور مسلمان دشمن جیسی تحریکوں نے ہندو عوام کو تشدد اور تحریص کے ذریعے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی ترغیب پر لاڈالا اور شدھی تحریک کے بانی شردھانند نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کا اہتمام کیا۔ اُسے جب ایک مسلمان نے قتل کر دیا تو ہندو مسلم اتحاد کے جلوے دیکھنے والے شہر ہندو مسلم عناد نہیں فساد کے لہو سے گلگوں ہو گئے۔ اِن فسادات کو انڈین نیشنل کانگریس ہندو مسلم بلوے کہتی ہے۔ چھوٹے موٹے ہندو تو کیا خود گاندھی نے مسلمانوں پر طعن و تشنیع سے بڑھ کر اسلام کا اپنی اہنسا کی سان پر کس لیا اور یہاں تک بول اٹھے کہ ''اسلام تلوار کا مذہب ہے یہ تشدد کا مذہب ہے۔'' ۱۹۲۹ء تک گاندھی اِس سطح پر اتر آئے کہ وہ کامل آزادی کے نام پر ہندو اکثریت کے ہندوستان پر بلا شرکت غیرے کانگریس راج اور آریہ سماج کے قیام پر مسلمانوں کو للکارنے لگے، انہوں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا ''میں آزادی کی جنگ لڑوں گا۔ تم ساتھ آؤ تو تمہیں ساتھ لے کر، نہ آؤ تو تمہارے بغیر اور تم مزاحمت کرو تو تمہاری مزاحمت کے باوجود'' اُس کے الفاظ تھے۔

''With and with out or despite of you''

(۲۱) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۲۰۔۱۹

(۲۲) میم کمال او کے، تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)، قائد اعظم اکادمی کراچی، اگست ۱۹۹۱ء، ص:۸۷

(۲۳) قاضی محمد عبدالغفار، حیات اجمل، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۰ء، انجمن ترقی اردو (ہند) ص:۲۰۹

(۲۴) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۱۱

(۲۵) ایضاً ص:۱۸

(۲۶) میم کمال او کے، تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)، قائد اعظم اکادمی کراچی، اگست ۱۹۹۱ء، ص:۸۸۔۸۷

(۲۷) قاضی محمد عبدالغفار، حیات اجمل، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۰ء، انجمن ترقی اردو (ہند) ص:۲۱۰۔۲۱۱

(۲۸) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۳۶

(۲۹) قاضی محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت، جمہوری پبلی کیشنز، نومبر ۲۰۰۹ء، ص:۹۳

(۳۰) موہن لال بھٹناگر، ماہنامہ ''درپن'' لاہور، کانگریس نمبر دسمبر ۱۹۲۲ء، ص۲۲۶، مشمولہ، تحریک ہجرت ۱۹۲۰ء، راجا رشید محمود، مکتبہ عالیہ لاہور، بار دوم، ۱۹۸۸ء، ص:۲۳

(۳۱) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۳۷۔۳۶

(۳۲) ایضاً ص:۲۳۔۲۲

(۳۳) تاج جبل پور ۷، نومبر ۱۹۲۰ء، مشمولہ، النور، سید محمد سلیمان اشرف، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۳۵

(۳۴) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۳۶

(۳۵) پروفیسر غلام حسین ذوالفقار ''مولانا ظفر علی خان حیات خدمات و آثار'' کے صفحہ ۱۶۳، پر خلافت کمیٹی کے اجلاس منعقدہ دہلی ۲۳، نومبر ۱۹۱۹ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''مولانا عبدالباری صاحب نے اپنی تقریر میں کہا ''خواہ ہندو ہماری مدد کریں، خواہ نہ کریں، مسلمانوں کو اپنے برادران وطن کے جذبات کا لحاظ کر کے گاؤ کشی ترک کر دینا چاہئے۔'' آگے لکھتے ہیں کہ ''اور ایک زمانے میں واقعی یہ حالت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان گاؤ کشی بالکل موقوف کر دیں گے۔''

(۳۶) احمد سعید، حصول پاکستان، لاہور ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۷۲ء، ص:۱۲۴

(۳۷) پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، تحریک آزادیٔ ہند اور السواد اعظم، ضیاالقرآن پبلی کیشنز، لاہور، اگست ۱۹۸۷ء، ص:۱۱۱

(۳۸) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۴۶

(۳۹) ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے سیاسی عشرے میں تحریک خلافت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ قیادت مولانا محمد علی جوہر اور مولانا حسرت موہانی نے اپنی سیادت و قیادت کے جوہر دکھانے شروع کیے تو گاندھی جس نے قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں پہلی دفعہ ممبئی میں اپنا

اتعارفی جلسہ کرایا تھا۔ اُس وقت انہیں ہندوستان میں کوئی جانتا تک نہ تھا۔ یہاں سے یہی گاندھی نہ صرف تحریک خلافت میں کود پڑے بلکہ مولانا محمد علی جوہر کے مرشد اور مولانا حسرت موہانی کے مرشد زادے حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی صحبت خاص میں جا گھسے اور انہیں اپنا سیاسی پیر تک کہنے لگے، بس یہیں سے تحریک خلافت میں گاندھی کی مذہبی شخصیت کا روپ ہندو بلکہ مسلم عوام تک میں سروپ بننا شروع ہو گیا اور ''فتویٰ عبدالباری فرنگی محل اور حکم مہاتما گاندھی کا'' کے اشتہار تحریک خلافت کا روز بازار ہو گئے۔ (زوال سے اقبال تک، ڈاکٹر جہانگیر تمیمی، مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء ص:۵۵)

(۴۰) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۴۸

(۴۱) ایضاً ص:۴۷۔۴۶

(۴۲) قاضی محمد عدیل عباسی، تحریک خلافت، نئی دہلی ترقی اردو بیورو، ۱۹۷۸ء، ص:۸۰۔۷۹

(۴۳) ''جمعیت العلمائے ہند جسے کانگریس کا مذہبی ونگ کہنا زیادہ مفید رہے۔'' محمد اسلم، تحریک پاکستان، ریاض برادر لاہور، ۱۹۹۳ء ص:۲۸۱

(۴۴) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۴۶۔۴۵

(۴۵) ایضاً ص:۴۶

(۴۶) ایضاً ص:۴۸

(۴۷) ایضاً ص:۲۳۵

(۴۸) ایضاً ص:۲۲۷

(۴۹) ایضاً ص:۱۴۳

(۵۰) ایضاً ص:۳۸۔۳۷

(۵۱) ایضاً ص:۱۹۰

(۵۲) ایضاً ص:۴۷

(۵۳) ایضاً ص:۲۱۴۔۲۱۳

(۵۴) اوائل مارچ ۱۹۲۰ء میں برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج سے ملاقات کیلئے مجلس خلافت کا ایک وفد مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں لندن پہنچا۔ مولانا محمد علی جوہر نے بڑی قابلیت اور بے

باکی سے مسلمانان ہند کے مطالبات برطانوی عمائدین اور وزیر اعظم کے سامنے رکھے، مگر وزیر اعظم نے بڑی رکھائی سے اُن کو رد کر دیا اور بڑی بے حیائی سے کہا ''ترکی کے ساتھ اُن سے مختلف اُصولوں پر معاملہ نہیں کیا جا سکتا جو مسیحی ملکوں کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ ترکیہ کو ترکی کی سرزمین پر دینوی اختیار برتنے کی اجازت ہوگی مگر وہ علاقے اُس کے قبضے میں نہیں چھوڑیں جائیں گے جو ترکی کے نہیں ہیں'' (پاکستان ناگزیر تھا، سید حسن ریاض، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۲ء، ص۱۹) وفد کے ساتھ جو کچھ انگلستان میں ہوا اُس سے برعظیم کے مسلمانوں کو بہت زیادہ روحانی اور ذہنی تکلیف ہوئی۔ مجلس خلافت کی اپیل پر ۹، مارچ ۱۹۲۰ء کو یوم غم منایا گیا۔ علامہ اقبال جو اِس وفد کے برطانیہ جانے کے حق میں نہیں تھے اِس ناکامی کو بانگ درا میں ''دریوزۂ خلافت'' کا عنوان دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی!
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی!
مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

واضح رہے کہ اوائل جنگ میں برطانیہ کے تمام ذمہ دار لیڈر مسلمانوں سے یہ وعدہ کر چکے تھے کہ ''ہم اِس لیے نہیں لڑ رہے کہ ترکی کو اُس کے دارالسلطنت سے محروم کر دیں یا اُسے ایشیائے کوچک اور تھریس کی زرخیز زمینوں سے محروم کر دیں۔ ہم سلطنت ترکی کے قیام وبقاء کو اُس کے وطن کو اور اُس کے دارالحکومت کو چیلنج نہیں کرتے۔'' (اقبال کا سیاسی کارنامہ محمد احمد خاں، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۷۳) یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ برطانوی وزیر اعظم سے ملاقات سے قبل مجلس خلافت کے ایک وفد نے ۱۹، جنوری ۱۹۲۰ء کو اخلاقی مدد حاصل کرنے کیلئے وائسرائے ہند سے بھی ملاقات کی اور اُسے جو یادداشت پیش کی اُس میں اصرار کیا گیا تھا کہ خلافت ''لوازم اسلام میں سے ہے کہ دینی اور دنیاوی حیثیت سے خلافت کا وجود مسلسل قائم رہے۔'' مگر وائسرائے ہند کا جواب بھی مایوس کن تھا۔

(۵۵) معاہدہ سیورے کی شرائط مئی ۱۹۲۰ء کو بمقام سان رومیو پیرس میں مرتب کی گئیں جس پر برطانیہ اور دوسری یورپی طاقتوں کے دباؤ سے سلطان ترکی نے ۲۰، اگست ۱۹۲۰ء کو دستخط کیے۔ رئیس احمد جعفری ندوی اِن ذلت آمیز شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''سلطان اتحادیوں کی حمایت کے ساتھ قسطنطنیہ میں حکومت کرے گا۔ اتحادیوں کو یہ حق ہے کہ آبناؤں پر قبضہ کرلیں اور یہ بھی کہ ایشائی ٹرکی کے کسی حصے پر قابض ہوجائیں۔ آرمینیہ کی ایک نئ دولت (حکومت) قائم کی جائے گی جس میں مندرجہ ذیل صوبے داخل ہونگے۔ مشرقی اناطولیہ، ارض روم، ت بلس، ترابزون اور ارذنجان۔ اس دولت کی حدود ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی مدد سے قائم کی جائے گی۔ ٹرکی عرب کے متعلق اپنے تمام دعوؤں سے دستبردار ہوگا۔ شام کی حکم برداری فرانس کو عراق اور اردن کی برطانیہ کو دی جائے گی۔ عدیسہ اٹلی کو سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کو عنایت کیا گیا۔'' (علی برادران، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۶۳۶)

(۵۶) ڈاکٹر غلام یحیٰ انجم، امام احمد رضا کے افکار و نظریات ایک تقابلی مطالعہ، کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور، ص: ۹۸

(۵۷) سیّد محمد سلیمان اشرف، النور، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص: ۱۵۱، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء

(۵۸) ایضاً ص: ۶۷

(۵۹) ایضاً ص: ۲۲۲-۲۲۳

(۶۰) ایضاً ص: ۲۳۱

(۶۱) ایضاً ص: ۱۰۴

(۶۲) ایضاً ص: ۲۲۳

(۶۳) احمد سعید، حصول پاکستان، لاہور ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۷۲ء، ص: ۱۲۴

نوٹ:۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا فتویٰ ''لو ہجرت آگئی'' کے عنوان سے ۲۸، اپریل ۱۹۲۰ء کو روزنامہ حریت دہلی میں شائع ہوا۔ (اوراق گم گشتہ، رئیس احمد جعفری ندوی، ص: ۷۲۸-۷۸۱) جس میں مولانا عبدالباری نے فرمایا ''ہجرت کے متعلق میں اعلان کرتا ہوں کہ وہ تمام مسلمان جو اپنے ضمیر (قلب یا ایمان) کو مطمئن نہیں کر سکتے وہ اب اسلام کے احکام کے متعلق عمل پیرا ہوں اور اس ملک سے ہجرت کر کے ایسے مقام پر چلے جائیں جہاں

اسلام کی خدمت انجام دینا اور اسلامی قوانین (شرع شریف) کے مطابق عمل کرنا بہتر طریق پر ممکن ہے۔'' جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے فتوئی میں کہا'' تمام دلائل شرعیہ، حالات حاضرہ، مصالح مہمۂ اُمت اور مقتضیات صالح و موثرہ پر نظر ڈالنے کے بعد میں پوری بصیرت کے ساتھ اس اعتقاد پر مطمئن ہوں کہ مسلمانان ہند کے لیے بجز ہجرت کے اور کوئی چارہ شرعی نہیں۔'' (تحریک ہجرت ۱۹۲۰ء، راجا رشید محمود، مکتبہ عالیہ لاہور، اشاعت دوم ۱۹۸۸ء، ص: ۹۷-۹۸)

اُس دور کے ایک عینی شاہد، تحریک پاکستان کے رہنما اور جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما مولانا عبدالحامد بدایونی فرماتے ہیں ''علی برادران اور مسلم زعماء نے اِبنائے وطن کے اتحاد کی خاطر اُس زمانہ میں جو رواداریاں برتیں وہ اپنی حدود سے بھی متجاوز ہوگئیں تھیں۔ لاکھوں روپیہ خرچ کر کے گاندھی جی لیڈری چمکائی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے یہاں پوسٹروں کے عنوانات یہ تھے۔ ''مولانا عبدالباری کا فتوئی اور گاندھی جی کا حکم۔'' (مولانا عبدالحامد بدایونی خطبہ صدرات پاکستان کانفرنس ۳۰، اگست ۱۹۴۱ء ضلع لدھیانہ، مطبوعہ نظامی پریس بدایونی، ص: ۱۴)

(۶۴) ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، زوال سے اقبال تک، مرکز مطالعات جنوبی ایشیا، پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۰۱۱ء، ص: ۱۲۹-۱۲۸

(۶۵) پروفیسر محمد اسلم، تحریک پاکستان، ریاض برادرز لاہور ۱۹۹۵ء ص: ۲۰۶-۲۰۵

(۶۶) سیّد محمد سلیمان اشرف، النور، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص: ۴۵-۴۴

(۶۷) بحوالہ ''تکمیل مقدمہ'' ظہور الدین امرتسری، النور، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، طبع جدید اگست ۲۰۰۸ء، ص: ۵۶

(۶۸) مولانا احمد رضا خاں بریلوی، المحجته المؤتمنه فی آیة اللتحنه، مطبوعہ بریلی، مشمولہ اوراق گم گشتہ، رئیس احمد جعفری ندوی، مطبوعہ محمد علی اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۸ء، ص: ۲۹۷

(۶۹) قاضی محمد عبدالغفار، حیات اجمل، مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۵۰ء، انجمن ترقی اردو (ہند) ص: ۲۲۲

(۷۰) تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، جلد نہم، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ص: ۶۲۰

(۷۱) مولانا احمد رضا، فتاویٰ رضویہ، جلد ششم، رضا فاونڈیشن جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور جلد ۱۴، ستمبر ۱۹۹۸ء، ص: ۴۱۷

(۷۲) ۴، فروری ۱۹۲۲ء کو موضع ''چورا چوری''، ضلع گورکھ پور میں مشتعل ہجوم نے ایک تھانے کو

آگ لگادی، جس میں پانچ سپاہی جل کر راکھ ہوگئے۔اِس واقع کو آڑ بنا کر گاندھی نے سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریک ختم کرنے کا اعلان کردیا۔ چونکہ تحریک عدم تعاون اور تحریک خلافت ایک ہی تحریک کے دو رخ تھے، اِس لیے عدم تعاون کے خاتمے سے تحریک خلافت بھی متاثر ہوئی۔گاندھی نے یہ فیصلہ کیوں کیا ؟ گاندھی کے دست راست نہرو اپنی خود نوشت میں یوں بیان کرتے ہیں'' گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک اچانک ختم کردی ۔سب حیران رہ گئے۔بعد میں معلوم ہوا کہ چورا چوری گاؤں کے قریب کچھ لوگوں نے ایک پولیس چوکی کو آگ لگادی تھی اور اُس میں پانچ پولیس والے جل گئے تھے، حالانکہ پورے ہندوستان میں عدم تعاون کی تحریک اپنے شباب پر تھی،حکومت بھی گھٹنے ٹیکنے ہی والی تھی کہ گاندھی جی نے ساری امیدیں خاک میں ملادیں۔'' پنڈت نہرو آگے چل کر لکھتے ہیں'' اصل واقعہ یہ ہے کہ فروری ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے محض چورا چوری کے واقعہ کی وجہ سے عدم تعاون کی تحریک بند نہیں کی ، یہ تو ایک بہانہ تھا۔گاندھی جی لوگوں کے احساسات سے کھیلتے ہیں اور اپنے عمل سے مخالفین اور ششدر رہ جانے والے ساتھیوں کو دلائل کا سہارا لے کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اُن کی یہ پردہ پوشی اکثر بڑی بھدی ہوتی ہے ۔جیسا کہ چورا چوری گاؤں کے واقعہ کے بعد ہوا۔اِس تحریک کو یوں ایک دم ختم کردینے اور میدان سے ہٹ جانے کا نتیجہ آگے چل کر فرقہ وارانہ فسادات کی صورت میں نکلا......اگر سول نافرمانی کی تحریک ختم نہ کی جاتی تو فرقہ وارانہ تلخی پیدا ہوتی نہ فرقہ وارانہ فسادات کی راہ ہموار ہوئی،جس نے آگے چل کر مستقل صورت اختیار کرلی۔''(اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام،سید قاسم محمود،الفیصل ناشران و تاجران کتب،لاہور،۲۰۱۲ء، ص:۳۵۲_۳۵۳)

پنڈت نہرو کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ گاندھی دانستہ جھوٹ بولتا ہے ۔اُس کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور۔مصلحت پسندی کی وجہ سے پنڈت نہرو جو کہہ نہ پائے وہ یہ تھا کہ تحریک عدم تعاون کو اچانک ختم کردینے کا فیصلہ دراصل کامیاب ہوتی ہوئی تحریک خلافت کو اوندھے منہ گرانا تھا۔یہ تمام عیاری اور ڈپلومیسی ہندو مذہب کو غالب کرنے اور مسلمانوں کو ختم کرنے کیلئے تھی۔اگر بہ نظر غور جائزہ لیں تو پنڈت نہرو کا بیان گاندھی کی ہی نہیں بلکہ پوری ہندو نفسیات یعنی منہ میں'' رام رام اور بغل میں چھری'' کی عکاسی کرتا ہے۔

(۷۳) ڈاکٹر معین الدین عقیل،جنوبی ایشیا نو آبادیاتی عہد اور تعلیم مسلمانوں میں تعلیمی قومیت کا

فروغ،مجلّہ پاکستان شناسی، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، جلد۱، ۲۰۱۵ء، ص:۳۲

(۷۴) منشی تاج الدین تاج،ہندوؤں سے ترک موالات ،مکتبہ رضویہ لاہور،۱۹۸۲ء پیش لفظ، جناب حمید رائی، ص: ج

(۷۵) مولانا احمد رضا خاں محدث بریلوی، المحجۃ المؤتمنہ،مشمولہ اوراق گم گشتہ ،سید رئیس احمد جعفری محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۲۴۹

(۷۶) ڈاکٹر جمیل جالبی، پیکر علم و عمل مولانا احمد رضا خاں(مضمون) مشمولہ اعلیٰ حضرت ایڈیشن، روزنامہ جنگ کراچی جمعرات ۱۵، مارچ ۲۰۰۷ء(بحوالہ ،اردو تراجم القرآن کے اسالیب ڈاکٹر روبینہ سرور، انجمن ترقی اردو کراچی، ۲۰۱۶ء، ص:۱۲۸)

(۷۷) سید محمد سلیمان اشرف ،النور،مطبوعہ علی گڑھ ،۱۹۲۱ء ،طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء، ص:۱۶۹

(۷۸) ایضاً ص:۱۷۰_۱۶۹

(۷۹) ایضاً ص:۱۷۴_۱۷۳

(۸۰) ایضاً ص:۵۷_۵۶

(۸۱) ایضاً ص:۱۰۷

(۸۲) ایضاً ص:۱۹۷_۱۹۶

(۸۳) ایضاً ص:۱۴۵

(۸۴) ایضاً ص:۱۸۴

(۸۵) ایضاً ص:۱۹۲

(۸۶) ایضاً ص:۱۸۵

(۸۷) ایضاً ص:۱۹۵_۱۹۴

(۸۸) ایضاً ص:۲۰۳

(۸۹) ایضاً ص:_۲۰۶

(۹۰) ایضاً ص:۵۷

(۹۱) ایضاً ص:۲۰۷

(۹۲) ایضاً ص:۲۱۵

(۹۳) ایضاً ص:۲۰۷

(۹۴) ایضاً ص:۲۰۹

(۹۵) ایضاً ص:۲۱۵

(۹۶) دیباچہ، السبیل، سید محمد سلیمان اشرف، ص:۴۵، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۱۴ء

(۹۷) جن میں واضح طور پر کہا گیا کہ ہم مخالفین پر اتمام حجت کرنا چاہتے ہیں ایسا ہی ایک اشتہار ''زندگی مستعار کی چند ساعتیں'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں دعویٰ کیا گیا کہ ''مخالفین ترک موالات اور موالاتِ نصاریٰ کے عملی حامیوں پر اتمام حجت کیا جائے گا۔'' جبکہ دوسرا اشتہار بعنوان'' آفتاب صداقت کا طلوع'' میں لکھا گیا کہ ''منکرین و منافقین کیلئے بریلی میں جمعیت العلمائے ہند کا اجلاس ہونے والا ہے، سچائی ظاہر ہوگئی اور جھوٹ بھاگ نکلا، خداوند جبار و قہار کا یہ فرمان پورا ہوکر رہے گا۔'' بحوالہ، ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست، مرتبہ، محمد جلال الدین قادری، ناشر مکتبہ رضویہ، لاہور، طبع دوم اکتوبر ۱۹۹۶ء، ص:۸۲۔۸۱

(۹۸) مکاتیب ابوالکلام آزاد، مرتبہ، ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ۱۹۶۸ء کراچی، ص:۱۶۳

(۹۹) روداد مناظرہ، مرتبہ ارا کین جماعت رضائے مصطفےٰ، مطبوعہ بریلی، ص:۳

(۱۰۰) ایضاً ص:۴۔۳

(۱۰۱) مکمل تفصیلات کیلئے ''ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست'' مرتبہ، محمد جلال الدین قادری، ناشر مکتبہ رضویہ، لاہور، طبع دوم اکتوبر ۱۹۹۶ء ملاحظہ کیجئے

(۱۰۲) مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، ذکر آزاد، اُجالا پریس، ۱۶۔ایڈن ہسپتال کلکتہ، اوّل ایڈیشن، فروری ۱۹۶۰ء، ص:۱۲۴

(۱۰۳) مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مضمون ''مولانا ابوالکلام کی شخصیت'' نقوش لاہور شمارہ مئی ۱۹۶۵ء، ص:۴۷

(۱۰۴) روداد مناظرہ، مرتبہ ارا کین جماعت رضائے مصطفےٰ، مطبوعہ بریلی، ص:۱۰۔۷

(۱۰۵) ماہنامہ حجاز جدید دہلی، شمارہ ماہ شعبان ۱۴۰۹ھ، مارچ ۱۹۸۹ء، و ماہنامہ رفاقت پٹنہ، بہار شمارہ جنوری ۱۹۸۹ء

(۱۰۶) سیّد غلام معین الدین نعیمی، حیات صدرالافاضل، ادارہ نعیمیہ رضویہ، سواد اعظم موچی گیٹ لاہور، نومبر ۱۹۶۷ء، ص:۱۶۷۔۱۶۵

نوٹ اس مناظرے میں سیّدمحمد سلیمان اشرف صاحب کی خدمات کا ذکر مولانا سیّدنعیم الدین مرادآبادی نے اپنے رسالہ ''سواد اعظم'' مرادآباد جلد ۲، شمارہ ۵، شعبان ۱۳۳۹ھ میں تفصیل

سے کیا ہے۔

(۱۰۷) محدث بریلوی کے نام سیّدنعیم الدین مرادآبادی کا مکتوب، دوامغ الحمیر، بحوالہ سید سلیمان اشرف بہاری حیات و کارنامے، محمد علی اعظم قادری، رضوی کتاب گھر مہاراشٹر نومبر ۱۹۹۲ء ص:۵۴

(۱۰۸) دیوبند اور علمائے دیوبند کی دوقومی نظریہ کی مخالفت ہماری قومی تاریخ کا ایک شرمناک باب ہے۔ جس کا مقصد ہندوؤں کی خوشنودی اور رضا کا حصول تھا۔ اور اس کے مقابلے میں ایک قومی نظریہ ''متحدہ قومیت'' کے گمراہ کن فکر و فلسفہ کو عام کرکے سوراج یعنی ہندوراج کا نفاذ تھا۔ ان حضرات نے دیدہ و نادیدہ گاندھی کے سحر میں مبتلا ہوکر اسی کامل آزادی جس مقصد ہندو اقتدار تھا، دوقومی نظریہ کی بھرپور مخالفت کی۔ روزنامہ نوائے لاہور نے ۲۶، اگست ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں یہ بھی لکھا کہ ''سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری اور اِس قسم کے دوسرے لوگ مثلاً ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی صدر جمعیت علمائے ہند اپنے دور میں فن خطابت کے امام تھے۔ ہندو کانگریس نے ان کے فن خطابت ہی کی وجہ سے اُن کو بھاری قیمت کے عوض خرید رکھا تھا۔ متحدہ ہندوستان میں کانگریس نے رابطہ عوام کی ہمہ گیر مہم شروع کی تو سادہ لوح مسلمانوں کو اسلام کے نام پر بے وقوف بنانے کیلئے انہی حضرات کے فن خطابت کا استعمال کیا گیا۔''

(۱۰۹) خالد لطیف گابا، مجبور آوازیں، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۵ء، ص:۱۰

(۱۱۰) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، علما میدان سیاست میں، ص:۴۴۰، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی جولائی ۱۹۹۴ء

(۱۱۱) ڈاکٹر جہانگیر تمیمی،، زوال سے اقبال تک، قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر، مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء، ص:۱۹۷۔۱۹۸

(۱۱۲) سیّد محمد سلیمان اشرف، البلاغ، مشمولہ مسلمانوں کا ملّی انحطاط، مطبع احمدی علی گڑھ، ۱۹۱۱ء، ص:۲۰، طبع جدید، ادارہ پاکستان شناشی لاہور، ستمبر ۲۰۱۰ء

(۱۱۳) پروفیسر سیّدمحمد سلیمان اشرف، الخطاب، ص:۱۶، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، اکتوبر ۲۰۱۶ء

نوٹ: آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس کا اٹھائیسواں سالانہ اجلاس زیر صدارت خان بہادر مولوی حاجی رحیم بخش صاحب سی، آئی، ای پریسیڈنٹ کونسل آف ریجنسی

ریاست بھاولپور، ۲۷، ۲۸، اور ۲۹ دسمبر ۱۹۱۴ء کو راولپنڈی میں منعقد ہوا تھا۔ آغاز کاروائی پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف کی تلاوت قرآن مجید سے ہوئی۔خیال رہے کہ پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف نے منتظمین کی خصوصی دعوت پر اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اور ۲۹، دسمبر ۱۹۱۴ء کو کانفرنس کے ساتویں سیشن سے مسلمانوں کیلئے جدید تعلیم کی ضرورت واہمیت پر ایک یادگار خطبہ بھی ارشاد فرمایا تھا، جسے مولانا محمد مقتدیٰ خاں شروانی نے جو ۱۹۱۵ء میں انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کے تحت ''الخطاب'' کے نام سے شائع کیا(۱۱۴) سیّد محمد سلیمان اشرف، الرشاد مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج علی گڑھ، ۱۹۲۰ء، ص:۸، طبع چہارم دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء

(۱۱۵) سیّد سلیمان اشرف، النور، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص:۶۵۔۶۴، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء

(۱۱۶) ایضاً ص:۱۵۴

(۱۱۷) ایضاً ص:۶۵

(۱۱۸) پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف، السبیل، ص:۱۹۔۱۸، مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴ء، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور، ۲۰۱۴ء)

(۱۱۹) پروفیسر شیخ محمد رفیق، سید مسعود حیدر بخاری، پروفیسر نثار احمد چوہدری، تاریخ پاکستان مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۳ء، ص:۳۲۸۔۳۲۷

(۱۲۰) سید سلیمان ندوی، یادِ رفتگاں، مجلس نشریات اسلام، ناظم آباد کراچی، ۲۰۰۳ء، ص:۱۹۱۔۱۸۹

(۱۲۱) پروفیسر رشید احمد صدیقی، گنجہائے گرانمایہ، کتابی دنیا لمیٹڈ، ۱۹۴۷ء، ص:۲۵۔۲۳

(۱۲۲) سید محمد سلیمان اشرف، النور، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء، ص: ۲۲۷، طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء

(۱۲۳) ایضاً ص:۲۳۰۔۲۲۸

(۱۲۴) ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، زوال سے اقبال تک، قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر، مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء، ص:۱۸۹

(۱۲۵) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، علماء میدان سیاست میں، ص:۴۴۰

(۱۲۶) سید نذیر نیازی، اقبال کے حضور، بحوالہ، زوال سے اقبال تک، ڈاکٹر جہانگیر تمیمی، مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء، ص:۲۲۹

(۱۲۷) ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، زوال سے اقبال تک، قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر، مرکز مطالعات

جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء، ص:۴۔۳

(۱۲۸) عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے آخری دو سال، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۱ء، ص:۶۴۷

(۱۲۹) مولانا آزاد فرماتے ہیں'' جناح کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں دو جداگانہ قومیں ہیں، غلط فہمی پر مبنی ہے، میں اس بات میں اُن سے اتفاق نہیں کرتا۔'' مولانا حسین احمد مدنی دوقومی نظریے کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں ''ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں۔'' عطاءاللہ شاہ بخاری نے کہا ''پاکستان بننا تو بڑی بات کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی ''پ'' بنادے۔'' مفتی محمود کہتے ہیں ''ہم پاکستان بنانے کے گناہ میں شریک نہیں تھے''

(۱۳۰) زوال سے اقبال تک، ڈاکٹر جہانگیر تمیمی، مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور ۲۰۱۱ ص:۷۵

(۱۳۱) جینوسائڈ (نسل کشی) واچ کی تحقیقی رپورٹ میں تو مسلمانوں کو امریکی سیاہ فاموں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان امریکا کے سیاہ فاموں کی مانند ہیں، وہ ہندوستانی ثقافت کے ایک پسماندہ رکن ہیں اور انہیں اس حالت تک پہنچانے کے لیے بہت کچھ کیا گیا ہے۔ برطانوی جریدہ اکانومسٹ کہتا ہے کہ بھارت کی مسلم آبادی نفرت کے بیج بونے کیلئے بڑی زرخیز زمین کے طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔مزید تفصیلات سچر کمیٹی رپورٹ، جینوسائڈ (نسل کشی) واچ کی تحقیقی رپورٹ، بی بی سی ہندی سروس کی رپورٹ، ریاست مہاراشٹرا کی تشکیل دی گئی رحمان کمیٹی کی رپورٹ اور برطانوی جریدے اکانومسٹ کی رپورٹوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

(۱۳۲) ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، علماء میدان سیاست میں، کراچی یونیورسٹی پریس، ۱۹۹۴ء، ص:۴۶۳

(۱۳۳) مولانا آزاد اور حسین احمد مدنی سابق دارالاسلام کو دوبارہ دارالاسلام بنانے کے خواب سے زندگی بھر پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ حضرات وطن عزیز کی وفاداری اور اللہ کی وفاداری کے درمیان ایک کشمکش سے دوچار ہیں۔ ایک طرف تو اُن کے ذہنوں پر اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا خواب چھایا ہوا تھا، تو دوسری طرف خود ساختہ سیاسی نظریات بالکل مخالف سمت میں اُن کے قدموں کو لیے چلتے تھے۔ اس کیفیت نے مولانا آزاد کو آنے والے دنوں میں سخت قنوطیت، مایوسی اور احساس شکست سے دوچار کردیا تھا۔ مولانا آزاد اپنی کتاب کے تیس سال بعد کے تیس صفحات میں دوقومی نظریہ اور قائداعظم دونوں کی

سیاست وسیادت پرمعنوی پرصاد کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں اورتسلیم کرتے ہیں کہ دو قومی نظریہ کی بناء پر قائد اعظم کا موقف پاکستان فی الواقعہ اپنے اندر بڑی جان رکھتا ہے۔مولانا لکھتے ہیں''دس سال بعدپچھلے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسٹر جناح نے جو کچھ کہا تھا اُس میں جان تھی۔''(زوال سے اقبال تک ،قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر،مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور،۲۰۱۱ء،ص:۱۲۹۔۱۳۰)پھر ۱۹ جولائی ۱۹۵۱ء کو تہران جاتے ہوئے کراچی میں ایک روزہ قیام کے دوران انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی اور فاتحہ خوانی کی مولانا آزاد کا یہ عمل قائداعظم کی عظمت وسچائی کا اعتراف اوراپنی غلطی کا احساس نہیں تو اور کیا تھا۔عجب معاملہ ہے کہ وہ آزاد جو زندگی بھر متحدہ قومیت کا حامی اور دوقومی نظریہ کا مخالف رہا،مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کو پاکستان جانے کا مشورہ دیکراپنی سابقہ فکر ہی کی نفی نہیں کرتا بلکہ وجود پاکستان اور اساس پاکستان ''دوقومی نظریہ'' کی حقانیت کو بھی تسلیم کرتا ہے (دیکھئے یادوں کی بارات، لاہور مکتبہ شعروادت ،۱۹۷۵ء ص ۲۷۸) قیام پاکستان کے بعد مولانا آزاد نے یہ بھی کہا تھا کہ''پاکستان بن گیا یہی مشیت الٰہی کو منظور تھا۔''(عبداللہ شملوی،روزنامہ نوائے وقت لاہور،۳۰ نومبر ۱۹۷۶ء،ص۶)اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی نے ۱۹۴۶ء کے عام انتخابات کے موقع پر سلہٹ میں ایک مرید کے گھر قیام کے دوران رات خواب میں دیکھا کہ آج رات عالم بالا میں ہند کی تقسیم ہوکر پاکستانی ریاست کے وجود میں آنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔صبح مرید سے ذکر ہوا تو مرید نے عرض کیا کہ اب پاکستان کے خلاف مہم میں حصہ لینے کا فائدہ؟ حضرت نے جواباً فرمایا''یہ فیصلہ تقدیر کا ہے ہم اپنی تدبیر میں مسلسل لگے رہیں گے۔''(نقش دوام،سوانح مولاناشاہ کشمیری،انظر شاہ مسعودی ۔مکتبہ بنوری کراچی، ۱۹۷۶ء،ص:۲۴۳)اور قیام پاکستان کے بعد''مولانا حسین احمد مدنی اپنی ناکامی اور احساس شکست کا بوجھ لیے میدان سیاست سے بڑی حد تک کنارہ کشی اختیار کر کے درس وارشاد اور گوشہ نشینی پر مجبور ہوگئے۔''(زوال سے اقبال تک ،قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر،مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور،۲۰۱۱ء ص ۸۷)ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں کہ ''جمعیت علمائے ہند کے مولانا حسین احمد مدنی اور ابوالکلام آزاد مسلمانوں کی الگ مملکت کے حامی نہ تھے ،سو یہ وہی طرز فکر تھا جو اکبر اور دارالشکوہ کے ہاں موجود تھا۔''(روزنامہ نوائے وقت،لاہور۱۲، اگست ۱۹۹۶ء جسٹس جاوید اقبال)پروفیسر محمد اسلم اپنی کتاب سفرنامہ ہند میں

لکھتے ہیں کہ مولانا کفایت اللہ کے نواسے عبدالسلام اور عبدالحکیم نے انہیں بتایا کہ اُن کے نانا مولوی کفایت اللہ نے ۱۹۴۶ء میں پاکستان کی مخالفت ترک کردی تھی ۔۱۹۶۰ء میں عطااللہ شاہ بخاری نے سابق وزیرتعلیم بھارتی پنجاب بودھ چندر کے ذریعے پنڈت نہرو کے پہنچنے والے سلام کے جواب میں یہ کہہ کر''بھائی ہنڈت جی سے کہنا جس عطا اللہ شاہ بخاری کو آپ جانتے ہیں وہ ۱۴، اگست ۱۹۴۷ء کو مرگیا تھا۔''اپنی غلطی کا اور دوقومی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آنے والے پاکستان کی حقیقت کا اعتراف کیا۔زندگی بھر گاندھی کی کاسہ لیسی کرنے اور دو قومی نظریہ کا انکار کرنے والے مولوی حبیب الرحمٰن لدھیانوی قیام پاکستان کے بعد اپنے اعزہ کے ہمراہ ہجرت کرکے پاکستان آتے ہیں۔مگر پاکستان اُن کی طبیعت کوراس نہ آنے کی وجہ سے واپس ہندوستان چلے جاتے ہیں۔اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا پاکستان آنے کے عمل کو کس زمرے میں رکھا جائے ۔(زوال سے اقبال تک قیام پاکستان کا نظریاتی پس منظر،مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء، ص:۹۹۔۸۹)

(۱۳۴) ڈاکٹر عبدالباری، مضمون''مولانا سیّد سلیمان اشرف''ناموران علی گڑھ،تیسرا کارواں جلد دوم''سہ ماہی فکرونظر خصوصی شمارہ مارچ ۱۹۹۱ء،ص:۵۱۔۵۰

(۱۳۵) سیّدسلیمان اشرف ،البلاغ،مطبع احمد علی گڑھ،۱۹۱۱ء،ص:۳۔۲،طبع جدید،ادارہ پاکستان شناشی لاہور،ستمبر ۲۰۱۰ء

(۱۳۶) سیّدسلیمان اشرف،النور،مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ،۱۹۲۱ء،ص:۲۰۱،طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء

(۱۳۷) سیّدسلیمان اشرف،الرشاد،مسلم انسٹی ٹیوٹ علی کالج ،۱۹۲۰ء،ص:۱۰،طبع چہارم،دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۱۱ء

(۱۳۸) ایضاً ص:۱۵

(۱۳۹) سیّدسلیمان اشرف،النور،مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ،۱۹۲۱ء،ص:۲۰۳،طبع جدید ادارہ پاکستان شناسی لاہور اگست ۲۰۰۸ء

(۱۴۰) سیّدسلیمان اشرف احوال و آثار،الحرا اکادمی،خانقاہ ولیہ قادریہ جہانگیر نگر،فتح پور یوپی ، ۲۰۱۷ء،ص:۱۳۸

کتابیات

کتابیات

قرآن مجید
کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، مولانا احمد رضا خاں بریلوی
ترمذی شریف، جلد۲
ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر، فیضان ابوالکلام آزاد، ملکی ادارلکتب، میکلگن روڈ لاہور، ۲۰۰۴
ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر، بیسویں صدی کی ملی تحریکات، قندیل لاہور، ۲۰۰۹ء
ابوسلمان شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر، مکاتیب آزاد، کراچی، ۱۹۶۸ء
احسن اقبال، ڈاکٹر، شیخ الہند مولانا محمود حسن حیات اور علمی کارنامے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹۷۳ء
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، فتاویٰ رضویہ جلد۱۴، رضا فاؤنڈیشن لاہور، ۱۹۹۸ء
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، المحجته المؤتمنه فی آیة اللتحنه، مطبوعہ بریلی،
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، تدبیر فلاح ونجات واصلاح، نیٹ ایڈیشن اعلیٰ حضرت نیٹ ورک
احمد رضا خاں بریلوی، مولانا، انفس الفکر فی قربان البقر، فتاویٰ رضویہ جلد۱۴، رضا فاؤنڈیشن لاہور
احمد سعید، پروفیسر، حصول پاکستان، لاہور ایجوکیشنل ایمپوریم، ۱۹۷۲ء
اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر، علما ان پالیٹکس، شعبہ تصنیف تالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۴ء
الطاف علی بریلوی، سیّد، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی صد سالہ تاریخی ڈائری، ۱۸۸۶ء لغایۃ جون ۱۹۸۶ء، طبع کراچی
امین زبیری، محمد، مسلم یونی ورسٹی میں اسلام وغیرہ کے متعلق غلط بیانی، آگرہ، ۱۹۳۶ء
امین زبیری، محمد، ضیائے حیات، مطبوعہ دین محمد پریس کراچی، سن ندارد،
انوار احمد زبیری، مولوی، دیباچہ خطبات عالیہ حصہ اوّل، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۲۷ء
انوار احمد شیر کوٹی، پروفیسر، خطبات عثمانی، لاہور، ۱۹۷۲ء
انور عارف، آزادی کی تقریریں،، نیو تاج آفس، دہلی، سن ندارد
ایس، ایم برکے، اکبر نامہ، مترجم مسعود مفتی، علم وعرفان پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

بدرالدین احمد، سیّد، حقیقت بھی کہانی بھی، عظیم آباد کی تہذیبی داستان، بہار اکیڈمی، پٹنہ، ۲۰۰۳ء
تاریخ علی گڑھ تحریک، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ستمبر ۱۹۸۱ء
تاریخ ادبیات پاکستان وہند، جلد نہم، پنجاب یونیورسٹی لاہور
تاریخ پاکستان، شیخ محمد رفیق، مسعود حیدر، نثار احمد پروفیسر، لاہور، ۱۹۷۳ء
تاج الدین، منشی، ہندوؤں سے ترک موالات، مکتبہ رضویہ لاہور، ۱۹۸۲ء
جلال الدین نوری، ڈاکٹر، فاضل بریلوی کا سیاسی کردار، مکتبہ نوریہ، نارتھ کراچی، مئی ۲۰۰۷ء
جلال الدین قادری، محمد، ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست، مکتبہ رضویہ لاہور، ۱۹۸۰ء
جمشید قمر، جہان ابوالکلام فکر وتحقیق کی چند جہتیں، مولانا آزاد اسٹڈی سرکل رانچی، ۲۰۰۸ء
جہانگیر تمیمی، ڈاکٹر، زوال سے اقبال تک، مرکز مطالعات جنوبی ایشیا پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء
حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مقالات شروانی، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۴۶ء
حسن نظامی، خواجہ، مہاتما گاندھی کا فیصلہ، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی۔ ۱۹۲۰ء
حسن نظامی، خواجہ، ترک گاؤکشی، مطبوعہ دلی، ۱۹۲۰ء
حسن نظامی، خواجہ، درویش جنتری، ۱۹۲۳ء
حسن ریاض، سیّد، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۲
حسین احمد مدنی، نقش حیات، جلد دوم، بیت التوحید، کراچی
خالد لطیف گابا، مجبور آوازیں، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء
خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر، علی گڑھ کی علمی خدمات، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۴ء
خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر، سرسیّد اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء
رشید محمود، راجا، تحریک خلافت، مکتبہ عالیہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء
رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنج ہائے گرانمایہ، کتابی دنیا لمٹیڈ دہلی، ۱۹۴۷ء
روداد مناظرہ، مرتبہ، اراکین جماعت رضائے مصطفٰے مطبوعہ بریلی
روبینہ سرور، ڈاکٹر، اردو تراجم القرآن کے اسالیب، انجمن ترقی اردو کارچی، ۲۰۱۶ء
رئیس احمد جعفری، اوراق گم گشتہ، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء
رئیس احمد جعفری، قائداعظم محمد علی جناح اور ان کا عہد، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۴۶ء
سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۲ء
سردار محمد خان، چودھری، حیات قائداعظم، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹ء

سعید احمد ملک، ڈاکٹر، گاندھی مسلمان اور پاکستان، ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن لاہور، ۲۰۰۸ء
سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء
سید سلیمان اشرف، پروفیسر، الرّشاد، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء
سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء
سید سلیمان اشرف، پروفیسر، السبیل، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴ء
سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، المبین، طبع جدید، دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۰۸ء
سیّد عابد احمد علی ڈاکٹر، مقالات یوم رضا، حصہ سوم، لاہور، ۱۹۷۱ء
سلیمان ندوی، سیّد، یادرفتگاں، مجلس نشریات، کراچی، ۲۰۰۳ء
شہاب الدین رضوی، مولانا، تاریخ جماعت رضائے مصطفٰے، فرید بک اسٹال لاہور، ۲۰۰۰ء
صباء الدین عبدالرحمٰن، سیّد، ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء
طفیل مصباحی، محمد، علامہ سیّد سلیمان اشرف بہاری اہل علم کی نظر میں، انڈیا
طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، لاہور، سن ندارد
عابد احمد علی، ڈاکٹر، مقالات یوم رضا، حصہ سوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۱ء
عطا اللہ، شیخ، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۵۱ء
عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے اخری دو سال، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۱ء
عبدالحامد بدایونی، مولانا، خطبہ صدارت پاکستان کانفرنس ۳۰ اگست ۱۹۴۱ء ضلع لدھیانہ مطبوعہ نظامی پریس بدایونی
عبدالرقیب حقانی، ارض بہار اور مسلمان، علمی اکیڈمی کراچی، ۲۰۰۴ء
عبدالمنان اعظمی، مفتی، حیات صدرالشریعہ، مجلس رضا لاہور، جون ۲۰۰۱
عبدالنبی کوکب، قاضی، فاضل بریلوی اور تحریک ترک قربانی گاؤ،
عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء
عبدالرشید، میاں، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۹ء
عبدالحق، مولوی، خطبات عبدالحق، گلڈ انجن کتاب گھر وکٹوریہ روڈ کراچی، ۱۹۶۴ء
عبدالغفار، قاضی، حیات اجمل، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۰ء

بدرالدین احمد، سیّد، حقیقت بھی کہانی بھی، عظیم آباد کی تہذیبی داستان، بہار اکیڈمی، پٹنہ، ۲۰۰۳ء
تاریخ علی گڑھ تحریک، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ستمبر ۱۹۸۱ء
تاریخ ادبیات پاکستان و ہند، جلد نہم، پنجاب یونیورسٹی لاہور
تاریخ پاکستان، شیخ محمد رفیق، مسعود حیدر، نثار احمد پروفیسر، لاہور، ۱۹۷۳ء
تاج الدین، منشی، ہندوؤں سے ترک موالات، مکتبہ رضویہ لاہور، ۱۹۸۲ء
جلال الدین نوری، ڈاکٹر، فاضل بریلوی کا سیاسی کردار، مکتبہ نوریہ، نارتھ کراچی، مئی ۲۰۰۷ء
جلال الدین قادری، محمد، ابوالکلام آزاد کی تاریخی شکست، مکتبہ رضویہ لاہور، ۱۹۸۰ء
جمشید قمر، جہان ابوالکلام فکر وتحقیق کی چند جہتیں، مولانا آزاد اسٹڈی سرکل رانچی، ۲۰۰۸ء
جہانگیر تمیمی، ڈاکٹر، زوال سے اقبال تک، مرکز مطالعات جنوبی ایشیا پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء
حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مقالات شروانی، شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ، ۱۹۴۶ء
حسن نظامی، خواجہ، مہاتما گاندھی کا فیصلہ، مطبوعہ دلی پرنٹنگ پریس دہلی۔ ۱۹۲۰ء
حسن نظامی، خواجہ، ترک گاؤکشی، مطبوعہ دلی، ۱۹۲۰ء
حسن نظامی، خواجہ، درویش جنتری، ۱۹۲۳ء
حسن ریاض، سیّد، پاکستان ناگزیر تھا، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی، ۱۹۹۲ء
حسین احمد مدنی، نقش حیات، جلد دوم، بیت التوحید، کراچی
خالد لطیف گابا، مجبور آوازیں، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء
خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر، علی گڑھ کی علمی خدمات، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۴ء
خلیق احمد نظامی، ڈاکٹر، سر سیّد اور علی گڑھ تحریک، ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ، ۱۹۸۲ء
رشید محمود، راجا، تحریک خلافت، مکتبہ عالیہ، اردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء
رشید احمد صدیقی، پروفیسر، گنج ہائے گرانمایہ، کتابی دنیا لمٹیڈ دہلی، ۱۹۴۷ء
روداد مناظرہ، مرتبہ، اراکین جماعت رضائے مصطفٰے مطبوعہ بریلی
روبینہ سرور، ڈاکٹر، اردو تراجم القرآن کے اسالیب، انجمن ترقی اردو کارچی، ۲۰۱۶ء
رئیس احمد جعفری، اوراق گم گشتہ، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء
رئیس احمد جعفری، قائداعظم محمد علی جناح اور ان کا عہد، مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۴۶ء
سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۲۰۰۲ء
سردار محمد خان، چودھری، حیات قائداعظم، مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹ء

سعید احمد ملک، ڈاکٹر، گاندھی مسلمان اور پاکستان، ہیومن ویلفیئر ایسوسی ایشن لاہور، ۲۰۰۸ء
سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، الخطاب، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۱۵ء
سید سلیمان اشرف، پروفیسر، الرّشاد، مطبوعہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ کالج، ۱۹۲۰ء
سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، النور، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، ۱۹۲۱ء
سید سلیمان اشرف، پروفیسر، السبیل، مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۹۲۴ء
سیّد سلیمان اشرف، پروفیسر، المبین، طبع جدید، دارالاسلام لاہور، جون ۲۰۰۸ء
سیّد عابد احمد علی ڈاکٹر، مقالات یوم رضا، حصہ سوم، لاہور، ۱۹۷۱ء
سلیمان ندوی، سیّد، یاد رفتگاں، مجلس نشریات، کراچی، ۲۰۰۳ء
شہاب الدین رضوی، مولانا، تاریخ جماعت رضائے مصطفٰے، فرید بک اسٹال لاہور، ۲۰۰۰ء
صباء الدین عبدالرحمٰن، سیّد، ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء
طفیل مصباحی، محمد، علامہ سیّد سلیمان اشرف بہاری اہل علم کی نظر میں، انڈیا
طفیل احمد منگلوری، مسلمانوں کا روشن مستقبل، لاہور، سن ندارد
عابد احمد علی، ڈاکٹر، مقالات یوم رضا، حصہ سوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۱ء
عطاالله، شیخ، اقبال نامہ مجموعہ مکاتیب اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۵۱ء
عاشق حسین بٹالوی، اقبال کے اخری دو سال، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۱ء
عبدالحامد بدایونی، مولانا، خطبہ صدارت پاکستان کانفرنس ۳۰ اگست ۱۹۴۱ء ضلع لدھیانہ مطبوعہ نظامی پریس بدایونی
عبدالرقیب حقانی، ارض بہار اور مسلمان، علمی اکیڈمی کراچی، ۲۰۰۴ء
عبدالمنان اعظمی، مفتی، حیات صدر الشریعہ، مجلس رضا لاہور، جون ۲۰۰۱
عبدالنبی کوکب، قاضی، فاضل بریلوی اور تحریک ترک قربانی گاؤ،
عبدالرشید ارشد، بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ، لاہور، ۱۹۸۳ء
عبدالرشید، میاں، پاکستان کا پس منظر اور پیش منظر، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، ۱۹۸۹ء
عبدالحق، مولوی، خطبات عبدالحق، گلڈ انجن کتاب گھر وکٹوریہ روڈ کراچی، ۱۹۶۴ء
عبدالغفار، قاضی، حیات اجمل، انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۰ء

عبدالوحید خان، مسلمانوں کا ایثار جنگ آزادی، لکھنو، ۱۹۳۸ء
عدیل عباسی، قاضی، تحریک خلافت، جمہوری پبلی کیشنز، نومبر ۲۰۰۹ء
علی ارشد، ڈاکٹر، علامہ شبیر احمد عثانی کا تحریک پاکستان میں کردار، پاکستان سٹڈی سینٹر پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۲۰۰۵ء
عمر حیات سیال، ڈاکٹر، ہندومت اسلام اور پاکستان، ندوۃ القلم اردو بازار کراچی، جنوری، ۲۰۰۸ء
عبدالرزاق ملیح آبادی، مولانا، ذکر آزاد، اجالا پریس کلکتہ، ۱۹۶۰ء
غلام رسول سعیدی، مولانا، حیات استاذ العلما مولانا یار محمد بندیالوی، دارالاسلام لاہور،
غلام معین الدین نعیمی، مولانا، حیات صدر الافاضل، ادارہ نعیمیہ لاہور، نومبر ۱۹۶۷ء
غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر، شخصیات، کراچی، ۲۰۰۹ء
غلام یحییٰ انجم، ڈاکٹر، امام احمد رضا کے افکار ونظریات، کتاب محل لاہور، سن ندارد
غلام السیدین، خواجہ، علی گڑھ کی تعلیمی خدمات، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۳۱ء، ص: ۷۔۶
غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر، مولانا ظفر علی خان حیات وخدمات وآثار، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۱ء
قاسم محمود، سیّد، اسلام کی احیائی تحریکیں اور عالم اسلام، الفیصل لاہور، ۲۰۱۲ء
قاضی جاوید، برصغیر میں مسلم فکر کا ارتقا، نگارشات، لاہور، ۱۹۸۶ء
متین خالد، اسلام کا سفیر، علم وعرفان پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء
محمد اسلم، پروفیسر، تحریک پاکستان، ریاض برادرز لاہور، ۱۹۹۵ء
محمد سلیم، پروفیسر، مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ، ادارہ تعلیمی تحقیق، تنظیم اساتذہ پاکستان، ۱۹۸۹ء
محمد علی چراغ، اکابرین تحریک پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۰ء
محمد میاں، علمائے حق، حصہ اوّل، مراد آباد، ۱۹۴۶ء
محمود احمد قادری، مولانا، تذکرہ علمائے اہلسنّت، کانپور، ۱۳۹۱ھ
محمد احمد خان، اقبال کا سیاسی کارنامہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء
مسعود احمد، پروفیسر، تحریک آزادی ہند السواد اعظم، ضیا القرآن، پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۷ء
مسعود احمد، پروفیسر، حیات مولانا احمد رضا بریلوی، اسلامی کتب خانہ اقبال روڈ سیالکوٹ، ۱۹۸۱ء
مصطفیٰ رضا خاں، مولانا، الملفوظ، حصہ اوّل، مطبوعہ کراچی،
مصطفیٰ رضا خاں، مولانا، الطاری الداری لھفوات عبدالباری، حصہ اوّل، جماعت رضائے مصطفیٰ

بریلی، ۱۳۳۹ھ
معین الدین عقیل، ڈاکٹر، تحریک آزادی میں اردو کا حصہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء
میم کمال او کے، تحریک خلافت، (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء) قائداعظم اکادمی کراچی، اگست ۱۹۹۱ء
ناظر کاکوروی، تذکرۃ الشعراو مصنفین، (صد سالہ ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۵۷ء کا شعوری وتنقیدی جائزہ) ادارہ انیس ادب اردو الہ آباد، سن ندارد
نجیب جمال یگانہ، ڈاکٹر، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ، اظہار سنز لاہور، ۲۰۱۳ء
نذیر نیازی، سید، اقبال کے حضور، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۸۱ء
نسیم احمد، حجاز ریلوے عثانی ترک اور شریف مکہ، الفیصل لاہور، ۲۰۰۸ء
نور محمد قادری، سیّد، اعلی حضرت کی سیاسی بصیرت، لاہور، ۱۹۷۵ء
نور محمد قادری، سیّد، مولانا عبدالحامد بدایونی کی ملی وسیاسی خدمات، لاہور، ۲۰۰۲ء
یونس قادری، ڈاکٹر، شیخ عبدالحق محدث دہلوی موضوعاتی مطالعہ، (مقالہ پی ایچ ڈی) مکتبہ الحق، کراچی، ۲۰۰۷ء
یٰسین اختر مصباحی، علمائے اہلسنّت کی بصیرت و قیادت، مجلس فکر رضا، ۱۰۹۰، بستی جودھیوال لدھیانہ پنجاب، انڈیا، ۲۰۱۲ء
یٰسین اختر مصباحی، مولانا، سرزمین بہار کی دو عظیم شخصیتیں، نیٹ ایڈیشن

اخبارات ورسائل

روزنامہ جنگ راولپنڈی، ۱۹، جنوری ۱۹۷۱ء
روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳۰، نومبر ۱۹۷۶ء
روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۷، جولائی ۱۹۸۷ء،
روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۱۲، اگست ۱۹۹۶ء
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ، اگست ۱۹۶۹ء
مجلہ سیّد سلیمان اشرف: احوال وآثار، حیدر آباد دکن، انڈیا، ۲۰۱۷ء
سہ ماہی اقبالیات، جنوری تا مارچ ۱۹۸۴ء، جلد ۲۴، شمارہ ۴، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور
سہ ماہی العلم، کراچی، اپریل تا جون ۱۹۷۴ء
ماہنامہ الفرقان، لکھنو، محرم الحرام، ۱۳۸۹ھ
سہ ماہی مجلہ اقبال، بزم اقبال، لاہور، اپریل تا جون ۱۹۹۲ء

مجلہ پاکستان شناسی، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی جلد ا،۲۰۱۵ء
ماہنامہ تاج۔ کراچی، محمود نمبر، جلد ۱۲
ماہنامہ حجاز جدید، دہلی مارچ ۱۹۸۹ء
ماہنامہ حکایت، لاہور، جون ۱۹۷۸ء
خیال نمبر ۱۸۵۷ء، ناصر کاظمی، انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۷ء
ماہنامہ دارالعلوم دیوبند، شمارہ ۴، جلد: ۹۷، جمادی الثانیہ ۱۴۳۴ ہجری مطابق اپریل ۲۰۱۳ء
چراغ راہ، نظریہ پاکستان نمبر کراچی، ۱۹۶۰ء
ماہنامہ رفاقت پٹنہ بہار، جنوری ۱۹۸۹ء
ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، جون ۱۹۷۷ء
ماہنامہ ضیائے حرم، لاہور، جنوری ۱۹۷۸ء
سہ ماہی فکر و نظر، خصوصی شمارہ ناموران علی گڑھ، دوسرا کارواں، علی گڑھ، ۱۹۸۶ء
سہ ماہی فکر و نظر، خصوصی شمارہ ناموران علی گڑھ، تیسرا کارواں، علی گڑھ، ۱۹۹۱ء
مجلہ علم و آگہی، گورنمنٹ کالج کراچی، خصوصی شمارہ، ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء
ماہنامہ معارف رضا، کراچی، ۱۹۹۲ء
مجلہ معارف رضا کراچی، شمارہ ۳۲، ۲۰۱۲ء
ماہنامہ معارف رضا، کراچی، مارچ ۲۰۱۷ء
ماہنامہ معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، فروری ۱۹۲۶ء
ماہنامہ معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، جون ۱۹۳۹ء
ماہنامہ معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۵۰ء
ماہنامہ معارف، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، فروری، ۱۹۷۵ء
ماہنامہ ندیم گیا، بہار نمبر، ۱۹۴۰ء
نقوش لاہور، شمارہ مئی ۱۹۶۵ء
پندرہ روزہ قومی زبان، بابائے اردو نمبر، کراچی، اگست ۱۹۶۳ء
ماہنامہ کتابی دنیا، دہلی،، جنوری ۱۹۴۷ء
A.B Rajput, Maulana Abdul Kalam Azad, Loin Press Lahore, 1957

اس کے علاوہ نیٹ پر دستیاب مواد، خاص طور پر وکی پیڈیا، نفس اسلام ڈاٹ کام، انجمن ضیائے طیبہ، بی بی سی اردو اور اردو اخبارات وغیرہ کی ویب سائٹ سے بھی مدد لی گئی ہے۔

عکس و نوادرات

عکس و نوادرات

الخطاب، ۱۹۱۵ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی

البلاغ، ۱۹۱۱ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی

النور، ۱۹۲۱ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی

الرشاد، ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی

الحج، ۱۹۲۸ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی

السبیل، ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی

المبین، ۱۹۲۹ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی

الانھار ہشت بہشت، ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی

نزھة القال فی لحیة الرجال، ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی

حاشیہ امتناع النظیر، ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی

مسائل اسلامیہ، مجموعہ مقالات، مولوی عبدالباسط نے مرتب کیا اور علی گڑھ سے شائع ہوا

روداد مناظر بریلی کے سرورق کا عکس، جو ابوالکلام آزاد اور سیّد سلیمان اشرف کے درمیان ہوا

بیادگار
مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم و مغفور
صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ متوطن بہار شریف (بہار)
جنہوں نے
تیس سال مسلسل آدم جی پیر بھائی منزل کے اس حصے میں
مستقل قیام فرمایا اپنی حمیت دین فضیلت علم اصابت فکر او
بہبود کی سیرت سے اس درگاہ کو سربلند رکھا اور سربلند رہے
رہ روان شوق از ما سالہا آئند یاد
نقش ما انگیخت در راہ محبت گام ما
تاریخ رحلت ۵ ربیع الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۹۳۹ء

پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف قدس سرہ العزیز کی قیام گاہ آدم جی منزل علی گڑھ کا یادگاری کتبہ
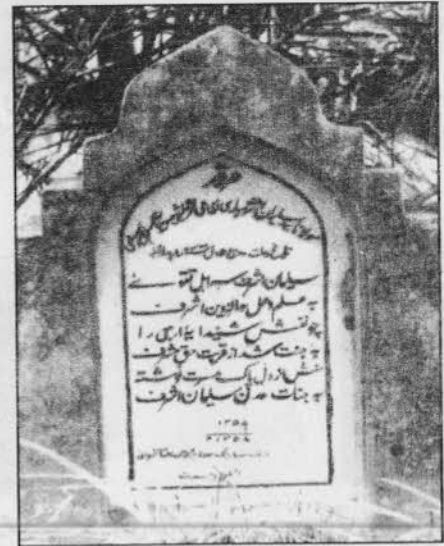
لوح مزار پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف قدس سرہ العزیز صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ہماری بے حسی کی عکاس پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف قدس سرہ العزیز کی آخری آرام گاہ کی حالیہ تصویر

صوبہ بہار (انڈیا) میں واقع پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کے آبائی گھر ''اشرف منزل'' کا موجودہ منظر

آدم جی پیر بھائی منزل کا وہ کمرہ جس میں سیّد صاحب نے زندگی کے ۳۰، سال گزارے

آدم جی پیر بھائی منزل، علی گڑھ کا بیرونی منظر جس میں سیّد سلیمان اشرفؒ نے اپنی زندگی گزاری

پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف قدس سرہ العزیز کا عکس تحریر

پروفیسر سیّد محمد سلیمان اشرف قدس سرہ العزیز کا عکس تحریر